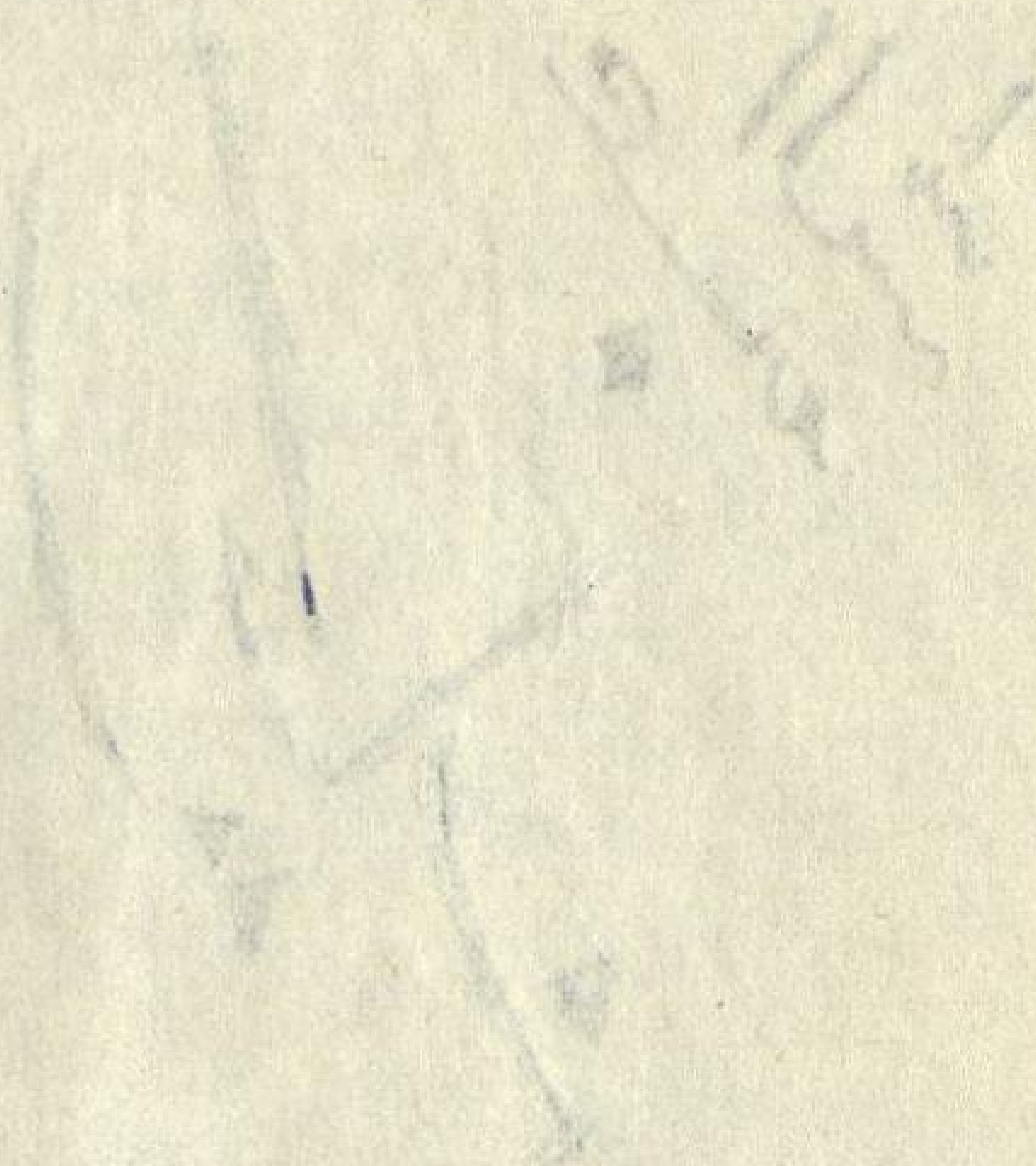

امۃ الباسط شمیم
شکستہ سفینے



أمتہ الباسط شبانہ ایم اے

شکستہ سفینے



شکستہ سفینے

امتہ الباسط شبان ایم اے

انتخاب ادب ایبک روڈ انارکلی لاہور

ناشر — [illegible]
مطبع — [illegible] پریس لاہور
تعداد — ۱۱۰۰ [illegible]
سرورق — [illegible]
تاریخ اشاعت — [illegible]

قیمت — ۱۳ روپے

ناشر

انتخابِ ادب

۱۰- ایبک روڈ انارکلی لاہور

برانچ - اردو بازار کراچی



اُن "شکستہ سفینوں" کے نام

جو طوفانوں سے بچ

کر کناروں پر ڈوب

گئے

امتہ الباسط شانہ



دے سکے تا کہ نہ آسانی سے دھوکہ کوئی

ہم سے نادان بھی ہشیار بنے بیٹھے ہیں

آج کشتی کو کوئی حادثہ درپیش نہیں

آج تو گھاٹ بھی منجدھار بنے بیٹھے ہیں

کھری باتیں

محترمہ اُمتہ الباسط شبانہ ایم اے۔

اُردو ادب میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔ جنہوں نے زندگی کی بے شمار مصروفیات کے باوجود ایسے ایسے کٹھن مراحل طے کئے ہیں۔ جن کا تصوّر بھی عام قاری کے لئے تکلیف دہ ہوتا ہے ــــ جب ایم اے نفسیات کی طالبہ تھیں تو ان کے ذہن میں خانہ بدوشوں کی زندگی اور طرزِ معاشرت کا مطالعہ کرنے کا جنوں سمایا۔ چنانچہ وہ خانہ بدوش بن گئیں اور ان کے رنگ میں خود کو رنگ کر زندگی کو اس انداز میں دیکھا کہ یہ مطالعہ بھی ان کا اپنا افسانہ بن کر رہ گیا۔

انہوں تے گھاٹ گھاٹ، ملک ملک۔ اور شہر شہر کو دیکھا اور ڈھکے چھُپے اتنے انسانوں کو حقیقت کے روپ میں دیکھ لیا جس کے لئے ایک عُمر چاہیئے مگر یہ کم عُمر اور سُلجھے سُلجھے ذہن کی ایک بے حد شریف۔ کم گو۔ مگر کھلنڈری لڑکی جو خود کو نفسیات کا ایک ایسا باب بنا کر جس میں ہر روپ اور ہر طرزِ فکر کو دیکھا جاسکتا ہے پھر اپنے ماحول میں لوٹ آئی۔

اُمتہ الباسط شبانہ ایم اے - کھری کھری - صاف ستھری - پاکیزہ اور اُلجھی اُلجھی باتوں کو سُلجھے سُلجھے انداز میں بیان کرنے والی لڑکی ہیں ـــــ جن کی تحریروں کی چند سطریں پڑھ کر قاری اس تحریر کا اختتام جانے بنا نہیں رہ سکتا۔

شبانہ بہت کم گو ہیں ـــ مگر ضدی مزاج اور اپنی بات دلائل کی بوچھاڑ کر کے منوا لینے کا ملکہ رکھتی ہیں ـــ بہت ہنس مکھ اور زندہ دل ہیں مگر پل بھر میں سنجیدہ ہو جاتی ہیں ـــ آدھی بات سُن کر پوری سمجھ لیتی ہیں۔ پھر ملنے والے کو یہ تاثر دے کر کہ وہ بہت قابل۔ عقلمند اور باشعور ہے اسے بے وقوف بنا دیتی ہیں۔

اُردو ادب میں انہوں نے ناقابلِ فراموش کردار سرانجام دیا ہے اور پھر یہ فرض بھی مجھے سرانجام دینا پڑا کہ میں ان ڈھائی ہزار قارئین کی خواہش کا احترام کر کے جنہوں نے ان اقساط کو جلد ناول کا روپ دینے کا مطالبہ کیا تھا ناول شائع کر دوں۔

ناول آپکے ہاتھوں میں ہے اسے پڑھیئے اور اُردو ناول نگاری میں ایک اور سنگِ میل سنبھال کر رکھ لیجئے۔ ایسے ناول کبھی کبھار اور بہت کم شائع ہوتے ہیں جو تاریخِ ادبِ اُردو کا ایک باب بن جائیں۔

بلیغ الدین جاوید

یکم جنوری ۱۹۷۵ء

وہ لمحہ کتنی بے لبی اور مجبوری کا ہوتا ہے جب کسی سے پوچھے بغیر ہی اس کی زندگی کے سب سے اہم مسئلے کا فیصلہ کر کے اسے باقی زندگی گیلی لکڑی کی طرح سلگ سلگ کر راکھ ہونے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ ایسے لوگ کچھ احتجاج نہیں کرتے شاید وہ فرسودہ آئین اور خود ساختہ اصولوں سے ڈرتے ہیں جو ان کی روحوں کو اسیر کرنے کیلئے امرانے بنا رکھے ہیں اسی لئے وہ اپنی بدنصیبی کے کاغذ پر آخری بار دستخط کر کے اسے ہمیشہ کیلئے اپنی پیشانی کا جھومر بنا لیتے ہیں۔

میں بھی شاید بزدل تھی اسی لئے اپنے خلاف کئے جانے والے نئے انوکھے مگر بھیانک فیصلے کے خلاف احتجاج نہ کر سکی۔ اگر مجھے بولنا نہیں آتا تھا تو پھر مجھے رونا چیخنا چلانا ہی چاہیئے تھا۔ مگر اس وقت کی خاموشی کو میری رضامندی سمجھ لیا گیا اور اس کے بعد زندگی میں کوئی لمحہ کوئی موقع ایسا نہ آسکا جو میرے ساتھ ہونے والی زیادتی کی تلافی کرتا۔

وہ واقعہ جو پھر دہرایا نہ جائے گا مگر ایک زخم بن کر میرے لوحِ ذہن پر نقش رہے گا۔ گزرتے لمحوں کا غبار اور دھند بھی اسے مندمل نہ کر سکے گی یہ بھی ایک مجبوری ہے ورنہ اگر مجھ میں ہمت ہوتی اور یہ میرے اختیار میں ہوتا تو کیا ساری یادیں اپنے ذہن سے کھرچ کر پھینک نہ دیتی اور زندگی جیسے بھی گزرتی گزار لیتی مگر اب تو خیالوں کے آسیب اور یادوں کے بھتنے قطار در قطار میرے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں ان کے ہاتھوں میں میرا ماضی تھما ہوا ہے یاد کرو، یاد کرو۔

تمہارے ذہن میں یہ بات تو ناسور کی طرح تازہ ہے یہ رشتے، یہ تعلق، یہ حالات، یہ قاتل، یہ جھوٹی عزتوں کے سوداگر، یہ موم کی ناک ڈالے جاگیردار جنہوں نے تمہیں مٹی سے حقیر اور شیشے کے ٹوٹے گلدان سے بھی زیادہ ناکارہ سمجھ کر اٹھا کر پھینک دیا کسی نے بھی ان کے بہیمانہ فیصلے کے خلاف زبان نہ کھولی۔ کسی اخبار نے اس فرعون صفت باپ کے خلاف کالم نہ لکھا۔ کوئی نہ بولا۔ کسی کے منہ سے نہ نکلا۔

جہانگیر قدر یہ آپ کی بچی ہے بازار سے خریدی ہوئی بکری نہیں جسے آپ لوٹانا چاہیئے۔ ہاں۔ خدا کے دیئے تحفے واپس یا تبدیل نہیں ہو سکتے انہیں ویسے ہی قبول کرنا پڑتا ہے۔ مگر میرے والدین ان تمام رضائی والدین سے مختلف ثابت ہوئے۔ انہوں نے اپنے دل میں میرے لئے محبت و شفقت کی ایک شمع بھی نہ جلائی۔ نفرت کی تاریکیوں میں حقارت کا تحفہ میری خالی جھولی میں ڈال کر کہا۔

"پھینک دو، ختم کر دو اس بچی کو، یہ میری بیوی کے کردار کیلئے چیلنج ہے۔ یہی نہیں اسے پھولوں کی تمنا ہوگی مگر لوگ اس کے دامن میں کانٹے بھریں گے۔"

ہاں جہانگیر قدر آپ بڑے دور اندیش آدمی ہیں۔ آپ کو میرے مستقبل کا کتنا خیال تھا اسی لئے آنے والے زمانے میں جو سلوک لوگوں نے مجھ سے کرنا تھا۔ اس کا آغاز آپ نے کر دیا اور مجھے موت کی اندھی کھائی میں پھینکنے کا حکم دیدیا۔

جب کوئی اتنے زیادہ حادثوں کا شکار ہو جائے کہ اس کی درخشاں پیشانی پر وقت کے گہرے گھاؤ پڑ جائیں تو اسے کوئی غم نہیں ستاتا کوئی دکھ تکلیف نہیں دیتا۔ لمحے اس لئے بے کیف ہو جاتے ہیں۔ ہمارے آس پاس کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو مسکراتے ہیں تو اس لئے کہ ان کی آنکھیں اس سے زیادہ آنسو نہیں بہا سکتیں۔ تبھی آج میں نمکین پانیوں کی آبشاروں پہ کوئی بند نہیں باندھ سکتی۔

کون جانے مجھے کیا ہو گیا ہے حالات کے منہ زور ریلے نے ہر ساحل چھین لیا ہے

امید کا ہر تنکا جلا دیا ہے اور میں زندہ ہونے کے باوجود بے جان شیشے کی طرح سمندر میں ادھر اُدھر بہتی جا رہی ہوں۔ دور دور تک گہرے سیاہ پانیوں کی حکومت ہے میری کوئی منزل نہیں رہی، یہ اپنے سارے غم تقدیر نے بن پوچھے میری جھولی میں کیوں ڈال دیئے ہیں۔

زندگی مجھ سے روٹھ رہی ہے اب یہاں کوئی رنگ نہیں، کوئی حسن اور ہفت رنگ کہکشاں نہیں، آسمان بھی منجمد سا ہو گیا ہے پتے موت کے خوف سے زرد پڑ گئے ہیں، تاروں کی مدھم روشنی میں دکھ کے زخم سلگتے ہیں، یادیں میرے کانوں کے پردے پھاڑتی ہیں اور میرے دماغ میں الاؤ سا جل اٹھتا ہے۔ گرمی تپش اور حرارت کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ ایسے میں کوئی انجانی سی آواز سرگوشی کرتی ہے۔ بڑے گھمبیر انداز میں کہتی ہے اب تیرا وقت بھی تمام ہو چلا۔ زندگی تو ہنستی مسکراتی آگے بڑھ رہی ہے آسمان کا نیل اسی طرح روشن ہے مگر تیرے گرد تاریکیوں کا راج ہے۔

شاید میں قافلے کی صدائے جرس بنکر پیچھے رہ گئی ہوں۔

ٹھیک ہی تو ہے مدتوں میں نے ظلم کا زہر پیا ہے ہر دکھ جھیلا ہے کون سا حادثہ نہیں جو مجھ سے ٹکرایا، ہر کرب سہا ہے میرا وجود آثار قدیمہ کا حصہ بنتا جا رہا ہے۔ وقت خیالات کی آندھی کی راکھ تلے دب کر مجھ سے لاتعلق ہو چلا ہے روح کے بوجھ تلے دبے خیالات گدھوں کی طرح مجھے نوچ رہے ہیں۔

پہلے یہ صرف احساس تھا۔ اب یہ احساس ایک طرح کا خوف بن گیا ہے ایسا خوف جس کے دامن میں دکھ اور نا امیدیاں ہیں کوئی تو ایسا ہو جو ان راہوں سے گزرے جس کے لئے زندگی بے معنی خواب بن کر نہ رہ جائے۔ کوئی تو ایسا ہو جس کے سینے میں چاندنی راتوں میں سمندروں جیسا جوار بھاٹا ہو۔

گھوم پھر کر آئینے میں اپنی ہی صورت نظر آتی ہے تو کیا یہ میں ہوں مجھے یقین نہیں آتا۔ انہی لمحات میں دور بہت دور سے کسی کی سرگوشی سنائی دیتی ہے "یہاں اجڑی زندگی کو کھنڈر

بنا دینے والی جگہ کو چھوڑ دو۔ جہاں تم ہو وہاں زندگی کی دھڑکنیں بہت مدھم ہیں یہاں ذہن کو بکھیر دینے والے دھماکے نہیں، یہاں گہری راتوں میں مہیب بادلوں کے اژدھے نہیں دوڑتے کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکراتی بجلیوں اور طوفانوں کے ساتھ اپنے دل کے اضطراب کا مقابلہ کرو۔ شاید اس طرح تم سمجھ سکو کہ زندگی کیا ہے؟ کیوں ہے؟

آج ناامیدی کے شکست خوردہ لمحے میں کوئی چیخ چیخ کر برسوں کی گھٹی گھٹی سہمی ہوئی بغاوت کی چنگاری کو شعلہ بنانا چاہتا ہے ان رشتوں میں کیا تقدس باقی رہا ہے سبھی اجنبی اور بیگانے ہیں ایک دوسرے کے درد اور دکھ سے بے خبر۔

اگر میرے بس میں ہوتا تو کیا ساری باتیں اور تلخ یادیں ہیں اپنے ذہن سے نوچ کر نہ پھینک دیتی۔ مگر آہ یہ آوارہ خیالوں کے آسیب جب موقع ملتا ہے ناگ کی طرح پھن پھیلا کر زہرناک واقعات کی یاد دلانے آجاتے ہیں۔

اس سے حاصل ہی کیا کہ آدمی ایک واقع کو اتنی اہمیت دے مگر جس واقعے کے ساتھ اور بے شمار واقعات جڑے ہوں، وہاں زندگی کیوں نہ ایک ہیجانی ڈرامے کی صورت اختیار کر جائے، اسی لئے میرے تن بدن میں چوبیس سالوں سے ایک نہ بجھنے والی آگ بھڑک رہی ہے۔

جہانگیر قادر کے والدین ان لوگوں میں سے تھے جو قدرت کی فیاضیوں سے مالامال ہیں جو اپنے بچوں کو نہ صرف اعلےٰ تعلیم دلاتے ہیں بلکہ ان کی باقی ماندہ زندگی کی آسائشوں کے لئے ڈھیروں جاگیر اور دولت چھوڑ کر مرجاتے ہیں جہانگیر اپنے والدین کی تنہا اولاد تھے۔ انتہا درجے کے حسن پرست، خوبرو، قدرت کی صناعی کا شاہکار، چھ فٹ دو اِنچ قد، صحت مند ورزشی جسم، سرخ و سفید رنگت، پرکشش نقوش، وہ نہ صرف دلکش شخصیت کے مالک تھے بلکہ ذہین اور خوش گفتار بھی تھے۔ زندگی کے ہر میدان میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کے مطابق حصہ لینے والے، رائڈنگ، پولو، بلیرڈ، گولف اور کرکٹ کھیلنے کے مشاق۔

کامرس کالج سے ایم کام کے بعد سی اے کیلئے وہ لندن چلے گئے، تعلیم کے دوران انہوں نے پورا یورپ گھوم چھوڑا، ملک ملک سے سوغاتیں اکٹھی کیں۔ دوران تعلیم انہوں نے سوشل ایکٹویٹی میں برابر حصہ لیا تھا، ہفتے میں دو ایک دفعہ وہ شام کو کلب بھی جاتے وہاں بے شمار لڑکیاں جہانگیر سے دوستی کی خواہاں تھیں۔ اتنی شاندار شخصیت انہوں نے کم ہی دیکھی تھی ان کی شوخی اور زندہ دلی ان تمام لڑکیوں کو پسند تھی، جو دن کو کسی حجام یا ڈرائی کلینر کی دوکان پر گاہکوں کے کپڑوں کا حساب لکھتی تھیں، مگر شام کو خوبصورت میک اپ اور بہترین ڈریس میں کلب آتی تھیں کئی لڑکیوں نے پوری کوشش کی جہانگیر ان کی طرف متوجہ ہوجائے۔ کلب کے بعد ان سے ملنے کا پروگرام بنائے اور

ایک دن ان کی محبت میں مبتلا ہو کر شادی پر آمادہ ہو جائے۔

یوں تو قیمتی سوٹ میں جہانگیر کی شاندار شخصیت نکھرتی تھی مگر ثقافتی پروگرام میں شرکت کرنی ہو تو جہانگیر قومی لباس پہنتے۔ کئی انگریز حضرات حیران رہ جاتے کہ ایشیائی لوگوں میں اتنا حسن کہاں سے آیا ہے۔

جس تقریب میں جہانگیر شرکت کرتے وہاں وہ کبھی کسی لڑکی سے زیادہ تعلق نہ بڑھاتے۔ وہ دل سے ان کاغذی پھولوں کو پسند نہیں کرتے تھے خصوصاً کھلم کھلا اظہار محبت اور لباس کی عریانی جہانگیر کو ایک آنکھ نہ بھاتی بھلا اتنے ٹھنڈے موسم میں جہاں مہینوں بعد سورج کی شکل نظر آتی لڑکیاں بغیر آستین کی منی سکرٹ میں ہی آتی جاتی نظر آتی جیسے پلاسٹک کی گڑیاں ہوں

یورپ میں جہانگیر کے دوستوں اور ملنے والوں نے انہیں ان کی شخصیت کی اہمیت کا اتنا احساس دلا دیا کہ وہ اپنے کو ہزاروں میں سمجھنے لگے جس کے بارے میں ان کا ایک خاص نظریہ بن گیا چار سال میں انہیں صرف ایک سپین کی خانہ بدوش رقاصہ حسین نظر آئی اس کے علاوہ ہر لڑکی میں انہیں کوئی نہ کوئی نقص ضرور دکھائی دیتا۔ یورپ میں کس قدر لڑکیاں ہیں وہ کالجوں پر کاؤنٹروں پر دفتروں میں لانڈری شاپ، ہاسٹل، ایرپورٹ اور پولیس غرضیکہ ساری جگہیں لڑکیوں نے سنبھال رکھی ہیں۔ دوستی اور ملنے جلنے میں کوئی حرج نہیں ہیلو کہہ لینے سے بھی کوئی نقصان نہیں مگر کسی لڑکی کو پسند اور دل میں جگہ دینے کے بارے میں ابھی تک جہانگیر نے نہیں سوچا تھا

کلب میں لڑکیاں ان کی شخصیت اور خوش اخلاقی سے بہت متاثر تھیں، ان کی نگاہ میں وہ کسی بڑے لینڈ لارڈ کا بیٹا تھا، جو خوش قسمتی سے انہیں بیاہ کر اپنے ملک لے جائے گا تو وہ عمر بھر رانی بن کر راج کریں گی۔ مگر جہانگیر صاحب نے تو اپنے دل کا دروازہ سب کیلئے بند کیا ہوا تھا۔ انہیں کسی سے دلچسپی ہوتی تو بات بھی تھی۔

چارٹرڈ اکاؤنٹنٹی کے چار سال تو خیریت سے گزر گئے، مگر پانچویں سال انکے لینڈ لارڈ نے وہ مکان بیچنے کا فیصلہ کر لیا جس میں جہانگیر مقیم تھے کام اور پڑھائی کا بار بڑھ گیا تھا چار سال تک مختلف

کھانوں کی کتابیں اور ترکیبیں سامنے رکھ کر کھانا پکاتے پکاتے جہانگیر نے سوچ لیا کہ اب وہ کسی فیملی کے ساتھ PAYING GUEST کے طور پر رہیں گے۔

مالک مکان نے پندرہ دن کا نوٹس بھیج رکھا تھا صبح صبح اخبار میں اشتہار دیکھ کر جہانگیر نے مطلوبہ نمبر پر فون کیا تو بیگم ولیم نے چار بجے کا وقت دیدیا۔

شام کو جہانگیر خوش خوش وہاں پہنچا اور مسز ولیم نے اخلاق سے بٹھایا۔

"بات یہ ہے مسٹر جہانگیر! کہ میرے گھر میں ایک فلیٹ خالی ہے میں وہ کسی یورپی کو کرائے پر دینا چاہتی تھی اور تم ۔" وہ خاموش ہو گئی۔

جہانگیر کے دل کو دھکا سا لگا۔

"میں پاکستانی ہوں معاف کیجئے میں یورپی نہیں ہوں یہاں تعلیم کے سلسلے میں آیا ہوں تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک لمحہ نہ رکوں گا وعدہ رہا۔"

"سنئے مسٹر جہانگیر! میں انکار نہیں کرتی اور تمہیں صرف ایک ماہ کے لئے رہائش گاہ دے سکتی ہوں۔"

"صرف ایک ماہ کیلئے مجھے ایک سال یہاں رہنا ہے ۔"

"مجبوری ہے میری رائے پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کے بارے میں بدقسمتی سے اچھی نہیں وہ نہ صرف گندے ہوتے ہیں بلکہ فرش، دیواروں، چھتوں غرضیکہ سب جگہ ان کے بچے پڑھنا لکھنا اور ڈرائنگ انہی دیواروں پر لکھ کر سیکھتے ہیں تھوکیں اور پان کی پیکیں جابجا ہیں میں نے اپنی دوست کے مکان میں دیکھی ہیں۔ جہاں ایک ہندوستانی فیملی نے دو سال گزارے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے اور دیگر چیزیں توڑنے میں بھی ان کے بچے بڑے ماہر تھے اور میں تو اپنے مکان کے بارے میں نفاست پسند واقع ہوئی ہوں۔"

جہانگیر کو اپنی قوم کی توہین پر بے حد غصہ آیا، گویا چند لوگوں کی خامی پوری قوم وملت کا خاصہ بن گئی ہے۔

"چلئے ایک مہینہ ہی سہی۔" وہ مجبوری سے بولا
"چلو اب، میں تمہیں وہ فلیٹ دکھا دوں۔"
"چلئے صاحب!"

جہانگیر بیگم ولیم کے ساتھ چل پڑا یہ فلیٹ بھی ان کے گھر کا حصہ ہی تھا، سیڑھیاں بھی ایک اور صدر دروازہ بھی ایک تھا، مگر فلیٹ کی سجاوٹ اور نفاست دیکھ کر حیران رہ گیا، قیمتی قالینوں اور مخملیں پردوں، رائٹنگ ٹیبل، دلکش سینریاں، خوبصورت ٹیبل لیمپ اور آتشدان۔

"یہ فرنیچر سے آراستہ کمرے ہیں۔"
"یہ تو بہت شاندار جگہ ہے۔"

"ایسی جگہ کیلئے میں پسندیدہ کرایہ دار چاہتی ہوں۔"
"تو ابھی یہ فیصلہ ہونا باقی ہے کہ میں پسندیدہ کرایہ دار ہوں یا ناپسندیدہ۔"
"وہ وقت بتائے گا۔" بیگم ولیم نے کہا۔
"اچھا کرائے کے بارے میں بھی بات ہو جائے۔"
"کل تم اپنا سامان لے کر آجاؤ تو طے ہو گا۔"

اگلے دن آنے کے وعدہ پر جہانگیر اپنی پرانی رہائشگاہ پر آیا تو سوچنے لگا، بیگم ولیم پینتالیس سال کی عمر میں بھی کتنی ACTIVE اور زندہ دل ہے مگر جہانگیر صاحب خیال رہے یہاں پر ہر شخص زندہ دل اور خوش مزاج ہے، اپنی رونی صورتوں سے یہ دوسروں کے دلوں کے آئینوں کو دھندلا نہیں کرتے، یہ روایتی قوم دوسری عظیم جنگ کی تباہ کاریوں سے نئے حوصلے کے ساتھ اپنے مسائل کے آگے سینہ سپر ہونے کی عادت ڈال چکی ہے یہاں ہر شخص مصروف کار ہے اور اپنے ملک میں پانچ کروڑ کی آبادی بے کار ہے اور قوم کے نوجوان کالجوں میں چند پیریڈ اٹینڈ کر کے باقی دن لڑکیوں کے سکول یا کالج کے سامنے یا بس سٹاپوں پر لڑکیوں کو دیکھ کر فلمی گانے گاتے یا آہیں بھرتے ہیں اور اگر کبھی رومانس ہو جائے تو باقی عمر المیہ شاعری یا ماتم میں گزار دیتے ہیں۔

اگلے دن جہانگیر اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ بیگم ولیم کے یہاں پہنچا۔ سامان تو بیگم ولیم نے اس کے کمرے میں رکھوا دیا۔ مگر ڈرائنگ روم میں ولیم صاحب سے تعارف کرایا۔

پچاس سال کے مسٹر ولیم گرم سوٹ میں ملبوس تھے۔ سرخ و سفید چہرہ میانہ قد، اکہرا بدن جسم، سر پہ شاذ و نادر بال رہ گئے تھے۔ یہ شخص خاصا ذہین اور ہوشیار تھا۔

وہ جہانگیر سے مل کر بہت خوش ہوا "یقیناً تم ایک ڈیسنٹ آدمی ہو۔ کل جب تم سے ملاقات ہوئی تھی۔ مگر پچھ کرایہ داروں سے ملاقات ہو چکی ہے۔ میری بیگم تم سے کہہ چکی تھیں۔ اس لیے میں نے سب کو انکار کر دیا۔"

جہانگیر نے دل ہی دل میں کہا۔ "شکر ہے کوئی دھرنا مار کر نہیں بیٹھ گیا۔"

"ہاں، تم ہماری لبے بی سے نہیں ملے۔"

جہانگیر کو ہنسی آ گئی۔ مغرب میں جاؤ یا مشرق میں والدین کا بس چلے تو بچے کو مہمان کے سامنے پلیٹ میں رکھ کر پیش کریں۔

"دیکھئے صاحب! داد دیجئے کیا شاہکار ہم نے جنم دیا ہے۔"

خیر سے میاں بیوی پینتالیس پچاس کے ہو چکے ہیں۔ مگر ابھی لبے بی کو پالنے کا شوق پورا فرما رہے ہیں۔ اب انہیں کون بتائے۔ ہزاروں خاندان اپنے ملک میں ایسے ہیں جہاں جوان بیٹی کی شادی ہو جاتی ہے اور اگلے سال بیٹی کے یہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو ادھر اماں کے یہاں بھی ایک عدد بچے کا ظہور ہو جاتا ہے۔ یہ غالباً بچہ نمبر دس ہوتا ہے۔

مگر یہاں تو کچھ مفاہمت کرنی ہی پڑے گی۔ مارے مروت کے لینڈ لیڈی کی بچی کو گود میں اٹھانا پڑا یا میری پڑھائی لے۔ دوران اپنے ملک کے بچوں کی طرح اس نے دن رات رو رو کر مجھے ڈسٹرب کیا تو اسی دن سے نئے مکان کی تلاش شروع کر دوں گا۔

"بیگم! لبے بی کو بلاؤ۔" ولیم صاحب نے کہا۔

"وہ سو رہی ہوگی۔" بیگم ولیم نے کہا۔

جہانگیر بے بی کی اس حرکت سے گھبرا رہا تھا۔ کہیں ان کی صاحبزادی پر الزام چپکا نہ ہو۔ اور آج تو اسے بہترین سلوک اور با مروت ہونے کا مظاہرہ کرنا ہے۔ بے بی آ گئی تو گود اٹھانا پڑے گا اور محترمہ نے معصومیت میں اگر پیشاب کر دیا تو اپنا ستیاناس ہو جائے گا۔ خیر کچھ بھی ہو۔ بچی کو تو میں گود میں نہیں اٹھاؤں گا۔ اس قسم کی حرکتوں سے میری جمالیاتی حس کو ٹھیس پہنچتی ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں ذوقِ جمال کا قائل ہوں اور کیٹس کے خیال کا زبردست حامی ہوں کہ حسن ایک ابدی خوشی کا احساس دیتا ہے۔ مگر پیشاب بغیر اطلاع کے کرنے والے بچوں سے خدا کی پناہ۔

اتنے میں بیگم ولیم بے بی کو لے آئیں مگر وہ دروازے میں ہی ٹھہر گئی۔

ولیم صاحب AFFECTION HOW کرنے لگے "آؤ بے بی! شرماؤ نہیں جہانگیر کو تم سے ملنے کا شوق ہے" مگر وہ دروازے سے لگ کر چپکی کھڑی تھی۔

جہانگیر کے جی میں آئی کہ اپنے یہاں کی فلموں کے ہیرو کی طرح سات پردوں میں رہنے والی ہیروئن کو بزاروں تماشائیوں میں لا بٹھائے۔

"واہ صاحب کمال ہے آپ تو شرما رہی ہیں۔ جیسے کسی کی نظر لگ جائے گی"

پھر جانے کیسے آہستگی سے بے بی خود ہی اندر آ گئی۔

ارے! جہانگیر حیران و پریشان رہ گیا۔ وہ کیا سمجھ رہا تھا اور وہ کیا نکلی۔ اٹھارہ انیس سال کی معصوم سے چہرے والی نمکین رنگ والی وہ لڑکی تو بڑی شرمیلی نکلی۔ صوفے پر بیٹھتے بیٹھتے اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

وہ پتھر کی مورتی کی طرح چپ تھی۔ مگر ولیم صاحب بتانے لگے۔

"ڈوروتھی نے پچھلے سال فائن آرٹ میں گریجویشن کیا ہے۔ یہ ہماری ایک ہی بیٹی ہے۔ ہم بہت کوشش کرتے ہیں کہ بے بی اپنی عادتیں تبدیل کرے۔ سوشل ایکٹویٹی میں حصہ لے۔ مگر یہ گھر سے باہر نہیں نکلتی۔ سارا وقت اپنے کمرے میں گھسی کتابیں پڑھتی ہے یا تصویریں بناتی ہے۔ اس ڈرائنگ روم کی ساری ڈیکوریشن اسی کے ذوق کی مرہونِ منت ہے"

جہانگیر نے دوبارہ کمرے کی سجاوٹ پر نگاہ ڈالی۔ آرٹ اور فن کے حسین مرقعے دیواروں پر آویزاں تھے۔ اس نے بے نیاز سی لڑکی پر نگاہ ڈالی جس کے کاندھوں پر گھرے براؤن بال جھکے ہوئے تھے اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

بیگم ولیم تعجب سے بولیں۔ "کیا بات ہے مسٹر جہانگیر؟"

"یونہی تھوڑی دیر پہلے جب وکٹوریہ نہیں آئی تھی تو میں نے سمجھا۔ یہ دو ایک سال کی بچی ہوگی اور شاید مجھے رسماً اسے گود میں اٹھانا پڑے گا۔ مگر شکر ہے۔ اس کی نوبت نہیں آئی۔"

"ہماری نظر میں یہ ہماری ساری کائنات ہے۔" بیگم ولیم بتانے لگیں مگر وکٹوریہ "معاف کیجئے" کہہ کر چلتی بنی۔

ولیم صاحب نے معذرت کی۔ "تم محسوس نہ کرنا۔ گھر میں آنے والے مہمانوں کے سامنے اوّل تو آتی نہیں۔ بلاؤ تو چند لمحے بعد کوئی عذر کر کے چلی جاتی ہے۔ میری بیوی نے کافی سمجھانے کی بھی کوشش کی ہے۔ بھلا ایسی پردہ نشین تنہا لڑکی کا اس معاشرے میں گزارہ کیسے ہوگا۔ میں نے دو ایک ماہرین نفسیات سے بھی مشورہ کیا ہے۔ وہ کوئی خرابی نہیں بتاتے۔ ہم کبھی سنجیدگی سے اسے سمجھاتے ہیں تو کئی کئی دن کلام تک نہیں کرتی۔ کھانا بھی نہیں کھاتی۔

"میں نہیں سمجھتی کہ یہ نارمل لڑکیوں کا رویہ ہونا چاہئے۔" بیگم ولیم بولیں۔

جہانگیر نے شوخی سے کہا۔ "میرے ملک میں ایسے رویہ والی خاموش طبع لڑکیاں نیک سمجھی جاتی ہیں۔"

"یہ بحث تو طول اختیار کر جائے گی۔ چلئے اب کھانے کا وقت ہوگیا۔" بیگم ولیم نے کہا۔

جہانگیر معذرت کر کے اٹھنے لگا۔ مگر ولیم صاحب نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تکلف کی ضرورت نہیں۔ اب تمہیں یہیں تو رہنا ہے۔"

کھانے کی میز پر کئی قسم کی چیزیں تھیں۔ مگر جہانگیر نے دیکھا وکٹوریہ سب سے بے نیاز اپنی پلیٹ پر جھکی ہوئی تھی۔ کیا مجال جو اس نے اپنی پلکوں کی جھالر اٹھا کر جہانگیر کو دیکھا تک ہو۔ پہلی بار

اپنی بے قدری کا جہانگیر کو احساس ہوا۔ جیسے اس شرمیلی سی خاموش طبع لڑکی نے انہیں ناپسند قرار دے دیا ہو۔

مگر جہانگیر صاحب تم یہاں خود کو پسند کروانے تو نہیں آئے۔ اچھا ہے۔ جو یہ لینڈ لارڈ کی صاحبزادی تمہیں پسند کر بیٹھتی تو مجبوراً تمہیں ان کے کرایہ دار رہنے کی مدت تک ہی سہی ان کی بیٹی کو دل کے کسی گوشے میں جگہ دینی پڑتی اور ایک دن جب تمہاری یا اس کی طرف سے واقعی محبت کا اظہار ہوتا تو مستقبل کے سارے پروگرام چوپٹ ہو جاتے۔ اچھا ہے وکٹوریہ دوسری لڑکیوں سے مختلف تھی۔ اب اس کے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے عافیت رہے گی۔

گو جہانگیر کو سجا سجایا کمرہ بے حد پسند آیا۔ مگر بیگم ولیم نے اسے حسب مرضی رد و بدل کی اجازت دے دی تھی۔ شروع کے چند دن جہانگیر نے ہوٹل سے کھانا کھایا۔ مگر جلد ہی وہ تنگ آ گیا۔ کبھی وہ بے انتہا تھکا ہوتا۔ اس کا جی نہ چاہتا کہ باہر نکلے۔ مگر جلد ہی بیگم ولیم نے اس کی مشکل جانپ لی۔ "جہانگیر! تم کھانا ہمارے ساتھ کھایا کرو۔ میں جانتی ہوں۔ تم مسلمان ہو۔ گوشت کے معاملے میں تمہارے لئے احتیاط کروں گی۔" بیگم ولیم کی اس مخلصانہ پیشکش کو وہ رد نہ کر سکا اور فلیٹ کا کرایہ ماہانہ مگر کھانے کا بل وہ ہفتہ وار دینے لگا۔

یہ سب کچھ تو ٹھیک تھا۔ مسٹر اور بیگم ولیم اس کے لئے بہت مخلص ثابت ہوئے۔ انہوں نے دنوں میں ہی اس کی نفاست پسندی اور اعلیٰ ذوقی کو جانچ لیا تھا۔ مگر ان کی صاحبزادی کا سلوک روز اول سے ہی ناقابل فہم تھا۔ الگ تھلگ چپ چاپ کبھی دکھاوے کے لئے بھی وہ نہ ہنستی تھی۔ کیا مجال جو اس کی کوئی سہیلی گھر پہ آ جائے یا وہ کسی سے ملنے چلی جائے۔ کتابیں پڑھنے اور پینٹنگ کے علاوہ گھر کی صفائی میں وہ لگی رہتی۔ باقاعدگی سے ہر چند روز بعد گھر کی آرائش و زیبائش میں رد و بدل بھی کرتی۔ اسے اپنے کام میں مصروف دیکھ کر جہانگیر سوچتا۔ شاید وہ اس زمین کی لڑکی نہیں ہے مشرق سے ہی ادھر سدھاری ہے گی خاص وجہ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جہانگیر کے دل میں اس کے لئے کوئی خاص جگہ بن گئی تھی۔

صرف کھانے کی میز پر اس کا سامنا ہوتا ورنہ وہ دکھائی ہی نہ دیتی۔ ایک آدھ دفعہ جہانگیر نے اس کی مصوری پہ اناڑی پن سے صرف بات کرنے کے لئے تبصرہ کرنا چاہا مگر وہ بڑی رکھائی سے بولی۔
"آپ کو اس حد تک بات کرنی چاہئے جس حد تک آپ کا علم اور تجربہ ہے۔ مجھے پسند نہیں کوئی مجھے خوش کرنے کے لئے میرے شوق میں دلچسپی لے۔"

اس سمے جہانگیر کا جی چاہا وکٹوریہ کے رخسار پہ ایک تھپڑ لگا دے اور اس گھر کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر کہیں اور چلا جائے۔ اس حد تک وہ اس سے لاتعلق تھی۔ مگر جب وہ گھر پہ موجود نہ ہوتا تو وہ اس کے کمرے کی صفائی کرتی۔ بکھری چیزیں ٹھکانے پر رکھتی۔ میلے کپڑے واشنگ مشین میں دھو کر شام تک استری کر کے الماری میں رکھ دیتی۔ بڑی عجیب ناقابلِ فہم لڑکی ہے اور بات کرنے کے معاملے میں کتنی کنجوس۔ میرے ساتھ کسی دن کلب جائے تو اسے پتہ چلے کہ کتنی لڑکیاں مجھے پسند کرتی ہیں۔

ایک دن وسیم اور بیگم وسیم شب کے کھانے پر باہر مدعو تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں جہانگیر نے وکٹوریہ سے کہا:

"اگر آپ کو میرا یہاں رہنا ناپسند ہے تو میں کہیں اور چلا جاتا ہوں۔ کیا فائدہ انسان دوسروں کے ذہن کا بار بن کر رہے۔"

وہ ایک لمحہ جہانگیر کے چہرے کو دیکھتی رہی پھر آہستگی سے بولی۔ "اگر یہ بات ہوتی تو میں پہلے دن ہی امی ابو کو کہہ دیتی۔ مجھ سے پوچھے بغیر تو اس گھر میں ایک چڑیا کا بچہ بھی نہیں آ سکتا۔"

"تو گویا آپ کو اپنے امی ابو کی لاڈلی بیٹی ہونے پر فخر ہے۔" جہانگیر نے کہا۔

"میں اس بات کو اہم نہیں سمجھتی۔"

"کبھی ہم بھی اپنی امی ابو کے لاڈلے ہوتے تھے۔ مگر ہمارے والدین تو اللہ میاں کو پیارے ہو گئے۔" اس نے وکٹوریہ سے ہمدردی وصول کرنا چاہی۔

"میرے نزدیک یہ انداز ہمدردی حاصل کرنے کا ایک حربہ ہے۔ آپ اب دو سال کے بچے تو نہیں ہیں۔" یہ کہنے کے بعد وکٹوریہ خاموشی سے اٹھ گئی اور جہانگیر بے دلی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

وسیم صاحب کے باغیچے میں مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے خاصا کوڑا کرکٹ بکھرا ہوا تھا۔ عام طور پر لان میں گھاس یوں بڑھی ہوئی تھی جیسے کسی جوگی کی بے ترتیب جٹائیں۔ ایک دن

صبح سویرے ورزش کے طور پر جہانگیر نے پورے باغیچے کی صفائی کر ڈالی۔ اگلے دن منہ اندھیرے مشین سے گھاس بھی کاٹ ڈالی۔ اتنے بڑے باغیچے کی صفائی نے اسے مکمل طور پر تھکا دیا۔ مگر باغیچے پر نگاہ ڈالی تو اس کی جمالیاتی حسن نے داد دی۔

"جہاں جاؤ حسن تلاش کرو۔ اگر حسن نہ ہو تو حسن پیدا کرو جہانگیر صاحب!"

صبح ناشتے کے بعد وہ حسبِ معمول اپنی بزنس کمپنی میں چلا گیا۔ شام کو بیگم ولیم بولیں۔

"جہانگیر، ہمیں باغبانی کا بہت شوق ہے۔ اگر تم کسی مالی کو جانتے ہو تو بلا لاؤ۔ باغ کی مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے یہ تباہ ہو رہا ہے۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔"

وہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئیں —— جہاں سے باغ کا مکمل نظارہ ہوتا تھا۔

"مائی گاڈ! باغیچہ کتنا شاندار ہو گیا ہے۔ کوئی فرشتہ صفائی کر گیا ہے کیا؟"

ولیم صاحب دوڑ کر آئے اور جہانگیر زیرِ لب مسکرا کر ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"یہ تو کسی انسان کا کام ہے۔ وکی اتنا ہارڈ کام نہیں کر سکتی گو صفائی کا اسے بھی جنون ہے۔ مگر"

"ہاں میں سمجھ گئی۔" بیگم ولیم نے تالی بجائی۔ "یہ سارا جہانگیر کا کمال ہے۔ مگر بیٹے! تم نے اتنی بھاری گھاس کاٹنے کی مشین اکیلے کیوں چلائی؟" ولیم صاحب کو مدد کے لئے بلا لیا ہوتا۔"

"نہیں صاحب میں پانچ بجے کیوں ان کی نیند میں خلل ڈالتا۔ میں نے تو مشین بھی آہستہ چلائی تھی۔ کہیں وکی کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ رات گئے تک اس کے کمرے کی بتی روشن رہتی ہے۔"

وکی کچھ نہ بولی مگر بیگم ولیم نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

"ہمیں کیا معلوم تھا کہ تم چھپے رستم ہو۔ میں ان پیتیوں میں تمہاری نفاست اور خوش ذوقی دیکھ کر حیران رہ گئی ہوں۔"

"نہیں صاحب! ہم پاکستانی بہت گندے ہوتے ہیں۔ کل مجھے آپ کے یہاں آئے مہینہ بھر سے زیادہ ہو چکا ہے۔ اصولاً اب تک مجھے کہیں اور ٹھکانہ ڈھونڈ لینا چاہئے تھا۔"

جہانگیر نے کہنے کو یہ بات کہہ دی مگر اس کا دل جانتا تھا کہ یہاں سے نقل کر کتنی دقتوں اور

مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہ اصولوں اور سوچ کے قید خانے میں چھپ رہنے والی لڑکی دکی کہیں تنگ نہیں آئے گی۔

مسز ولیم اس کی عادات و اخلاق سے بہت متاثر تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ اتنا ویسٹ لڑکا ہمیشہ ان کے پاس رہے۔ اسی لئے دو ماہ کے عرصے میں فلیٹ کا کرایہ اور کھانے کے پیسے انہوں نے کم سے کم وصول کئے۔ جہانگیر ان پر بار نہیں بننا چاہتا تھا۔ اسی لئے وہ اکثر بیشتر کرسمس ایسٹر یا سال نو پر کوئی نہ کوئی نفیس سا تحفہ کبھی بیگم ولیم کو اور کبھی ولیم صاحب کو زبردستی تھما دیتا۔ ہاں وکی کی سالگرہ کا دن ایک روز رازداری سے اس نے بیگم ولیم سے معلوم کر لیا۔ مگر ساتھ ہی انہوں نے وارننگ دے دی کہ:

"وکی سالگرہ منانے کے خلاف ہے۔ تم کوئی اہتمام نہ کرنا ورنہ وہ روٹھ جائے گی۔"

"ممی! آپ بے فکر رہیں۔ میں کچھ نہیں کروں گا۔ صرف مبارکباد دے دوں گا وکی کو!"

ایک ہفتے بعد وہ آکسفورڈ سٹریٹ پر اکیلا گھومتا ہوا سوچ رہا تھا وکٹوریہ کے لئے کون سا تحفہ لیا جائے۔ چلتا چلتا وہ کافی دور نکل گیا۔ شام کی روشنیوں میں گفٹ سٹور جگمگا رہا تھا۔ کاؤنٹر گرل کے مشورے پر کانچ کی وہ نازک سی خوبصورت گڑیا اس نے پیک کرا کر ربن بندھوالیا اور گھر لے آیا۔

اپنی سالگرہ کے دن بھی وکٹوریہ اپنے کاموں میں روز کی طرح مصروف تھی مگر جہانگیر کو یہ دن عام دنوں سے مختلف لگ رہا تھا۔ کام ختم کرنے کے بعد وکی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جہانگیر نے شاذ و نادر ہی اس کے کمرے میں کبھی جھانکا تھا۔ ناشتے کی میز پر وہ آئی ضرور تھی مگر کب چلی گئی یہ جہانگیر کو پتہ بھی نہ چلا۔ اپنے کمرے میں آ کر جہانگیر نے کاغذ کے ایک پرزے پر لکھا:

"اپنے ماحول سے جلا وطن وکی کی سالگرہ پر مبارکباد کے ساتھ کانچ کی گڑیا کا تحفہ...!"

خلوص کیش 'جہانگیر'

دیکھئے کیا ہو وہ زیر لب مسکراتا ہوا اس کے کمرے کی طرف چلا۔ وہ سوچ رہا تھا وکٹوریہ تحفے کو دیکھ کر آگ بگولا ہو جائے گی اور شاید اسے سخت سست بھی کہے گی۔ شاید کہے کر

" مجھے سالگرہ منانے سے نفرت ہے۔ پھر بھی لوگ نجانے رسموں کی پابندی کرنا کیوں ضروری سمجھتے ہیں "

وہ ہمیشہ نپے تلے الفاظ استعمال کرتی۔ اس نے کبھی کوئی فالتو لفظ نہیں بولا تھا۔ بغیر وجہ کے کسی نے اسے ہنستے یا مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی خاص سانچے میں ڈھل کر بنی ہے آج اس کی سالگرہ کے دن جہانگیر نے سب کچھ سننے کے لئے خود کو آمادہ کر لیا۔ اس نے دیکھا وکٹوریہ بے تکلفی سے اپنے کمرے میں ایزی چیئر پر بیٹھی کو جھلی یوجین اونیل کے ڈرامے کی کتاب پڑھ رہی ہے اسکے کمرے میں پردیسی کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ ممی نے بتایا تھا۔ وکی کو یہ کولون پسند ہے۔

جہانگیر لمبی چوڑی معذرت کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا تھا اس لئے وہ بغیر کسی تمہید کے بولا :

" وکی ! " وکٹوریہ کرسی پر بیٹھی رہی۔ " آج تمہاری سالگرہ ہے۔ میری دعا ہے خدا تمہیں ایسی جلاوطنی سے رہائی دے ! "

" میری سالگرہ " وکٹوریہ کے جسم میں جیسے کرنٹ سا دوڑ گیا۔ آج انیس مارچ ہی تو تھا " آپ کو کیسے پتہ چلا ؟ "

" ممی سے پوچھا تھا — یہ ننھا سا تحفہ یقیناً تمہیں بوجھ نہیں لگے گا۔ ہاں اگر میری اس حرکت پر غصہ آئے تو تحفہ اٹھا کر پھینک دینا۔ کانچ کی گڑیا ٹوٹ جائے گی "

جہانگیر اپنے کمرے میں آ گیا۔ مگر جلاوطن گڑیا ویسے ہی آرام کرسی پر نیم دراز کتنی ہی دیر تک کانچ کی اس گلابی گڑیا کو گھورتی رہی — " شکریہ ! جہانگیر صاحب میں اسے سنبھال کر رکھوں گی " اس نے آہستہ سے کہا جیسے کوئی راز کی بات کہہ دی ہو۔

اگلے دن ناشتے کی میز پر جہانگیر نے کہا : " ممی ! آپ نے کہیں کانچ کی ٹوٹی ہوئی گڑیا

تو نہیں دیکھی ۔"

"کیا ؟" وکی نے بے اختیار جہانگیر کی طرف دیکھا ۔

"نہیں بیٹے ! میں نے ٹوٹی گڑیا کہیں نہیں دیکھی "

اس بات کا اثر یہ ہوا کہ دوپہر کو وکی خود جہانگیر کے پاس شکریہ ادا کرنے آئی ۔

"میں معذرت چاہتی ہوں ۔ آپ اتنی جلدی چلے گئے اور مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ مل سکا ۔"
کئی مرتبہ ممی اور پاپا نے جہانگیر سے کہا تھا کہ سیر و تفریح کے لئے کبھی کبھی وکی کو ساتھ لے جایا کرو ۔ پچھلے کئی مہینوں میں اس نے ایک دفعہ بھی وکٹوریہ کو باہر چلنے کی دعوت نہ دی ۔ جب اس کا جی چاہتا اکیلا ہی کلب چلا جاتا ۔ گولف سے اسے عشق تھا ۔ ہفتے کی شام اور اتوار کی صبح کو وہ باقاعدگی سے اٹھارہ ہول (HOLES) مکمل کرتا ۔ لندن میں اس شوق کو وہ جاری رکھے ہوئے تھا ۔

ایک اتوار کو موسم بڑا سہانا تھا ۔ ہلکی ہلکی سنہری دھوپ چمک رہی تھی ۔ ایسے موسم میں آفتابی غسل کیلئے لوگ ٹیمز کے کنارے جاتے ہیں ۔

" وکٹوریہ ! چلتی ہو ؟"

" کہاں ؟" وہ حیران سی رہ گئی ۔

" سیر کے لئے کہیں جاتے ہیں "

" میں آپ کو لندن کے آوارہ نوجوانوں سے الگ سمجھتی ہوں " وہ بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ کر بولی ۔

جہانگیر نے بے ساختہ اپنے رخسار کو ہاتھ لگایا " گویا میں شریف آدمی ہوں "

الٹے قدموں سے وہ واپس اپنے کمرے میں آ کر گولف بال اور کلب جھاڑنے لگا ۔

محترمہ وکٹوریہ صاحبہ ! آپ تو غلطی سے لندن کے اس گھرانے میں پیدا ہو گئی ہیں ۔ آپ کو تو ایشیا کے کسی پسماندہ ملک میں پیدا ہونا چاہئے تھا ۔ جہاں پردے کا سختی سے رواج ہوتا ۔ گھر سے لڑکیوں کا باہر نکلنا گناہ سمجھا جاتا اور تم یورپ کے اس ترقی یافتہ ملک میں پیدا ہوئی ہو ۔ جہاں دا

عیش دینے کے لئے عربی شیخ اور شہزادوں کے علاوہ اکثر بیل شخصیتیں آتی ہیں۔ جہاں شب بھر کے لئے سپین کی خانہ بدوش رقاصائیں اور سکاٹ لینڈ سے شمپین ہوائی جہازوں میں منگوائی جاتی ہے۔ یہاں لندن کی سب سے مشہور سٹریٹ میں رہ کر تم کیسی قدیم رسومات کو اپنانے پر مصر ہو۔ کچھ بدلو خود کو اگر تم نے وقت اور زمانے کا ساتھ نہ دیا تو اپنی دنیا میں سب سے پیچھے اور اکیلی رہ جاؤ گی۔

جہانگیر کا خیال تھا اسے ایک سال اور لندن میں رہنا پڑے گا مگر کچھ کمپنی کی اعانت اور بہت کچھ اپنی محنت کی وجہ سے اس کا کورس چھ ماہ میں ہی مکمل ہو گیا۔ ایک طرف اسے وطن واپس جانے اور چار سال کی محنت بار آور ہونے پر خوشی تھی دوسری طرف ولیم اور بیگم جیسے شفیق دوستوں سے بچھڑنے کا ملال تھا اور وکی ۔۔ اس نے تو جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ اپنی ذات کے خول سے باہر نہیں آئے گی۔ اس نے کبھی جہانگیر کے ساتھ اکیلے جانا گوارہ نہیں کیا البتہ ایک دو دفعہ شاہ باغ ریسٹورانٹ میں جب جہانگیر نے اپنی سالگرہ پارٹی پر تینوں کو مدعو کیا۔ تو وکی بھی آئی تھی۔ ایک دو دفعہ جہانگیر کو یاد تھا۔ شکسپئر کا ڈرامہ شہر کے بہترین تھیٹر ہائوس میں دکھایا جا رہا تھا۔ تب ولیم فیملی کے ساتھ وہ بھی گیا تھا۔ یہ چند دن تو انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ مگر اب تو تین دن بعد جہانگیر نے جانے کا اعلان کر دیا تھا۔

ولیم صاحب کا خیال تھا۔ وہ اپنے کسی دوست کے پاس جا رہا ہے۔ مگر اس نے قسم کھا کر کہا میں تو واپس اپنے ملک جا رہا ہوں۔ ممی نے وکی کو بتایا۔

"جہانگیر جا رہا ہے۔" وہ زبردستی پڑھ گئی اور ممی کا دل ڈوب سا گیا۔ انہوں نے اپنے اندر کی کیفیت ظاہر نہ کی۔

کبرڈ میں سے کپڑے نکال کر وہ اٹیچی کیس میں تہہ کر کے رکھ رہا تھا کہ وکی آ گئی۔

"ممی کہتی ہیں آپ جا رہے ہیں۔"

"ممی سچ کہتی ہیں۔۔۔ میں شہر مسافر ہوں۔ آپ جیسی عادت پسند خاتون کی تنہائی میں اتنے دن

مخل رہا۔ میں نے تو پندرہ دن بعد ہی جانے کی تیاری کر لی تھی مگر میرے زیادہ عرصہ تک ٹھہرنے میں ممی کی شفقت اور ولیم صاحب کی محبت کا ہاتھ ہے۔ یہ دو چیزیں تھیں کہ اتنا عرصہ رہ گیا ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ میری وجہ سے آپ کے کئی اصولوں کا خون ہوا۔ کئی مرتبہ میں اپنے دوست احباب کے ساتھ سینما تفریح کی وجہ سے گھر دیر سے پہنچا اور تم کو اتنی دیر جاگنا پڑا — اور پھر ان بچہ ریزیوں سے کیا ساحل جین کا صلہ کچھ بھی نہیں؟"

"شاید آپ کی بات سچ ہی ہو" وکی چلی گئی۔ مگر جہانگیر کو محسوس ہوا۔ شاید وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر اس نے نہ کہنا مناسب سمجھا۔ "چلئے یونہی سہی"۔

"ممی! کیا مجھے جانے کی اجازت ہے؟" بغل میں رین کوٹ اور ہاتھ میں اٹاچی کیس تھامے وہ اپنے کمرے سے نکلا۔ ہر چیز ویسے ہی ہے جیسی اس وقت تھی جب وہ چھ ماہ پہلے یہاں آیا تھا۔

ولیم صاحب نے اس کا اٹاچی کیس کار میں رکھا۔

"ممی! آپ نے آزما لیا پاکستانی کتنے گندے ہوتے ہیں۔ ان کے بچے دیواروں پر قابلِ نفرت نقش و نگار بنا دیتے ہیں۔ ناپسندیدہ کرایہ دار کو زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کا تو بڑا عزم اور حوصلہ ہے۔"

"بیٹے! مجھے شرمسار نہ کرو۔ تم کہنا چاہتے ہو کہ تم بہت نفاست پسند اور خوش ذوق انسان ہو۔ مگر سارے لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ احتیاط اچھی چیز ہے اور تم بہت ڈیلیٹنٹ لڑکے ہو۔ تمہارے جانے سے پہلے تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ وکٹوریہ ہماری اولاد ہے۔ میرے شوہر اور میں بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اس لئے وکی ہمارے ساتھ باہر نہیں جانا چاہتی۔ مگر مجھے افسوس ہے تمہارے یہاں ہونے کے باوجود اس کی عجیب و غریب عادتوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ولیم اور میرے بعد وکی ہماری ساری جائیداد، باغ، دو کانوں اور اس بلڈنگ کی تنہا مالک ہو گی۔ دولت کے پیچھے مرنے والوں کی یہاں کمی نہیں۔ میں چاہتی ہوں، کسی طرح وکی خوش رہے۔ مجھے ایک دفعہ یہ احساس ہوا تھا، شاید وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔"

"ممی! ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ وکی بہت پیاری اور اچھی لڑکی ہے۔ اگر میں نے کبھی سوچا ہوتا کہ یورپ میں شادی کروں گا تو یقین کیجیے کہ آپ کے خلوص اور محبت کے آگے ضرور میں سرنگوں ہو جاتا۔"

"بیٹے! اگر تم چاہو تو ہم کچھ سال انتظار کر لیں گے تاکہ تم اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کر لو۔"

"ممی! میں نے وکی کی طرف کبھی پیش قدمی نہیں کی۔ میں آپ کو غلط امید نہیں دلاؤں گا۔ میری منزل اپنے وطن میں ہے۔"

"بیٹے! میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی۔ یہ بات بھی وکی کی خوشی کے پیش نظر میں نے کی ہے۔ کیوں کہ ان گزرے دنوں میں میں نے وکی کی نگاہوں میں تمہاری پرستش کی شمع جھلملاتی دیکھی ہے۔"

"چلیے سامان رکھا جا چکا ہے۔" ولیم صاحب نے برآمدے سے آواز لگائی۔

گلابی پیرہن میں وکی بھی کھڑی تھی۔ بڑی سادہ سی معصوم سی لڑکی جو اندر سے بڑی گہری تھی۔

لندن ایئرپورٹ آ گیا۔ جہانگیر ٹکٹ اور سامان چیک کرنے کے بعد لوٹا۔ بیگم ولیم کی پلکیں نمناک تھیں۔ انہوں نے اس کی پیشانی چومی۔

"بیٹے! ہمیں بھول نہ جانا۔ تم ہمیں اکثر یاد آؤ گے۔"

وہ وکٹوریہ کی طرف مڑا۔ "وکٹوریہ! خدا حافظ!"

"پھر آپ کا لندن سے گزر ہوا تو ضرور آئیے گا۔ ہماری آنکھیں آپ کا انتظار کریں گی۔ اگر ہم زندہ نہ رہے تو ہماری روح آپ کا انتظار کرے گی۔"

"اب کچھ کہنے کا وقت نہیں، جانے کا وقت ہے۔ خدا حافظ!"

وہ طیارے کی سیڑھیاں چڑھ گیا، تو وکی کی آنکھیں بہہ نکلیں۔ طیارے کا انجن سٹارٹ ہوا تو وہ چلّا پڑی:۔

"ممی! اسے روک لو وہ چلا گیا تو پھر کبھی نہیں آئے گا۔ ہمارے مرنے پر بھی نہیں"

ممی کو یقین تھا وہ جہانگیر کو پسند کرتی ہے۔

ممی پاپا سے کچھ بات کرنے لگیں اور وہ بھاگ کر پاپا کی سفید کونسل کی پچھلی سیٹ پر گر کر آنسوؤں سے منہ دھونے لگی۔

شام کا اس نے بیتابی سے انتظار کیا۔ ولیم اور بیگم ولیم شام کا کھانا کھانے کے دوران بہت اداس تھے۔ انہیں جہانگیر سے اپنے بیٹے کی طرح پیار ہو گیا تھا۔ وہ تو ایک موسمی پرندے کی طرح تھا جو سرما گزارنے یہاں آیا تھا۔ موسم بدلا تو وہ واپس اپنی سرزمین کی طرف پلٹ گیا۔ کب موسم بدلے اور کب وہ آئے۔ یہ کون جانے! اور وکٹوریہ نے تو اگلے دن کا بھی انتظار نہ کیا۔

ساڑھے چار سال کے بعد اپنے ملک میں واپس آ کر جہانگیر کو قطعی اجنبیت کا احساس نہ ہوا۔ ان کی شاندار کوٹھی کا نوکر ان کے جانے کے بعد بھی روزانہ صفائی کرتا رہا۔

کئی دن تک جہانگیر کو وسیم، بیگم وسیم اور وکی کا خیال آتا رہا۔ بیگم وسیم کی پیش کش، وکی کی ان کہی پسند یہ سب غیر متوقع چیزیں تھیں۔

اگر انہوں نے اپنے دل میں حسن کا ایک خاص معیار نہ قائم نہ کیا ہوتا اور اپنے خیالوں میں کسی حسن کی مورتی نہ بسائی ہوتی تو وہ اتنی پیاری اور عظیم وکی کو اپنانے سے کبھی انکار نہ کرتے۔ مگر اب تو وطن واپس آنے کے ساتھ ہی انہیں گورنمنٹ کی سب سے سینئر پوسٹ بزنس ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ دیا گیا۔ شاندار کوٹھی، کار، نوکر، مالی، چوکیدار، پارٹیاں، ڈنر سب کچھ بڑی تیزی سے ہونے لگا۔ پر وسیم صاحب کا خط دیکھ کر اس کے دل کو دھکا سا لگا۔ اس کے واپس آنے کے اگلے ہی دن وکی نے خودکشی کر لی تھی۔

وکٹوریہ اپنی زندگی میں تم نے ہمیشہ خود کو قید کئے رکھا۔ محدود سی دنیا میں جہاں تصویریں اور کتابیں اور محبت کرنے والے ماں باپ — یہ بڑی پرسکون سی زندگی تھی۔ مگر کتنا اچھا ہوتا ایں بھی تمہارے گھر مہمان بن کر نہ آتا — اور تمہاری زندگی اتنی مختصر اور تمہارا دل اتنا چھوٹا اور نازک نہ ہوتا — ایک ہی سانحہ تمہارے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔

اس شام جہانگیر نے تعزیت کا ایک خط ندیم صاحب کو لکھا۔ اس کے بعد کبھی ان کی طرف سے کوئی اطلاع نہ آئی۔ ہاں وقت تم نے ان شکستہ سفینوں کا سہارا لیا۔ جو تمہیں منجدھار میں ڈبو گئے شاید تمہاری فنا تمہارے احساس کا تقاضا تھا!

اس کے بعد جہانگیر کو شاذ ہی اس کومل سی گہری اور اداس آنکھوں والی لڑکی کا خیال آیا ہو جو بنجر زمینوں پر شادابیوں کی امید لگائے بیٹھی تھی۔

اپنی موجودہ پوزیشن پر جہانگیر مطمئن ہو گئے۔ مگر اب ان کا اونچا معیارِ زندگی دیکھ کر کئی اچھے اچھے گھرانوں کی دوشیزاؤں کے رشتے آنے لگے۔ سینکڑوں لڑکیاں ایک نظر دیکھ کر بے دلی سے ناپسند قرار دے دی گئیں۔ اگر کوئی لڑکی پسند بھی آئی اور اس میں ہر چیز قابلِ تعریف ہوئی بھی تو جہانگیر قدر نے صرف اس لئے اسے ناپسند کیا کہ اس کی ناک نامناسب حد تک چھوٹی تھی یا کسی کا چھوٹا قد اس کی شخصیت کی خرابی بن گیا۔

گو جہانگیر کا اپنا کوئی رشتہ دار حیات نہ تھا مگر جتنے بھی ملنے جلنے والے اور دوست احباب تھے۔ وہ جہانگیر کے لئے بیوی ڈھونڈنے میں کوشاں تھے۔ اپنے شہر میں اور پھر دوسرے شہروں میں ہرکارے دوڑائے گئے۔ تصویریں منگوائی گئیں۔ لڑکی دیکھنے کے لئے گرمیوں میں پہاڑی مقام پر ٹھہرنے کا بندوبست ہوا۔ ایک سے ایک بڑھ کر فیشن ایبل شوخ و شنگ اور اعلیٰ گھرانوں کے فوجی، سول آفیسروں کی صاحبزادیاں دکھائی گئیں۔ تقریبات منعقد ہوئیں۔ دوست احباب پارٹی کے بعد پھر ملتے ہی پوچھتے:۔

"بھائی صاحب! کیا خیال ہے۔ پسند آئی کوئی؟"

"نہیں یار! جانے دو مجھے کوئی پسند نہیں آئی۔ تم نہیں سمجھ سکتے میری پسند کس قسم کی ہے"

ایک دوست تنگ آ کر بولے۔ "یہ صاحب اتنے سال لندن کی فضاؤں میں مغربی تتلیاں دیکھ آئے ہیں۔ اب انہیں یہاں کی سانولی سلونی تنگ ذہن لڑکیاں کیوں بھانے لگیں"

دوسرے دوست نے مداخلت کی۔ "پھر کہو تو ہاں تو کسی سے ملا دیں، گارنٹی ہے"

"اگر وہاں کوئی پسند ہوتی تو شادی کے لئے تمہارے اجازت نامے کی ضرورت نہ تھی۔"

"میرے یار! شفانہ ہو۔ میں نے تو مذاق کیا تھا۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تمہاری پسند بہت اونچی ہے۔ اور اچھی چیزیں برسوں کے الٹ پھیر کے بعد پیدا ہوتی ہیں۔ مجھے یقین ہے ایک دن وہ شہزادی تمہیں مل ہی جائے گی جس کی تمہیں تلاش ہے اور ہم تمہاری تلاش میں تمہارے ساتھ ہیں۔"

جہانگیر کو سنجیدہ دیکھ کر رحمان کو بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

"ایک دفعہ پھر سن لو مجھے ایسی لڑکی چاہیے۔ جو بے حد خوبصورت ہو۔ پہلی نظر ہی بھا جائے۔ پُرکشش، متناسب جسم قد بہت لمبا نہ بہت چھوٹا، پانچ فٹ چار اور چھ انچ کے درمیان ہو۔ چہرے کے نقوش دلکش ہوں۔ آنکھیں ہرنی جیسی خوبصورت، ناک بھی ستواں ہو، پیشانی فراخ، بال لمبے اور سیاہ ہوں۔ تعلیم بی اے سے کم نہ ہو۔ اچھے خاندان اور باذوق گھرانے کی ہو۔ سلیقہ شعار اور آرٹسٹک ذوق کی ہو۔ خوبصورت چیزوں کی داد دینے اور بدصورتی سے میری طرح نفرت کرتی ہو۔ تو کیا کہنے ۔۔۔ ایسی لڑکی ملی تو شادی کروں گا ورنہ ہو سکتا ہے ساری عمر تلاش میں ہی گزر جائے۔"

رحمان نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "کیا حسین لڑکی کا سراپا کھینچا ہے ۔۔۔ یہ تمہارا آئیڈیل ہے اور خدا کرے اس تلاش میں ہم تمہارا ساتھ دیں۔"

موسم گرما کے کئی دن دوستوں کے ہمراہ لڑکی کی دلچسپ تلاش میں گزر گئے۔ جہانگیر کے کئی دوستوں کا خیال تھا کہ مانا وہ خود لاکھوں میں ایک ہے۔ ذہین، تعلیم یافتہ، خوبرو، آئیڈیل نوجوان ہے۔ مگر جیسی لڑکی وہ چاہتا ہے وہ تو خوابوں میں ملے گی۔ شاید وہ پسند کو بہانہ بنا کر شادی ہی نہیں کرنا چاہتا۔

گرمی کے دو موسم یونہی مایوسی میں گزر گئے۔ جہانگیر پُرامید تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ لڑکی کسی نہ کسی موڑ یا راہگزر پر کسی تقریب میں اسے نظر آجائے گی۔

کئی دوست تنگ آ کر ساتھ چھوڑ گئے۔ ایک دوست رضوان رہ گیا تھا۔ جو اس کے آئیڈیل

کی تلاش میں اس کے ساتھ تھا۔ جس جگہ جہانگیر نے بنگلہ لے رکھا تھا۔ اس کے ارد گرد کئی خاندان موسم گرما گزارنے کے لئے مقیم تھے۔ ان میں سے کئی آزاد خیال اور سوشل لڑکیوں نے مختلف بہانوں سے جہانگیر کی قیام گاہ کا طواف کیا۔ اس سے دل چسپی لینا چاہی۔ ایک محترمہ جو سامنے کے بنگلے میں اپنی امی اور ابو کے ساتھ مقیم تھی۔ اس نے ایک طویل خط جہانگیر کے نام لکھا اور نوکر کو دے دیا۔ جب کئی دن تک کوئی حوصلہ افزا جواب نہ آیا تو وہ خود ملنے آئی۔

نجمی بڑی معمولی سی صورت کی عام سی چھوٹے قد کی لڑکی تھی۔ برآمدے میں جہانگیر کے دوست رضوان نے روک لیا۔

"کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"جہانگیر سے!" وہ قدرے شرمائی۔

"غالباً خط بھی آپ نے لکھا تھا؟"

"جی ہاں!"

"آنسہ نجمی! محبت ون وے ٹریفک نہیں کہ دوسری سڑک نہ ہونے پر گزارا ہو جائے۔ آپ ذہین لڑکی ہیں۔ کہیں اور قسمت آزمائیے۔ جہانگیر کا دل تو وہ پتھر ہے جس میں جونک نہیں لگ سکتی۔ آپ کو میرا مخلصانہ مشورہ یہی ہے۔"

نجمی سوگوار سا چہرہ لے کر چلی گئی تو رضوان جہانگیر کے پاس آیا۔

"تمہاری ایک پرستار آئی تھی۔ میں نے اسے لوٹا دیا ہے۔ وہ تم سے ملنے پر بضد تھی۔"

"وہی خط والی محترمہ تو نہیں تھی؟"

"ہاں، وہی تھی!"

"اچھا کیا ہے۔ مجھے نفرت ہے کہ محبت میں لڑکیاں پیش قدمی کریں۔ میں حقیقی حسن چاہتا ہوں۔ جس میں یہ بناوٹیں، سنگھار، فیشن نہ ہو۔ جس کا آج کل میں سامنا کر رہا ہوں۔"

"میرا خیال ہے تم ناحق کسی کمپلیکس کا شکار ہو گئے ہو۔ آخر دنیا میں لوگ، لڑکیاں سامنے

بھی کرتے ہیں۔ شادیاں بھی ہوتی ہیں۔ مگر تم نے ایک ہزار ایک لڑکیاں تو دیکھ لی ہوں گی۔"

"رضوان! میں تمہیں بتا چکا ہوں جسے میرا دل قبول نہ کرے میں اسے زندگی کا ساتھی نہیں بنا سکتا۔ میں خاندان اور برادری کے بندھن سے آزاد ہوں۔ کوئی مجبوری میری راہ میں حائل نہیں۔ پھر میں اپنے دل کو کیوں جبر کر کے کسی کو پسند کروں۔ یہ لڑکیاں جنہیں اب تک دیکھنے کا موقع ملا ہے یہ مجھے انسان کم اور دولت مند آدمی زیادہ سمجھتی ہیں جو ان کی ہر فرمائش پوری کرے۔ انہیں کوٹھی کار اور نوکر چاکر فراہم کرے مگر میں اس لڑکی کی تلاش میں ہوں۔ جو صرف میرے لئے مجھے پسند کرے وہ ان سب آسائشوں اور میرے عہدے کی وجہ سے میری بیوی نہ بنے۔"

"آ گئے نا پھر اسی مثالی لڑکی پر جسے خدا نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ اچھا اس ڈپٹی سی کی صاحبزادی لالہ رخ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ میں سمجھتا ہوں وہ ایک مثالی لڑکی ہے۔"

"بہت خوب، چاہئے تو یہ تھا کہ میں اس کا معیار پوچھوں، مگر اس نے بڑے آمرانہ انداز سے میرا انٹرویو لیا۔ جیسے میں نوکری کے لئے آیا ہوں۔ انتہا درجے کی چالاک اور تیز لڑکی اس کے اتنے لمبے لمبے ناخن دیکھ کر مجھے تو اس سے خوف آنے لگا تھا اور جس رفتار سے وہ انگلش بول رہی تھی۔ لگتا تھا، کسی مقابلے میں آئی ہے۔"

رضوان اٹھتے ہوئے بولا۔ "اچھا صاحب! ریزولوشن یہ پاس ہوا کہ فی الحال کوئی لڑکی پسند نہیں آئی۔ تلاش جاری رکھی جائے۔ کل کوئی نیا پروگرام بنائیں گے۔ اس وقت تک کے لئے رضوان صاحب کو اجازت دیجئے۔ خدا حافظ!"

اگلے دن رضوان جہانگیر کے پاس پہنچا تو اسے کسی گہری سوچ میں کھوئے ہوئے دیکھ کر بولا:

"خیریت تو ہے؟"

"ہاں بھائی! ٹھیک ہوں۔ بس ایک الجھن میں گرفتار ہوں۔ تم سے کہنے کا موقع نہ مل سکا کہ پہلے تو ایک خیال تھا مگر اب یہ ایک OBSESSION سا بن گیا ہے۔ مہینہ بھر پہلے میں نے ایک لڑکی دیکھی تھی۔ ایسا باکمال اور لاجواب حسن جس میں نہایت درجے کی سادگی تھی۔ پوری تقریب میں

وہ کہکشاں کی طرح روشن تھی۔ بہت کم بولتی اور بہت آہستہ گفتگو کرتی تھی۔ اس کی زبان نہ اردو تھی نہ انگریزی۔ وہ نہ پاکستانی لگتی تھی نہ یورپی۔ اس شام ترکیہ سفارت خانے کی طرف سے دیئے گئے عشائیہ میں ہیں بھی مدعو تھا۔ اس تقریب میں وہ بیگمات اور وہ لڑکی بھی شامل تھی۔ سفید شفون کی ساڑھی پر سیاہ موتیوں کا کام کیا ہوا تھا۔ وہ اس لباس کی بھی عادی نہیں لگتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا مارے شوق اور محبت کے اس نے یہ لباس پہنا ہو۔"

"ہوگی کوئی انگریز کی بچی۔" رضوان کو اس کی شاعری نہ بھائی۔ "مجھے پہلے ہی پتہ تھا۔"

"ہرگز نہیں۔ اس میں مشرقیت کی جھلک تھی۔"

"یار! تم کیا جانو آج کل مشرقی لڑکیوں پر مغربی رنگ چڑھا ہوا ہے اور مغربی لڑکیاں مشرقی غازہ ملنے کی فکر میں ہیں۔"

"مجھے اس سے غرض نہیں کہ جو کچھ تم کہو وہ غلط ہو۔ وہ لڑکی انگریز ہرگز نہیں تھی۔ تمہیں اس کا پتہ کرنا ہوگا۔"

"فرض کیجئے میں اپنی کوشش سے اس حسین مہ جبین کا پتہ تو کر لوں۔ مگر ہو سکتا ہے ان محترمہ کی کہیں اور بات طے ہو چکی ہو۔"

"رضوان! میں تمہیں مار بیٹھوں گا۔ تم اپنی بے تکی ضرور ہانکو گے۔ اب جلدی سے اس لڑکی کی خبر لاؤ کہیں سے۔"

"کاش! اپنے پاس اللہ دین کا چراغ ہوتا اور ہیں سے کہتے لڑکی حاضر کی جائے مگر اب چراغ حسن کا فرض اس ناچیز کے سر آپڑا ہے۔ سو میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔"

"ابھی سے چلے۔ بیٹھو کھانا کھا کر جانا۔"

"اب تو بھابی کے ہاتھ کا کھانا کھانے میں مزا ہے۔ اجازت ہی دیجئے۔ خدا حافظ! کوشش کروں گا اور کابل آدمی دعا تم کرنا۔"

کئی دن تک جہانگیر کو اپنے ذاتی اور آفس کے کاموں میں مصروف رہنا پڑا مگر اتنی مصروفیت

کے باوجود بھی انہیں ہر لمحہ رضوان کی آمد کا انتظار رہا۔ رضو ہی ایک تو ایک اچھی خبر لانے والا تھا اور وہ انہیں سالوں سے اپنی پسند کی لڑکی کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ اب ان کا جی چاہتا تھا جلدی سے وہ لڑکی مل جائے تو وہ دونوں میں اپنا ویران گھر آباد کریں۔

دو تین دن گزر گئے۔ جہانگیر کو غصہ آرہا تھا کہ رضوان کو اگر اس لڑکی کی تلاش میں کامیابی نہیں ہوئی تو کم از کم ٹیلی فون پر ہی کچھ اطلاع دی ہوتی۔

چوتھے دن جہانگیر جب آفس جانے کی تیاری کر رہے تھے، صبح ہی صبح وہ آدھمکا۔ عجیب حلیے میں بال بکھرے ہوئے۔ مگر چہرے پر خوشی کی تحریر۔

"ہمیشہ بے وقت نمودار ہوتے ہو تم۔"

"کہئے تو اپوائنٹمنٹ (APPOINTMENT) کرنے کے بعد تشریف لاؤں۔ اچھا میں چلوں۔ خدا حافظ!"

وہ سچ مچ اٹھ کر چلنے لگا تو جہانگیر نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"کیسے واہیات شخص سے پالا پڑا ہے۔ میاں تمہارے انتظار میں تو دن گزارنے مشکل ہو گئے تھے۔"

"سو فیصدی جھوٹ۔۔ انتظار اس گل بانو کا ہے جس کی خبر لانے کے لئے میں سرگرداں رہا ہوں، اب بے تابی ظاہر ہوئی ہے۔"

"اب کچھ کہو گے بھی یا یونہی سر کھاؤ گے۔ مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔"

"سب پتہ کر آیا ہوں یعنی ہمالیہ کی چوٹی سر کر آیا ہوں۔"

"اس فنکشن میں صرف وہی ایک لڑکی درشہوار درانی تھی۔ سلسلہ نسب نادر شاہ سے جا ملتا ہے۔ ماں کی طرف سے چنگیز خان فیملی سے ہے۔ ممکن ہے اتنے عرصے کے بعد اب ان محترمہ میں جنگجوئی اور خونخواری کی بجائے طبیعت میں سادگی اور نرمی آچکی ہو۔ واللہ علم بالصواب۔ درشہوار ایران کے بہت بڑے تاجر کی اکلوتی بیٹی ہے۔ ارسلان صاحب نوجوانی میں ہندوستان آئے۔ یہاں ایک پنجابی خاتون سے شادی کر لی اور یہیں کے ہو رہے۔"

"رضوان! میں سوچتا ہوں، میرا آگے پیچھے کوئی رشتہ دار نہیں۔ اب ارسلان صاحب کے سامنے خود ہی عرضداشت بن کر جانا پڑے گا۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ چلو گے نا؟"

"چلوں گا کیوں نہیں!"

"اچھا شام کو چار بجے ہم ارسلان صاحب سے ملنے جائیں گے، دیکھئے کیا ہوتا ہے۔"

دفتر میں جہانگیر عموماً چار بجے تک کام کرتے۔ بزنس ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے ان کی بڑی ذمہ داریاں تھیں۔ آج چار کی بجائے وہ تین بجے ہی گھر آ گئے۔

ساڑھے تین بجے رضوان آیا۔ منہ ہاتھ دھلا ہوا۔ بال سلیقے سے سنورے ہوئے۔ جہانگیر پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ رضوان آیا تو جہانگیر نے اپنی نیلی کونسل نکالی۔ رضوان نے دوسری سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مژدہ سنایا:

"میں نے صبح نو بجے ارسلان صاحب سے ملاقات کا وقت مقرر کر لیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔ ساڑھے چار بجے وہ فری ہوں گے۔ میں نے بتایا، میں جہانگیر کا سیکرٹری بول رہا ہوں۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ میں ذاتی طور پر بغیر وقت لیے کسی سے ملنا اچھا نہیں سمجھتا۔"

"جہانگیر صاحب! اور سب کچھ تو ٹھیک ہے۔ اگر آپ کی ہونے والی بیگم کی پہلے ہی کہیں منگنی ہو چکی ہوگی تو؟"

"رضوان! جی تو چاہتا ہے۔ تمہیں خوب پیٹوں۔ ہر قدم پر تمہیں ایک نیا اندیشہ گھیر لیتا ہے میرا دل کہتا ہے۔ ارسلان صاحب نے اپنی بیٹی کی ابھی کہیں بات طے نہیں کی۔"

"نفسیات میں اسے WISHFUL THINKING کہتے ہیں۔ بہرکیف میاں یہ تو مجھے بتاؤ کہ مہینہ بھر پہلے جب آپ نے درشہوار کو دیکھا اور اسے پسند کر لیا تو اس سے تمہاری گفت وشنید کیوں نہ ہوئی؟"

"یہ معاملات اتنی تیزی سے طے ہوگئے ہیں کہ سوچنے سمجھنے کی مہلت نہیں ملی۔ اس دن فنکشن میں کافی لوگ تھے۔ وہ اکیلی لڑکی تھی۔ میں اس سے بات چیت کرتا تو شاید اس کے والد صاحب

اس بات کو پسند نہ کرتے ۔"

جہانگیر بڑی احتیاط سے مال روڈ پر گاڑی چلا رہے تھے ۔ لارنس روڈ پر مطلوبہ کوٹھی کے پاس پہنچے تو دربان نے گیٹ کھول دیا ۔

کار پورٹیکو میں پارک کرنے کے بعد جہانگیر نے کال بیل پر انگلی رکھی ۔

ایک نوکر نے ڈرائنگ روم تک ان دونوں کی رہنمائی کی ۔ "تشریف رکھیے ۔ میں ارسلان صاحب کو اطلاع دیتا ہوں ۔" جہانگیر نے اپنا تعارفی کارڈ اسے دے دیا ۔

ابھی جہانگیر اور رضوان قیمتی قالینوں، خوبصورت دیواروں پہ آویزاں پینٹنگ اور رنگوں کے حسین امتزاج اور اس گھر کے مکینوں کی بلند ذوقی کی داد ہی دے رہے تھے کہ ارسلان درانی آ پہنچے وہ پینتالیس پچاس سالہ صحت مند خوش مزاج اور ذہین انسان تھے ۔

"اسلام علیکم ۔" جہانگیر کے ساتھ رضوان بھی صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا ۔ دونوں نے باری باری مصافحہ کرتے ہوئے اپنا تعارف کرایا ۔

"مجھے جہانگیر کہتے ہیں ۔ دو سال قبل میں نے لندن سے سی اے کیا ہے ۔"

ارسلان صاحب نے شوخی سے کہا ۔ "کوئی شادی وغیرہ نہیں کی وہاں ۔"

"ابھی نہیں یورپ میں میرا شادی کرنے کا ارادہ ہی نہیں تھا ۔ میں سمجھتا ہوں یورپ دلکش جگہ ہے مگر ہمارے یہاں کا کلچر، مذہب اور مذاق وہاں سے کافی مختلف ہے جو لوگ وہاں شادی کرتے ہیں ۔ وہاں کے ماحول سے ان کی مفاہمت نہیں ہو سکتی ۔"

"مجھے ارسلان درانی کہتے ہیں ۔ زندگی کا زیادہ عرصہ ایران میں گزرا ہے ۔ میں ہندوستان میں قالینوں کی درآمد کرتا تھا ۔ میری ایک ہی بچی ہے ۔ اسے اپنی والدہ کا وطن اتنا پسند ہے کہ میں مستقل طور پر یہاں آباد ہو گیا ہوں اور اب تو اس شہر سے خاصی وابستگی ہو گئی ہے ۔"

رضوان نے بات بڑھائی ۔ "مہینہ بھر پہلے آپ کو ترکیہ سفارت خانے کے ایک ثقافتی پروگرام میں دیکھا تھا ۔ تبھی سے آپ کی فیملی سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا تھا ۔"

"ہاں اس پروگرام میں میری بیٹی میرے ساتھ تھی۔ اپنی بیوی کی وفات کے بعد میں درشہوار کو اپنے ہمراہ ہر پروگرام، فنکشن وغیرہ میں لے جاتا ہوں، اس طرح اس کا دل بھی لگا رہتا ہے اور مجھے بھی تسلی رہتی ہے۔"

ملازم نے ڈائننگ روم میں چائے لگا دیئے جانے کی خبر دی۔

"اتنی باتیں وہیں ہوں گی۔" ارسلان صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

چائے کی میز پر ہر قسم کی نمکین اور میٹھی چیزیں سلیقے سے سجی تھیں۔ ارسلان صاحب نے نوکر سے کہا۔

"درشہوار سے کہو۔ تصویر مکمل ہو چکی ہو تو آجائے۔"

ملازم گیا تو ارسلان بتانے لگے "میری بیٹی کو تصویریں بنانے کا جنون ہے۔ میرے اکثر دوست، احباب آتے ہیں۔ پہلے وہ سب سے ملنے کی مشتاق ہوا کرتی تھی۔ مگر اب کچھ سالوں سے شاذونادر ہی کسی کے سامنے آتی ہے جب تک کہ میں نہ بلاؤں۔ پچھلے سال ماشاءاللہ بی اے کیا ہے اور یونیورسٹی میں اس کی دوسری پوزیشن آئی تھی۔"

اتنے میں سفید ساڑھی میں پھیلی ستارہ سحری کی طرح جگمگاتی، لبوں پر نرم سی مسکراہٹ لیے حسن کے بھرپور احساس کے ساتھ وہ آگئی۔

ارسلان صاحب نے تعارف کرایا۔ "میری بیٹی درشہوار —— اور یہ جہانگیر قدر انہوں نے ہمیں تزکیہ کانفرنس میں دیکھا تھا۔ یہ رضوان احمر۔"

"آداب —— بڑی خوشی ہوئی آپ لوگوں سے مل کر۔" وہ بولی۔

"بیٹی! چائے تو بنا دو۔"

درشہوار کے ہاتھ تو چائے بنا رہے تھے۔ مگر ذہنی طور پر وہ کہیں پہنچ گئی تھی۔ تزکیہ کانفرنس والی پارٹی وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ جہانگیر ان سینکڑوں لوگوں میں سب سے وجیہہ اور ذہین شخص لگا تھا۔ ایسا شخص جو صرف کہانیوں کا کردار تھا۔ گو جہانگیر سے اس کی براہِ راست بات نہ ہو سکی تھی۔ مگر کئی بار اس نے اس اجنبی نوجوان کی طرف دیکھا تھا۔

آنے کو ورشہ ہوا اور پارٹی سے آ گئی۔ مگر اس کی سہیلی ناہید اس کی خاموشی اور اداسی کا سبب پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"وہ انسان عام آدمیوں سے کتنا مختلف تھا۔ مجھے صرف اس کا نام معلوم ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ اس شہر کا رہنے والا تھا یا کہیں اور سے آیا تھا۔"

"ایسے اجنبیوں سے بھی کوئی دل لگاتا ہے۔ تم تو پگلی ہو۔ اب بھول جاؤ اسے۔"

"نہیں ناہید! وہ بھول جانے والا شخص نہیں۔ تم کسی ترکیب سے اُسے ڈھونڈنے کی کوشش کرو۔"

"گویا کوئی ہیرا موتی کھو گیا ہے جو ڈھونڈنے کا جتن کروں۔ اگر کوئی شخص اتنا ہی اچھا لگا تھا۔ تو اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا تھیں۔"

"تم نہیں سمجھو گی۔ ابا جانی میرے ساتھ تھے اور پھر اکبر کے بے شمار دوست بھی وہاں موجود تھے۔"

"تو فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔"

"تم جہانگیر کے بارے میں پتہ کراؤ وہ کون تھا اور کہاں رہتا ہے۔"

پھر ناہید نے اپنی سہیلی کی خاطر اپنے بھیا سے جہانگیر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی درخواست کی۔

جب بیشتر باتوں کا پتہ چل گیا۔ تو دونوں لڑکیاں متفکر چہرے لے کر بیٹھ گئیں۔

"ناہید! بات کچھ نہیں بنی۔ انہیں بلانے کا مسئلہ تشویش ناک ہے۔"

اسی طرح کئی دن یہ سوچنے میں گزر گئے کہ جہانگیر سے ملاقات کیسے ہو۔ اس بات کو مہینہ تو ہو گیا تھا۔ مگر آج بالکل اچانک ہی اس شہزادے کو اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں ابا بھائی کے ساتھ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ اس کا جی چاہا ہنستی جائے یا پھر دوڑ کر ناہید کے گلے میں بانہیں ڈال دے اور کہے مجھے برسوں سے جس کا انتظار تھا وہ خود ہی آ گیا۔

"میری بیٹی فرصت کے وقت تصویر کشی کرتی ہے۔ اس کمرے کی اکثر سینریاں درشہوار کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہیں۔"

چائے پینے کے دوران ارسلان صاحب کھانے کی مختلف چیزیں جہانگیر کو پیش کرتے رہے۔ وہ شکریے کے ساتھ ہر چیز چکھتا رہا۔

"کیا آپ ایک ہماری تصویر نہیں بنا دیں گی؟" جہانگیر نے گویا بڑی جرأت سے کام لیا۔

"آپ تو خود تصویر ہیں۔" ارے یہ میں نے کیا کہہ دیا۔ وہ خود پریشان ہو گئی۔

مگر جہانگیر زیر لب مسکرا دیا۔ غنیمت ہے ارسلان صاحب اس دوران رضوان سے اون کے چڑھتے بھاؤ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

اس قدر مفاہمت اور دوستی کی فضا میں جہانگیر کا جی تو چاہا پہلی بار ہی دل کا مدعا کہہ دے۔ مگر رضوان نے مشورہ دیا۔ "اگلی ملاقات پہ بات کی جا سکتی ہے۔"

اس وقت چھ بجے تھے جب جہانگیر اور رضوان جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ ارسلان کے ساتھ درشہوار بھی ان کے ساتھ باہر تک آئی۔

برآمدے میں پہنچ کر جہانگیر بولا۔ "میری خواہش ہے کہ اگلی اتوار کو آپ اور خاتون درشہوار میرے یہاں تشریف لائیں۔ مجھے اس سے بہت خوشی ہوگی۔"

"کیوں بیٹی! تمہارا کوئی اور پروگرام تو نہیں اتوار کو۔"

"نہیں ابا جانی میں تو فارغ ہوں۔" درشہوار کی اس بات نے جہانگیر کو بڑا حوصلہ دیا۔

"اچھا۔ خدا حافظ!"

جہانگیر نے کار سٹارٹ کی تو درشہوار اپنے ابو کے ساتھ اندر آگئی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ رات کے کھانے پر آغا جانی نے خود ہی بات شروع کی۔

"بیٹی! تمہاری نگاہوں نے جہانگیر کو کیسا آدمی پایا؟"

"اتنی جلدی تو آدمی کسی کے بارے میں حتمی بات نہیں کہہ سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ باتوں اور اخلاق و آداب کے لحاظ سے جہانگیر بہت نفیس آدمی لگتے ہیں۔ ترکیہ کانفرنس والی پارٹی میں میں نے دیکھا کہ ان کا سلوک بڑا منصفانہ اور قابلِ قبول تھا۔"

"کسی شخص کو سمجھنے کے لئے اس سے راہ و رسم بڑھائی جا سکتی ہے۔ اتوار کو ہم جہانگیر کے یہاں چلیں گے"

بظاہر تو درشہوار نے زیادہ شوق ظاہر نہیں کیا۔ مگر دل میں وہ بے تابی سے اس دن کی منتظر رہی جب ابا جانی کے ساتھ جہانگیر کے یہاں جائے گی۔ یہ چند دن گزارنے مشکل ہو گئے۔

اتوار کو ارسلان صاحب اور درشہوار تیار ہو کر تیسرے پہر جہانگیر کی وسیع و عریض کوٹھی میں پہنچ گئے ارسلان صاحب کی سفید ڈاج پورٹیکو میں رکی تو وہ جلدی سے باہر نکلا۔ رسمی سلام دعا کے بعد انہیں رضوان کے ساتھ اندر لایا۔ اس کا دل چاہتا تھا۔ گلابی ساڑھی میں لپٹی درشہوار کو دیکھتا جائے۔

"مجھے یقین تھا آپ ضرور آئیں گے۔"

"اگر نہ آتے تو؟" درشہوار کے انداز میں شرارت تھی۔

"جہانگیر! تم مائنڈ نہ کرنا شہوار کی طبیعت میں ذرا شوخی ہے۔ وعدہ جو کیا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ نہ آتے۔"

"آپ کے نہ آنے کی صورت میں میں سمجھتا کوئی ضروری کام آپڑا ہوگا۔" جہانگیر براہ راست درشہوار سے بولا۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد ملازم نے چائے کی تیاری کا مژدہ سنایا۔

جہانگیر چائے بنانے لگے تو درشہوار بولی۔ "لائیے میں بناتی ہوں"

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔ میں تو دل سے چاہتا تھا۔ یہ زحمت آپ کو دوں۔"

چائے کے ساتھ جہانگیر نے ہر قسم کی چیزیں تیار کروائی تھیں۔ چائے پینے کے دوران مختلف قسم کے موضوع پر باتیں ہوتی رہیں۔ چائے کے بعد جہانگیر نے ارسلان اور درشہوار کو اپنی کوٹھی کی سیر کرائی ابھی سیر سے نہیں پہنچا تھا۔ کوٹھی کی ایک ایک چیز اس کی بلند ذوقی کا آئینہ دار تھی۔ ڈرائنگ روم میں ہر چیز کا دوسری چیز کے ساتھ رنگوں کا حسین اشتراک تھا یا امتزاج۔

"آپ بڑے باذوق ہیں۔" درشہوار نے اس کی خوش ذوقی کی تعریف کی۔

"نوازش ہے آپ کی۔"

جہانگیر نے دیکھا کہ وہ سمجھی کہتا درشہوار بڑی توجہ اور دلچسپی سے اس کی بات سنتی۔ باغ میں اپنے شوق باغبانی کے بارے میں وہ بتا رہا تھا۔ مختلف قسم کے پودے، موسمی پھول اور بہترین پھلوں کے درخت دکھا رہا تھا۔

باغ کی سیر سے لوٹے تو ڈنر کھانے کی میز سجا جا چکا تھا۔

کھانے کے دوران بھی بڑے دوستانہ انداز میں باتیں ہوتی رہیں۔ جہانگیر نے دیکھا۔ درشہوار بڑی ذہین اور حاضر جواب خاتون ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں اس کے پاس کافی معلومات ہیں۔ اسی لئے سارے وقت میں کوئی لمحہ ایسا نہ آیا کہ تینوں میں سے کسی کو یہ سوچنے کا موقع ملے کہ اب کیا بات کی جائے۔

کھانا کھانے کے بعد ارسلان اور درشہوار جانے لگے تو وہ ایک دوسرے کے بارے میں کافی کچھ جان چکے تھے۔ ارسلان صاحب نے جہانگیر سے ملتے رہنے کا شوق ظاہر کیا۔

رضوان کے حوصلہ دلانے پر تیسری ملاقات میں جہانگیر نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ اور ارسلان صاحب نے جیسے دو ایک ملاقاتوں میں ہی جہانگیر کے بارے میں اچھی رائے قائم کر لی تھی۔ اس لئے بغیر کسی سوچ بچار کے انہوں نے ہاں کہہ دی۔ یہ تو انہوں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ درشہوار جہانگیر کا کتنا احترام کرتی ہے۔ وہ اس کی آنکھوں میں جہانگیر کے لئے پسندیدگی کی شمع جگمگاتی دیکھ چکے تھے۔

شادی کے لئے انہوں نے شرط رکھی کہ شادی بڑی سادگی سے ہو۔ البتہ اپنی طرف سے جہانگیر اپنے دوست احباب کو مدعو کر سکتا ہے۔

جہانگیر کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اپنے خوابوں کی تعبیر آتنی جلدی مل جائے گی۔ گذشتہ دو ڈھائی سالوں کے حسن کے مقابلوں میں شرکت کرنا کیسی مضحکہ خیز بات تھی جیسے فیشن شو ہو۔ ان چیزوں نے انہیں کس درجہ بیزار کر دیا تھا اور اب کتنی جلدی سب کچھ ہو گیا ـــــ کتنی تلاش کے بعد اپنے ذوق سے میل کھاتی درشہوار سے ان کی شادی ہو رہی تھی۔

پندرہ دن زیور اور کپڑوں کی خریداری میں لگ گئے۔ ہر چیز بڑی قیمتی اور شاندار تھی۔ وائیٹ گولڈ کا سیٹ انہوں نے خاص طور پہ تیار کروایا۔

رضوان بڑھ چڑھ کر اپنے دوست کی شادی میں کام کر رہا تھا۔ جہانگیر کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ عروسی لباس میں شہوار آسمانی حور لگ رہی تھی۔ درشہوار کو پا کر جہانگیر جیسے جنت میں پہنچ گئے دنیا جہاں کی مسرتیں جیسے ان کے گھر آ گئیں۔ نور درشہوار کے دل میں جہانگیر جیسے مثالی شوہر کے لئے انتہا درجے کی اپنائیت اور محبت تھی۔ وہ ہر ممکن کوشش سے اپنے شوہر کے آرام و آسائش کا خیال رکھتی۔ جہانگیر کی خوش ذوقی اور حسن پرستی کو وہ روز اول ہی جان گئی تھی۔ گھر کو وہ نئے نئے طریقوں سے ہفتہ پندرہ دن کے بعد آراستہ کر کے اپنے حسن ذوق کی داد لیتی۔

گھر کی ہر چیز جہانگیر کی بلند ذوقی اور حسن پسندی کی ترجمان تھی۔ آفس، کار، لباس، ہر چیز میں وہ خوبصورتی کے متلاشی تھے۔ جہانگیر جہاں کہیں جاتے درشہوار کو ساتھ لیکر جاتے۔ پکنک پارٹی سیر و تفریح جس محفل میں بھی چلے جاتے، ملنے والے ان کی پسند اور ذوق کی تعریف کرتے۔

شاید یہ خوشی تھی یا ماحول کی تبدیلی کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ درشہوار حسین تر ہوتی جا رہی تھی۔ جو بھی اس مثالی جوڑے کو دیکھتا، رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہی رہ جاتا۔

اب جہانگیر کو زندگی کی ہر راحت حاصل تھی۔ دولت، عزت، عہدہ، کوٹھی، کار، ذہانت، تعلیم اور لاکھوں میں ایک درشہوار۔

آغا ارسلان اگرچہ درشہوار کو بیاہ کر زندگی میں تنہا رہ گئے تھے۔ مگر ہفتے پندرہ دن بعد یا خود آ جاتے یا جاتے اور کھانے پہ بیٹی اور داماد کو بلا لیتے ـــــ اور یوں ملاقات ہو جاتی۔

جہانگیر کی شادی کو ایک سال ہو گیا تھا۔ مگر اب دوسری تمنا دل میں جگہ لے رہی تھی۔ آغا ارسلان اپنی بیٹی کو خوش و خرم دیکھ کر نہال تھے۔

جہانگیر قدر کو گمان ہونے لگا جیسے قدرت نے انہیں ہر چیز سے نوازنے کا عہد کر رکھا ہے۔ وہ سمجھتے تھے۔ تقدیر کی چھڑی ان کے ہاتھ میں ہے۔ ستارے ان کے غلام ہیں۔ فضائیں ان کے ماتحت ہیں۔ اسی لئے در شہوار جیسی نازنین ان کی بیوی ہے جو شکل و صورت کے علاوہ اخلاق کے لحاظ سے بھی بہترین عورت ہے۔

دوسرے سال کے آغاز میں در شہوار امید سے ہوئیں تو بچے کے تصور سے جہانگیر کی نگاہیں چمک اٹھیں۔ تیسرے مہینے انہوں نے در شہوار کو چھیڑنا شروع کر دیا۔

"شہوار! دو خوبصورتیاں مل کر ایک مثالی اور ابدی حسن کو جنم دیں گی۔ ہمارا بچہ کس درجہ حسین اور پیارا ہو گا۔ میں جب یہ سوچتا ہوں تو مجھے کس قدر مسرت ہوتی ہے۔ میرا دل دیوانہ سا ہو جاتا ہے۔"

در شہوار چھیڑنے کے انداز میں کہتی۔ "سنور والا! اگر دو خوبصورتیوں نے ایک خوب صورتی کو جنم نہ دیا تو؟"

جہانگیر نے فوراً اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "خدا نہ کرے سنور بیتا! میں جانتا ہوں حسن کی کھوج میں ہمیشہ تم نے میرا ساتھ دیا ہے اور اب مجھے ایک حسین اور پیارے بچے کی ضرورت ہے۔ ایسا بچہ جس میں ہم دونوں کی صورت اور خوابوں کا عکس جھلکتا ہو۔ جسے دیکھ کر ہماری روحیں جھوم اٹھیں۔ جب کبھی ہم حالات کے ہاتھوں تھک جائیں تو ہمارا بچہ ہمارے دلوں کے لئے امن و راحت کا پیامبر ثابت ہو۔"

"خدا کرے!" در شہوار نے صدق دل سے دعا مانگی۔

چھ ماہ تیزی سے بہت مصروفیت میں گزر گئے۔ جہانگیر نے ہر ممکن طریقے سے اپنی بیوی کے سکون و آرام کا خیال رکھا۔ کوئی پریشان کن خیال اس کے ذہن میں نہ آنے دیا۔ شام ہوتی تو وہ اسے شہر سے دور پورے چاندنی رات میں سیر کرانے لے جاتے اور نہر کے کنارے چہل قدمی کرتے۔

ہر گزرے دن کے ساتھ جہانگیر کی خوشی اور بے تابی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مگر در شہوار کے دل میں

اضطراب سا تھا۔ "جہانگیر! انجانے کیوں میرے دل میں بے چینی سی ہے جیسے میرا ہونے والا بچہ زندہ نہیں بچیگا۔

"بیگم! تم تو یونہی وہم کرتی ہو۔" جہانگیر نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ "اگر ہمارا بچہ صحت مند پیدا ہوا تو دنیا کی کوئی قوت اسے ہم سے نہیں چھین سکتی۔"

"جہانگیر ہر گزرتے دن کے ساتھ میرے دماغ میں ایک سرد سی لہر دوڑ جاتی ہے۔ میرے دل کی دھڑکن غیر معمولی طور پہ تیز ہو جاتی ہے اور میرے اندر ایک خوف چٹکیاں لینے لگتا ہے۔"

پھر ایک دن درشہوار کی پریشان خیالی پہ جہانگیر نے تسلی دی۔

"شہوار! کون ہے جو میرے بچے کا بال بھی بیکا کر سکے۔ میں تمہارے اور اس کے لئے روپیہ پانی کی طرح بہا دوں گا۔ میرا خیال ہے تمہارا خوف اور اضطراب اس وجہ سے ہے کہ یہ تمہاری زندگی کا پہلا تجربہ ہے۔ شاید تم بچے کی پیدائش کے تصور سے خوف زدہ ہو مگر اطمینان رکھو میرا ہر ایثار تمہارے لئے ہے۔"

لیڈی ڈاکٹر ہفتے میں دو بار باقاعدگی سے درشہوار کے میڈیکل چیک اپ کے لئے آتی اور بچے کی صحت مندی کے بارے میں اطمینان دلا دیتی۔

آخری دنوں میں درشہوار کو جسمانی اور ذہنی تکلیف کا سامنا تھا۔ مگر اس نے ہر ممکن صبر و ضبط سے کام لیا اور اندر کی تکلیف و کرب کی اپنے شوہر کو خبر نہ ہونے دی۔

شام کے اس لمحے درشہوار اپنے کمرے میں ریشمی تکیوں پہ سر رکھے لیٹی تھی۔ شام کی سنہری دھوپ بڑی بھلی رہی تھی۔ اوائل اکتوبر کے دن تھے۔ باغ میں ابھی تک موتیا کی کلیاں کھلی تھیں۔ تکلیف سے گھبرا کر درشہوار نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ صبح اس نے بال بھی نہیں سنوارے تھے۔ اس کی پریشان زلفیں مخملیں تکیے پر بے ترتیبی سے بکھری تھیں۔ جہانگیر نے آفس سے آ کر سب سے پہلے بیوی کا حال دریافت کیا۔ نوکرانی سے دن بھر کی خوراک۔ اور معمولات کا پوچھنے کے بعد جہانگیر خاموشی سے کمرے میں داخل ہوئے۔

درشہوار کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

"آپ کپڑے تو تبدیل کر آئیں۔ پھر اطمینان سے بیٹھیے گا۔"

"نہیں شہوار! جب تمہیں اضطراب ہو تو میں کیوں کر سکون سے بیٹھ سکتا ہوں۔ مجھے آج دفتر میں

بار بار تمہارا خیال آیا اور میں مستقبل کے پلان بناتا رہا۔ مجھے اس تصور سے کتنی خوشی ہوتی ہے کہ ہمارا بچہ کتنا خوبصورت ہوگا۔ ہم اپنے پیارے بچے کا نام بھی اتنا خوبصورت رکھیں گے۔ میں نے تو سوچ بھی لیا ہے کہ بیٹا ہوا تو اس کا نام رضوان قدر رکھیں گے۔"

"اگر بیٹی ہوئی تو اس کا نام رضوانہ قدر ہوگا۔"

"پہلا بیٹا ہو تو اچھا ہے۔"

"ہر بات آپ کے بس میں تو نہیں ہو سکتی۔ خدا ہمیں خوبصورت بچہ دے یا بدصورت۔ جو وہ چاہے کر سکتا ہے۔"

جہانگیر ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ "شہوار! تم جانتی ہو مجھے بدصورت لفظ سے ہی وحشت ہوتی ہے۔ تم اتنی حسین ہو۔ مجھ میں بھی کوئی خامی نہیں تو ہمارا بچہ بدصورت کیسے ہو سکتا ہے؟"

"اب میرے اور آپ کے خوبصورت یا مثالی ہونے پر ہی تو سب کچھ منحصر نہیں GENES بہت بڑا رول ادا کرتی ہیں۔ کون جانے میرے یا آپ کے دادا نانا میں سے کوئی بدصورت ہو اور وہ بدصورتی وراثت میں ہمارے بچے کا حصہ بن کر مل جائے۔ مینڈل کی تھیوری کے مطابق۔"

"سنو رہتا! اس حالت میں تمہیں اس قدر سائنٹیفک اور قنوطی نہیں ہونا چاہیے۔ تمہیں تو آج کل اچھے اچھے اور خوبصورت خواب دیکھنے چاہئیں۔ جن کا بچے کی صحت پر اچھا اثر پڑے مجھے جو بھی ہونے والے بچے کی بدصورتی کا خیال آتا ہے۔ میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ اگر حقیقت میں ایسا ہوا تو اس بدترین دن کو میں بدصورت بچے کا باپ کہلانے کی بجائے اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔ بدصورتی کے لئے میری دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ میری ساری نفرتیں بدصورتی کے لئے وقف ہیں۔"

"جہانگیر صاحب!" درشہوار ہسٹریائی انداز میں چلائیں۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ بچہ ہمارا ہوگا میرا ہوگا۔ ہم اس سے نفرت کریں۔ یہ نہیں ہو سکتا!"

"درشہوار! مجھے اس معاملے میں مجبور سمجھ کر معاف کر دو۔ نجانے کیوں جب بھی میں کسی گندی

میلی اور بدصورت چیز کو دیکھتا ہوں۔ میرے ہاتھ بے قابو ہو جاتے ہیں۔ جی چاہتا ہے اسے اٹھا کر توڑ دوں، دور پھینک دوں۔ دفن کر دوں جہاں اس کا نشان تک نہ ملے۔ مجھ سے بے ہودگی اور بدصورتی برداشت نہیں ہو سکتی۔"

"ارے آپ تو سنجیدہ ہو گئے۔ ہمارا بچہ بدصورت کیسے ہو سکتا ہے، یہ ممکن نہیں۔"

درشہوار نے بڑے حوصلہ مندانہ لہجے میں کہا تو جہانگیر کو یقین ہو گیا کہ درشہوار ان کے خیال سے متفق ہے۔ اس کی آنکھوں میں شب تاریک میں جگمگانے والے جگنوؤں کی روشنی دکھائی دی۔ ان کے تھکے تھکے انداز میں محبت اور بے ساختگی کا پرتو تھا۔ جب وہ بیوی کے چہرے پر تکلیف و کرب کی لکیریں دیکھتے تو ان کا جی چاہتا ہر ممکن تدبیر سے اس کی تکلیف میں کمی کر دیں۔ ایسے میں درشہوار کے پیازی ہونٹوں پر مونالیزا کی مسکراہٹ کھیلتی نظر آئی۔

"سینوریتا! میں بیٹا چاہتا ہوں گورا چٹا اور خوبصورت نقوش والا۔"

"ہوں آپ کی طرح!" درشہوار شوخی سے مسکرائی۔

"مگر تمہارے حسن پر کس کافر کو شک ہے؟" جہانگیر نے بیوی پر ناز کیا۔

بچے کی پیدائش سے چند دن پہلے جہانگیر نے ہسپتال میں ایک آرام دہ پرائیویٹ کمرہ بیوی کے لیے لے لیا۔ جہاں ہمہ وقت ڈاکٹر اور نرسیں اس کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ درشہوار کے ہسپتال آنے سے پہلے جہانگیر نے خوبصورت پردوں، نئے فرنیچر، فرشی قالین، مخملیں لحاف، سنبل کے گچھے ہر چیز میں حسن اور رنگوں کا دلکش امتزاج پیدا کروایا۔ ایک بڑے آدمی ہونے کی حیثیت سے ویسے بھی ہسپتال والے ان کی طرف متوجہ تھے۔ ہسپتال کے ڈاکٹر آذر جو ماہر فزیشن اور جہانگیر کے دوست تھے۔ انہوں نے تو خاص طور پر بیگم جہانگیر کی دیکھ بھال کا یقین دلایا۔ ہسپتال میں سب سے زیادہ جہانگیر کو اس شخص پر اعتماد تھا۔ اپنے آفس سے جہانگیر نے دو دن کی چھٹی لے لی۔ خوشی کے اس لمحے کا انہیں جیسے عرصے سے انتظار تھا۔

یہ خوشی ان تمام خوشیوں سے عجیب اور مختلف لگتی تھی۔ جنہیں وہ گزشتہ سالوں میں حاصل

کر چکے تھے۔ سیر و تفریح، ڈگریاں لینا، جائیداد کا ملنا، غیر ممالک جانا، کار خریدنا، خوبصورت بیوی کا ملنا
مگر ہاں یہ خوشی اپنی جگہ نیا تجربہ تھی۔

خدا خدا کر کے وہ دن آیا۔ مگر توقع کے خلاف ڈاکٹر آذر نے اطلاع دی کہ بچے کی پیدائش میں کچھ مشکل پیش آئے گی۔ بچے کی پوزیشن بدل گئی ہے۔ سرما کے اس موسم میں جہانگیر کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کی بوندیں چمک اٹھیں۔ اتنے میں سول سرجن منظر خان نے انہیں تسلی دی۔ ہم نے ماہر لیڈی ڈاکٹر GYNOCOLOGIST کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ ڈاکٹر آذر کی نگرانی میں کئی نرسوں نے ڈاکٹر کی مدد کی مگر تکلیف کی شدت سے درشہوار تو بے ہوش ہو گئیں۔ مگر لیبر روم میں بچے کی چیخ سنائی دی۔ ہر شخص بڑی خوبی سے اپنا فرض انجام دے رہا تھا۔

اس نازک لمحے جب موسم سرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ فضا بڑی خنک تھی۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ سسٹر رقیہ نازک سی صحت مند بچی کو اٹھا کر لے گئی۔ اس نے غور بھی نہ کیا کہ بچی کیسی شکل و صورت کی ہے۔ اسے تو اتنا ہی پتہ تھا بچی کو اس دنیا سے آب و گل میں آئے آدھا گھنٹہ ہی ہوا ہے اور اس کی ماں کو ہوش میں لانے کے سارے جتن کئے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر آذر اور کئی نرسوں کی تین گھنٹے کی سعی سے درشہوار کو ہوش آیا تو سسٹر نے خوشخبری دی۔
"آپ کے بیٹی پیدا ہوئی ہے۔"

جہانگیر تو بیٹا چاہتے تھے، خوبصورت گول مٹول سا۔ دماغ کی مشینری نے پھر کام شروع کر دیا۔
"وہ خوبصورت ہے نا؟" شدید کمزوری کے باوجود درشہوار کا دماغ بڑا ALERT تھا اور وہ یہ تسلی چاہتی تھی۔

اس عرصہ میں ہسپتال کے کئی ڈاکٹروں اور نرسوں کو جہانگیر اور بیگم جہانگیر کے معیار حسن اور نفاست کا احساس ہو چکا تھا۔ سسٹر رقیہ جو پچھلے چند دنوں سے بیگم جہانگیر کی خدمت پر معمور تھی۔ بول اٹھی "شاید!"

ایسی حالت میں سسٹر نے شاید کہہ کر بات ٹالی۔ ہر بات تفصیلاً بتا کر جہانگیر جیسے بڑے آدمی

حسین بیوی کی جان خطرے میں کون ڈالے "

ڈاکٹر آذر جہانگیر قدر کے قریبی دوست تھے۔ جیسے ہی سسٹر بچی کو تولیے میں لپیٹ کر لائی تو ڈاکٹر آذر کرسی پر او پنچے ہو گئے۔

"میں بچی کو دیکھ چکا تھا۔ اچھا کیا آپ اسے لے آئی ہیں"

سوئی ہوئی بچی کو سسٹر نے آرام دہ بستر پر ڈال دیا۔ اتنے میں قدموں میں آہٹ ہوئی۔

"ہیلو آذر صاحب! کیا نئی خبر ہے؟" جہانگیر نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

"خبر اچھی بھی ہو سکتی ہے بری بھی۔ یہ آدمی پر منحصر ہے"

"کیسی عجیب بات ہے" جہانگیر پریشانی سے کرسی پر بیٹھ گئے

"اگر خون بروقت نہ مل جاتا اور اتنے ڈاکٹر اور نرسیں اپنی فرض شناسی کا ثبوت نہ دیتے تو آپ کی بیگم کی جان خطرے میں تھی۔ خبر نمبر دو آپ کے گھر بچی پیدا ہوئی ہے"

اس مرتبہ ڈاکٹر آذر نے اپنے چہرے پر کوئی تاثر نہ آنے دیا۔

"بچی خوبصورت ہے نا۔ میں یہی چاہتا ہوں"

"جہانگیر صاحب! ضروری نہیں ہر بات انسان کی توقع کے مطابق ہو۔ آپ اپنی بچی دیکھ سکتے ہیں"

جہانگیر کو احساس بھی نہ ہوا کہ ان کی بچی اسی ہال کمرے میں پانچ چھ قدم کے فاصلے پر سو رہی ہے۔ وہ چند قدم آگے بڑھے بستر بڑا آرام دہ تھا۔ سائیڈ سے بچی کا گلابی فراک نظر آ رہا تھا بستر کے پاس پہنچ کر یک لخت وہ ٹھٹک کر رہ گئے۔ انہوں نے نظر بچی کو دیکھا۔

سسٹر رفیعہ ہال کمرے سے جا چکی تھی اس وسیع میں صرف جہانگیر، ڈاکٹر آذر اور وہ بچی موجود تھی۔

"اوہ میرے خدا اس درجہ بھیانک بچی۔ ڈاکٹر مذاق مت کرو۔ یہ میری بچی نہیں ہو سکتی۔ میں اسے اپنی بیٹی نہیں مان سکتا۔" جہانگیر چیخ پڑے۔

"آپ ہی کی بچی ہے۔ رنگ ذرا میلا ہے۔ ورنہ تو صحت مند اور گول مٹول ہے۔"

"کیا آپ نے اس کی منحوس صورت میری بیوی کو دکھا دی؟"

"نہیں اس وقت وہ بے ہوش تھیں۔ انہیں بچی کی خبر نہیں۔"

"گو آپ نے ورشہوار کو موت کے منہ سے بچا لیا ہے مگر میں سمجھتا ہوں ایسی خوفناک بچی دیکھ کر ان کی زندگی پھر خطرے میں پڑ جائے گی۔"

ڈاکٹر آذر کے دماغ پر جیسے کسی نے جلتی ہوئی سلاخ دے ماری۔ وہ تلخی سے بولے۔

"یہ بچی کب ڈائن تو نہیں جسے دیکھ کر بیگم جہانگیر بے ہوش ہو جائیں اور جہانگیر صاحب کا ذہنی توازن بگڑ جائے۔ میں اس خطرے کی پیشین گوئی نہیں کروں گا۔"

"ڈاکٹر! میں نصیحتیں سننے کا عادی نہیں۔" جہانگیر کے چہرے پر مرمر کی چٹانوں جیسی سختی آ گئی۔

"آپ نصیحتیں سننے کے عادی نہیں اور میرا پیشہ انسانوں کی زندگی بچانا اور ان کی نگہبانی کرنا ہے۔"

"آپ جذباتی بننے کی یا میرے خیالات اور نظریات میں لچک ڈھونڈنے کی کوشش نہ کریں۔"

جہانگیر کے لہجے میں انتہائی سرد مہری تھی۔ جیسے آذر دوست نہیں ان کا دشمن ہو۔

"ممکن ہے یہ لمحہ اس بات کا امتحان ہو کہ آپ میرے کس حد تک مخلص دوست ہیں"

"ممکن ہے یہ لمحہ اس بات کا امتحان ہو کہ میں اپنے پیشے کے ساتھ کتنا مخلص ہوں۔ یقین کرو تم دونوں کی محبت بچی کو خوبصورت بنا دے گی"

"آذر! مجھے ہمیشہ آپ کی دوستی پر اعتماد اور فخر رہا ہے۔ میں دیکھتا ہوں آپ دوستی کا لحاظ رکھتے ہیں یا اپنے پیشے سے وفا کا بھرم رکھتے ہیں"

"مجھے کانٹوں میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کیجئے۔ میں وہی کروں گا جس کی میرا ضمیر اجازت دے گا"

ڈاکٹر آذر کے چہرے پر اندرونی کرب کی سنجیدگی تھی۔

"آذر! آپ کے دل میں میرے لئے ہمدردی اور خلوص ہے تو اس بچی کا گلہ گھونٹ دیں، پھر اس کے کہ بہار کو کوئی اور آئے اور شہوار سے کہہ دیجئے کہ مردہ بچی پیدا ہوئی تھی"

"جہانگیر! جو کام کئی سفارشیں اور ہزاروں روپے کی رشوت نہ مجھ سے کروا سکی۔ اس کا تقاضا آپ کی دوستی کرتی ہے۔ کیا میں قاتل بنوں"

ایک ننھی سی جان کو بجھانا مشکل کام نہیں" جہانگیر نے سختی سے کہا۔

"ایک زندگی کو فنا کرنا میرے لئے آسان نہیں۔ پھر اس زندگی کو جو چند گھنٹے پہلے عالم وجود میں آئی ہو جو گناہ و ثواب کے تصور سے بھی نا واقف ہو۔ آپ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے کہ آپ اسے کس جرم میں تختہ دار پر چڑھاتے ہیں۔ مجھے اس کا قصور بتایئے جس کی سزا میں تجویز کر رہے ہیں"

"میں مولوی نہیں ہوں کہ گناہ و ثواب کے چکر میں پڑوں"

"کیا آپ کو شبہ ہے کہ آپ کی بیوی کا کسی اور سے تعلق رہا ہے؟"

"نہیں ڈاکٹر مجھے اپنی بیوی پر شبہ نہیں۔ یہ GENES کا مسئلہ ہے" جہانگیر بیزاری سے بولے

"جہانگیر آپ دولت اور حسن کے عشق میں انتہا پسند ہو گئے ہیں۔ یہ آپ کی زندگی کا پہلا واقعہ ہے مگر میں نے اس ہسپتال میں کئی بے شمار کیس دیکھے ہیں۔ جن میں والدین نے اپنے بچے کی شکل و صورت کو اہمیت نہیں دی۔ ان والدین کے احساسات کا تصور کرو جن کا آنگن بیس سال تک کسی بچے کی معصوم

ور تر زندگی کے لئے ترستا رہا۔ اور پھر بیس سال کے بعد بیوی کے ایک بچہ پیدا بھی ہوا تو مردہ — اور ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ اس کی بیوی کے یہاں اب مزید کوئی بچہ نہ ہو سکے گا۔ میں آج بھی ان میاں بیوی کے چہرے کے کرب انگیز تاثرات کا تصور کرتا ہوں تو میری روح کو جھرجھری آ جاتی ہے۔"

"ڈاکٹر! مجھے آپ کے ناصحانہ لیکچر سے کوئی سروکار نہیں۔ اس دارالمحن میں ہر روز نیا حادثہ رونما ہوتا ہے۔ مگر یاد رکھئے اگر آپ نے یہ بچی میری بیوی کے حوالے کی تو میں عمر بھر آپ کی صورت نہ دیکھوں گا۔ اس بچی کا زندہ رہنا میری بیوی کی پاکیزگی پر بہت بڑا دھبہ ہو گا۔ یہی بات نہیں اس بچی کا زندہ رہنا اور دنیا کے باسیوں سے محبت اور ہمدردی کی بھیک مانگنا۔ اس سے بھی زیادہ المناک ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ معاشرہ اس کریہہ المنظر بچی سے نفرت کرے گا۔ اس کے زندہ رہنے کا آخری دروازہ بھی بند کر دے گا۔ یہ پھول مانگے گی، خوشبوؤں کا تعاقب کرے گی اور لوگ اس کے گلے میں کانٹوں کی مالا پہنائیں گے۔ نفرت کا زہر دیں گے۔ اس بچی کی آج کی موت اسے عمر بھر کے روگ اور مصائب سے نجات دلا دے گی۔"

"جہانگیر! آپ کون ہوتے ہیں۔ ایک بچی کو آزمائشوں اور مصائب سے نجات دلانے والے؟"

"ڈاکٹر آذر! میں آپ کا مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔"

"بچی کو کھو کر پچھتائیں گے تو نہیں؟" ڈاکٹر کے لہجے میں تلخی تھی۔

جہانگیر تیزی سے بولے "ہرگز نہیں، قیامت تک نہیں۔ میں سمجھوں گا میرے دوست نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ ایک مستقل الجھن سے نجات دلا دی ہے۔"

ڈاکٹر آذر نے ایک لمحہ سوچ کر کہا۔ "اس گڑیا کے لئے مجھے کوئی نہ کوئی خالی جھولی مل جائے گی مگر۔"

"اگر مگر کچھ نہیں میں آپ سے اجازت چاہوں گا۔ پتھروں میں جونک لگانا بے کار ہوتا ہے۔ اچھا خدا حافظ!"

جہانگیر تیز تیز ڈگ بھرتے ہسپتال کے طویل برآمدے سے گزر گئے۔

ڈاکٹر آذر دیکھتے رہ گئے — جہانگیر کے قدموں میں کوئی لرزش پیدا نہ ہوئی۔ یوں جیسے نہ ہوئی

کے پھسل سے نازک بدن کو اپنے بھاری بوٹوں تلے کچل کر چلے گئے ہوں۔

بچی بے خبر سو رہی تھی۔ وہ کیا جانے کہ گناہ و ثواب کی منزلوں سے آشنا ہونے سے پہلے ہی اسے عذاب کے آتشیں شعلوں کی نذر کر دیا جائے گا۔ اسے ایسے ویران تنہائی کے قید خانے میں رکھا جائے گا۔ جہاں اس کی آوازیں قید خانے کی دیواروں سے ٹکرا کر اس کے اپنے سینے سے لپٹ کر رہ جائیں گی۔ ڈاکٹر آذر سوچ کی گہرائیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ لمحہ بھر پہلے ہونے والا واقعہ ان کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ خوابیدہ حالت میں وہ لاشعوری طور پر سوچ رہے تھے۔ تھکن سے ان کے اعصاب شل سے ہو گئے۔۔۔ کتنے ہی لمحے خاموشی سے گزر گئے اور بچی نے بھی کوئی آواز نہ نکالی۔

تھوڑی دیر بعد سسٹر رقیعہ نے انہیں کئی بار پکارا تو وہ چونک پڑے۔

"ڈاکٹر صاحب! بیگم جہانگیر اپنی بچی کو دیکھنا چاہتی ہیں۔"

ڈاکٹر کے ہونٹوں پر جیسے کونین کی تلخی آ گئی۔ "انہیں کہہ دو۔ بچی چند لمحے زندہ رہ کر اس دار فانی سے کوچ کر گئی تھی۔"

"یہ تو زندہ ہے۔" سسٹر بچی کے سانسوں کی رفتار گننے لگی۔

"اگر تھوڑی دیر پہلے میرے اور جہانگیر قدر کے درمیان ہونے والی گفتگو آپ سن سکتیں تو یہ بات نہ کہتیں۔ جہانگیر اور بیگم جہانگیر قدرت کی رعنائی کا حسین شاہکار ہیں اور یہ بچی بدصورت ہے۔"

"مگر یہ ان کی اپنی بچی ہے۔" سسٹر رقیعہ نے وقفے سے کہا۔

"حسن کے پجاری اور دولت مند لوگ ان رشتوں کو کچے دھاگے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ان لوگوں کے سینے میں گوشت کی بجائے مرمر کے دل ہیں۔ آج وہ خوبصورتیوں کے بطن سے یہ بدصورتی پیدا ہوئی ہے۔ اس میں بچی کا قصور نہیں۔ اصل مجرم بچی کے نانا دادا تھے۔ جن میں سے کوئی ایک شخص بدصورت تھا۔ پچاس سال کے بعد نسل در نسل وہ GENES اس بچی کا مقدر بن گئے۔"

"تو پھر اس لحاظ سے بچی کا تو کوئی قصور نہیں۔" رقیعہ ہمدردی سے بولی۔

"میں نے یہی بات جہانگیر کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مگر وہ بڑے آدمی ہیں۔ اب بیٹے

جمالیاتی ذوق کو صدمہ نہ پہنچانے کے لیے وہ اس بچی کی موت کے خواہاں ہیں۔ تم اس خاتون محترمہ سے کہہ دو۔ بچی مردہ خانے میں بھیج دی گئی ہے۔"

"بہت اچھا ڈاکٹر صاحب!"

سسٹر رفیعہ جانے لگی تو ڈاکٹر آذر نے یاد دلایا۔

"جتنی جلدی ہو سکے بیگم جہانگیر کو چلنے پھرنے کے قابل بنا کر ہسپتال سے رخصت کر دو۔ ان پتھریلے مجسموں کا بار بار سامنا کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ ان لوگوں کے بہیمانہ سلوک کے تصور سے میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ میں اب اپنے عمل یا زبان سے کسی بات کا اظہار نہیں کرنا چاہتا۔"

"میں سمجھ گئی۔"

سسٹر چلی گئی مگر ہسپتال کے ماحول میں سرِ شام ہی اندھیرا اتر آیا۔ یوں جیسے بچی کی قسمت پر بھی تاریکیاں چھا گئی ہوں — ڈاکٹر آذر کی ڈیوٹی چھ بجے ختم ہوئی تو وہ فوراً بازار گئے اور بچی کے لیے ایک قیمتی نرم و ملائم بے بی کمبل لے آئے۔ دل ہی دل میں ان کی ساری ہمدردی اور محبت اس کالی سی بے کشش بچی کے لیے وقف ہو گئی تھی۔

"کیا اتنی جلدی بھی کوئی بچہ اپنے والدین سے بچھڑ جاتا ہے؟" انہوں نے بچی کو کمبل میں لپیٹتے ہوئے خود سے سوال کیا — انہیں احساس ہوا جیسے بچی کانپ رہی ہے لرز رہی ہے۔ بے بسی سے سہمی جا رہی ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی ڈاکٹر آذر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ انہیں یاد آیا۔

دس دن پہلے ہسپتال کے جنرل وارڈ میں انتہا درجے کی غریب اور ادھیڑ عمر کی عورت لائی گئی تھی۔ ماضی میں شاید وہ خوبصورت عورت تھی۔ مگر اب چالیس سال کی عمر اور وقت کی گردشوں نے اس کے چہرے کی تازگی ملاحت اور حسن کو نچوڑ لیا تھا — اب وہ غریب سی کمزور عورت ہسپتال کے لیبر روم میں لائی گئی۔ جس کے ہونٹوں پر ان کہی التجا تھی۔ ڈاکٹر صاحب میرے شکستہ لباس پر نظر نہ ڈالیئے۔ میرا شوہر بہت غریب آدمی ہے۔ مگر اس کا دل بہت بڑا ہے۔ میں اور میرا شوہر بجھ کے رہ گئے۔ مگر اپنے سینوں میں بیس سال سے پلنے والی آرزو کو پروان چڑھائیں گے۔ یہ بچہ ہمارے

دلوں میں کھلنے والی خوشی کی کرن ہوگا۔ ہم اس بچے کو کھلائیں گے۔ صاف کپڑے پہنائیں گے۔ اسے پڑھنے کے لئے سکول بھیجیں گے اور اپنے سے بہتر زندگی دینے میں اس کی مدد کریں گے۔ یہ ہمارا خواب ہے۔ ہم اس کی تکمیل کریں گے۔

پیوند لگے کپڑوں والا شوہر اپنی عمر سے دس سال بڑا لگ رہا تھا۔ اس کے سانولے چہرے پر محنت کشی کی تحریریں تھیں۔ اس کے ہاتھوں میں مزدوروں والی سختی اور کھردرا پن تھا۔ اس کی بیوی بھی اگرچہ اونچی لمبی عورت تھی۔ مگر اس وقت تو وہ شدتِ تکلیف سے نڈھال تھی۔ مرد کے چہرے پر ایک بے بسی مگر امید کی تحریر تھی۔

نئی ڈیلیوری کے لئے نرس مستعد ہو گئی۔ مگر مرد نے اپنی جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال لیا۔ سامنے سے ڈاکٹر آذر تیز تیز قدموں سے آ رہے تھے۔ مرد جلدی سے ان کی طرف مڑا۔

"ڈاکٹر! میں قیمتی دوائیاں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ میری بیوی میرا سب کچھ ہے" اس نے مجرم کی طرح پانچ روپے کا نوٹ دبا کر مٹھی بھینچ لی۔ "یہ لے لیں مگر میری بیوی کا خیال رکھیں۔ ہم بدنصیب برسوں بعد اپنے ایک بچے کی صورت دیکھیں گے"

ڈاکٹر آذر نے پانچ روپے والا ہاتھ واپس کر دیا اور اسے تسلی دی کہ کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو ہسپتال والے مہیا کریں گے۔ "تم فکر نہ کرو"

کتنی حسرت تھی اس غریب مرد کے دل میں جیسے دنیا میں آنے والا بچہ اس کے دل کی ساری حسرتیں مٹا دے گا۔ اور یہ میاں بیوی کے دل کی آخری خواہش تھی۔ سینکڑوں مریضوں کا علاج کرنے والے ڈاکٹر آذر ایسے کرب انگیز احساسات کو اپنے دل کی گزرگاہ تک پہنچنے سے نہ روک سکے۔ بہتر خصوصی ہدایات اور مکمل دیکھ بھال کے باوجود اس غریب عورت کا بچہ پیدا ہوتے ہی مر گیا۔

"ڈاکٹر آذر! بچہ بے انتہا کمزور تھا۔ دورانِ حمل ماں کو پوری خوراک نہیں مل سکی" سسٹر نرگس نے جیسے تاسف سے کہا۔

ڈاکٹر آذر تھوڑی لمحہ بھر کے لیے تھک کر کرسی پر آرام کرتے بیٹھے تھے۔ ان کے سینے میں ٹک سے جیسے کوئی چیز ٹوٹ سی گئی۔ سینکڑوں آہوں اور سسکیوں کا دھواں ان کے ارد گرد پھیل گیا۔ فضا میں کلوروفارم، ایتھر، سپرٹ اور بے شمار دوائیوں کی بو رچی ہوئی تھی۔ یہ کیسی عجیب جگہ تھی جہاں وقت اور لمحوں کی قید سے آزاد زندگی اور موت کے فرشتے کچھ لینے، کچھ دینے کے لیے ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔

شوہر نے جب اپنے بچے کی موت کی خبر سنی تو اس کا دل اور چہرہ یوں بجھ گیا جیسے شعلوں پر پانی پڑ گیا ہو۔ وہ اپنے سینے کے اندرونی کرب کو چھپا گیا۔

ڈاکٹر آذر کا جی چاہا دوستانہ انداز میں اس آدمی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دیں۔ کسی مذہبی تنکے کا سہارا دیں۔ مرد نے اپنے مردہ بچے کو یوں ہاتھ لگایا۔ جیسے وہ چھوئی موئی کا پودہ ہو۔ جو ہاتھ لگتے ہی مرجھا گیا ہو۔ اس نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔

"الٰہی! تیرا شکر ہے۔ تو بڑا غنی اور بے نیاز ہے۔ ہمارے دلوں کی دعائیں سننے والا ہے۔ تیرا شکر ہے۔ گو بچہ نہیں رہا۔ مگر میری بیوی کی زندگی محفوظ ہے۔ تو ہمیں صبر و سکون دے!"

دعا مانگ کر وہ بڑے عزم و حوصلے سے ڈاکٹر آذر کی طرف یوں بڑھا جیسے وہ معمولی سا پھٹے پرانے کپڑوں والا آدمی نہیں کوئی آفاقی مخلوق ہو۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کی توجہ اور مہربانی کے لیے میں آپ کا بہت مشکور ہوں۔ اپنی قسمت میں اب تو کوئی بچہ نہیں لکھا۔ آپ اتنے بڑے ہسپتال کے ڈاکٹر ہیں۔ اگر کوئی لاوارث بچہ یا بچی آپ کو ملے تو ہم پہ مہربانی کیجیے گا۔ ہماری گلی میں بڑا اندھیرا ہے مگر ہمارا پتہ یاد رکھیے ہم آخری لمحوں تک آپ کی آمد کا انتظار کریں گے۔"

میں ضرور کوشش کروں گا" ڈاکٹر آذر نے کہا۔

دونوں میاں بیوی تھکے ہارے قدموں سے جا چکے تھے۔ بیوی میں چلنے کی ہمت نہ تھی۔ مگر شوہر اپنے بازو کا سہارا دے کر اسے لے گیا۔

ڈاکٹر آفذر کے ذہن پر چوبیس گھنٹے تک اس اندوہگیں واقعہ کا اثر رہا۔ پھر مصروفیات نے اس شدید احساس میں کمی کر دی۔ مگر اس بات کو ہفتہ دس دن ہی ہوتے تھے کہ جہانگیر قدر کی بیگم ہسپتال میں داخل ہوئیں اور ریوں جب انہوں نے زندگی کی ہر آسائش میسر ہونے کے باوجود اپنی بچی کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ اسے جیتے جی موت کی آغوش میں دفن کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا تو ڈاکٹر آفذر نے تنہائی اور رات کی تاریکی میں ایک فیصلہ کر لیا۔ وہ صبح نمودار ہونے سے پہلے ہی یہ بچی اس غریب آدمی سلیم اور اس کی بیوی کے حوالے کر دیں گے۔

رات ہمیشہ سے زیادہ تاریک تھی۔ شب کے اس پہر سردی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ کمبل میں سوئی ہوئی بچی کو ڈاکٹر آذر نے بازوؤں میں یوں اٹھا رکھا تھا۔ جیسے وہ بڑی نازک اور قیمتی شے ہو ان کے قدموں میں مستعدی تھی۔ کار کی سیٹ پر بچی سوئی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کار بہت احتیاط سے چلا رہے تھے۔ ان کے سامنے لمبی سڑک لیٹی ہوئی تھی اور وہ جا رہے تھے۔ ذہن میں یکے بعد دیگرے پیش آنے والے واقعات گردش کر رہے تھے۔ خوشی، دکھ، افسوس، رنج، تکلیف کتنے ہی احساسات تھے۔ سارے احساسات ذہن کی سطح سے یوں ٹکرا رہے تھے۔ جیسے سمندر میں پانی کی غیر منظم لہریں ساحل سے ٹکرا رہی ہوں۔

ڈاکٹر آفذر بچی کو جلد سے جلد اسکی نئی منزل پر پہنچانا چاہتے تھے۔ قبل اس کے کہ وہ جاگ کر روئے یا بھوک کا اعلان کرے ۔۔۔ سسٹر رقیہ نے ضرور اسے کھلایا ہوگا ۔ ورنہ اب تک اسے اٹھ جانا چاہیے تھا۔

بڑی سڑک کے کنارے ڈاکٹر نے کار پارک کی اور بچی کو سیٹ سے اٹھایا۔ آگے گلی کا راستہ پیدل چلنے والوں کے لئے تھا۔ ان کے دل میں کھٹکا سا لگا تھا۔ کہیں اپنے فیصلے پر جہانگیر قدر پچھتا نہ رہے ہوں اور بچی لینے کے لئے ان کا پیچھا نہ کر رہے ہوں۔ مگر ادھر ادھر کوئی نہ تھا۔ گلی ویران تھی۔ کسی کسی گھر میں لالٹین کی روشنی تھی۔ بہت سے گھر سر شام ہی سو چکے تھے۔ کسی مکان میں لگے درخت کے سوکھے پتے ڈاکٹر کے قدموں تلے آ کر چرچرائے جیسے فضا میں سسکیاں پھیلی ہوں اور انسان بین ہی

دنیا میں وارد ہونے والی بچی کی سسکی بھی شامل ہو گئی ہو۔

پوری گلی خالی تھی۔ ڈاکٹر تیز تیز قدموں سے چل رہے تھے۔ ایک سنسان سے مکان کا نمبر پڑھ کر انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ گلی میں دستک کی آواز گونج اٹھی۔

دوسرے لمحے کسی کے کنڈی کھولنے کی آواز آئی۔ ڈاکٹر کو خیال آیا۔ یہ کیسی صابر بچی ہے جو اس ہونے والے ظلم کے خلاف احتجاج نہیں کر رہی۔ چیخ نہیں رہی کہ:

"اے میرے چارہ گرو! مجھے کہاں لے آئے ہو! میں نے تو اجالوں میں جنم لیا تھا۔ میرا انگ میلا ہے تو کیا ہوا۔ میرا باپ تو شہر کا بڑا مشہور بزنس ایڈمنسٹریٹر ہے۔ کیا آپ مجھے اس شخص کی بیٹی بنا ہیں گے جو ایک فیکٹری کا معمولی سا مزدور ہے؛ جو شب و روز کام کرے بھی تو گھر کا خرچ نہیں چلا سکتا۔ میرا اس گلی میں دم گھٹ جائے گا۔ مجھے میرے امّی ابّو کے پاس لے جاؤ۔ میرا دل یہاں گھبرائے گا"!

بچی جیسے بے زبانی کی زبان سے شکایت کر رہی تھی۔

"میری ننھی گڑیا! تو بلندیوں کا ایک ستارا تھی۔ مگر تو اب اپنے PLANETYY نظام سے ٹوٹا ستارا ہے۔ ستارے جب ٹوٹتے ہیں۔ تو زمین پر آ گرتے ہیں۔ مت سوچ کتنی چوٹ آئی ہے۔ یہ زخم مندمل ہو جائے گا۔ زندگی ان چوٹوں سے عظیم تر ہے۔"

دوسرے لمحے مکان کا دروازہ کھل گیا۔ بوڑھا گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ اس کے گھر میں دن کے اجالوں میں کبھی کسی نے نہیں جھانکا تھا۔ شب کے نو بجے کی دستک نے اسے خوفزدہ سا کر دیا۔ وہ اگرچہ پیچھے ہٹا مگر لالٹین کی روشنی نے ڈاکٹر آذر کا چہرہ دکھا دیا۔ وہ پہچان گیا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ اس وقت؟" وہ حیرت و مسرت کے ملے جلے تاثر کے ساتھ کمبل میں لپٹی گٹھڑی کو اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں سلیم میاں! سوچا تھا صبح تمہیں ایک پیارا سا تحفہ دوں گا۔ مگر خیال آیا شب بھر کے لئے بھی تمہیں اس خوشی سے کیوں محروم رکھوں جس کے انتظار میں تم بوڑھے ہو گئے ہو۔ یہ تم میاں بیوی کے لئے تحفہ ہے۔"

سلیم میاں نے لالٹین کی بتی اونچی کر دی۔ روشنی معمولی سی تھی مگر بچی کی صورت چمک اٹھی۔ ایسی معصوم اور پیاری بچی کو دیکھ کر سلیم میاں چلا اٹھے۔

"اری نیک بخت زیبی! دیکھ تیرے گھر میں خوشی آپ چل کر آئی ہے۔ کیسی موہنی صورت کی بچی ہے۔"

زیب النساء جو خوابوں میں بھی اس نیک ساعت کی منتظر تھی۔ بستر سے ننگے پاؤں ہی دوڑی آئی۔ اسے ہوش کہاں تھا کہ اندھیرے میں کہاں دوپٹہ رہ گیا ہے۔

"لاؤ ذرا میں بھی دیکھوں۔"

بجائے صورت دیکھنے کے اس نے جھپٹ کر بچی لے لی۔ جیسے وہ بانہیں مدت سے خالی تھیں چیاؤں پیاؤں کرتی بچی کو سینے سے لگا کر اس نے جیسے برسوں کی تمنا کی تکمیل کی ہو۔ زیبی ایک لمحہ سانس روک کر بولی:

"کیا بچی کے والدین مر چکے ہیں؟"

"ایسی ہی بات ہے۔" ڈاکٹر نے مختصر طور پر کہا۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ بچی کہیں اپنا خون جگر پلاؤں اور کل کو اس کے والدین اسے لینے آ پہنچیں ہم غریب لوگ مقدمے بازی نہیں کر سکتے۔" وہ اندیشے سے بولی۔

"بہن جی! آپ بالکل فکر نہ کریں ایسی بات کبھی نہیں ہوگی۔ کبھی ضرورت بھی آ پڑی تو میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

"ڈاکٹر صاحب! آپ کی بڑی مہربانی آپ نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔" زیبی ممنونیت کے احساس سے کانپ رہی تھی۔ اس کی بے کراں امنگوں میں بچی نے نئی لہر دوڑا دی تھی۔ سلیم میاں کو احساس ہوا کہ وہ ابھی تک دروازے میں ہی کھڑے ہیں۔

"اندر آ جائیے ڈاکٹر صاحب! ان گلیوں میں پیدل ہی آنا پڑتا ہے۔ آپ تھک گئے ہوں گے۔"

"نیک کاموں میں تکلیف کیسی۔ پھر جس کام سے دوسروں کو راحت اور مسرت ملے وہ کام

لیے نیکی ہے۔ میری زندگی کا نصب العین ہی انسانیت کی خدمت کرنا ہے۔"

"اوہ ڈاکٹر صاحب! آپ کتنے اچھے ہیں۔" سلیم میاں بے حد متاثر ہو کر بولے۔ "کاش ہم بھی کوئی اچھا کام کر سکتے۔"

"اس میں غم کھانے کی کیا بات ہے۔ جب خدا نے موقع دیا اس عہد نامے کا پاس کیجئے گا۔"

ڈاکٹر کی نگاہ اُدھر اٹھ گئی۔ زیبی کھتی بجا رہی تھی۔

"خدایا! تیرا شکر ہے۔ تو نے ہماری بھی سن لی۔" وہ بے تابی سے بچی کو چومتی بجا رہی تھی جو بڑی مدھم آواز میں یوں یوں کر رہی تھی۔ مگر ڈاکٹر کو کیا خبر کہ یہ آواز سننے کے لیے زیبی نے کتنے قرن، کتنی گھڑیاں گزار دی تھیں اور آج بالکل خلافِ توقع معجزے کی طرح انہیں یہ تحفہ مل گیا۔ سلیم میاں کا دل ممنونیت کے جذبے سے سرشار تھا۔ ان کی نظر میں ڈاکٹر آذر ایک نیک فرشتہ کا روپ لے کر آئے تھے۔ اس کے بس میں ہوتا۔ تو وہ اس نیکی کے بدلے میں ڈاکٹر آذر کو ہفت اقلیم بخش دیتے اور کہتے۔۔

"یہ کافی نہیں۔ آپ کا احسان اس سے بھی بڑا ہے۔ آپ نے ہماری اندھیری کوٹھری میں ہی نہیں۔ ہمارے دلوں میں بھی روشنی کی ہفت رنگ کہکشاں بکھیر دی ہے۔ خدا آپ کو اس کا عظیم اجر دے۔"

قبل اس کے کہ میاں بیوی ڈاکٹر آذر کے لیے چائے کا اہتمام کریں۔ وہ دروازے سے ہی خدا حافظ کہہ کر لوٹ آئے۔

"پھر کسی دن فرصت ملی تو آپ کی بچی کا حال پوچھنے آؤں گا۔"

ڈاکٹر نے واپس اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔ میں نے کون سا معرکہ مارا ہے۔ ایک معمولی سا فرض ادا کیا ہے۔ یہ تو میرے پیشے کا اصول ہے کہ زندگی دینی ہے لینی نہیں۔ گلی کے موڑ پر آ کر وہ اپنی کار میں بیٹھے تو جہانگیر قدر کا جملہ کانوں میں گونج گیا۔

"ڈاکٹر! اس بچی کو دو انگلیوں کی حرکت ختم کر سکتی ہے۔ یہ بہت آسان ہے۔ میں زندگی بھر آپ کا احسان نہیں بھولوں گا۔ اس بچی کا زندہ رہنا ہمارے لئے ہی نہیں خود اس کے لیے پرابلم بن جائیگا

میری بیوی کتنی حسین ہے آپ کو معلوم ہے۔ اس بچی کی شکل ہم دونوں میں سے کسی سے نہیں ملتی یہ بچی میری بیوی کے لئے ایک چیلنج ہے۔ اس بچی کو مار دو۔ ختم کرو۔"

آدھی رات کے سناٹے میں کار کے کھلے شیشے سے جیسے آوازیں ان کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ مگر دوسری جانب سلیم میاں کی آواز ان کے کانوں میں خوشگوار تاثر پیدا کر رہی تھیں۔

"ڈاکٹر صاحب آپ نے ہمارے ویران گھر میں اجالا کیا ہے۔ آپ آدمی نہیں فرشتہ ہیں۔ آپ نے ہماری بے جان زندگی میں تمنی روح ڈال دی ہے۔ ہم زندہ رہیں گے اس بچی کی خاطر۔ آپ کا بہت بہت شکریہ! ہم آج کتنے خوش ہیں۔"

"زیبی! ڈاکٹر صاحب کے لئے چائے پانی کا بندوبست کرو۔ یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ کتنا بڑا انعام ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب! ہم عمر بھر آپ کا احسان نہیں بھولیں گے۔" زیبی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

ڈاکٹر آذر کو وہ آنسو اندھیرے میں چمکتے موتی لگے۔ ایسے موتی جن کی چمک کبھی ماند نہ پڑے گی۔

ڈاکٹر آذر دو مختلف قسم کے انسانوں کی ذہنیت کے تضاد پر غور کرتے ہوئے اپنے بنگلے پر آ گئے۔

چند گھنٹے پہلے عالم وجود میں آنے والی بچی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ نہ خوشی کا، نہ غم کا۔ ان کی اس چالیس سال کی زندگی میں کتنے عجیب و غریب حادثے اور واقعات پیش آئے تھے۔ کچھ ذہن میں اب بھی روزِ اوّل کی طرح تازہ تھے اور کچھ وقت کی گرد تلے دفن ہو چکے تھے ڈاکٹر آذر نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ ہسپتال کی طویل ڈیوٹیوں، نازک اپریشنوں اور انسانیت کی خدمت کے جذبے کے تحت انہوں نے کبھی شادی کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ایسے نیک طبع ڈاکٹر کو قدرت نے سبھی چیزیں عطا کی تھیں۔ وسیع بنگلہ، کار، فرنیچر ہر قسم کا فرنیچر

وہ تین نوکر جو کام تھوڑا مگر عیش زیادہ کرتے تھے۔ یہ جاننے کے باوجود ڈاکٹر نے انہیں کبھی نہ ڈانٹا تھا۔ نہ ہی حکم دیا تھا۔ خانساماں کا کئی سالوں سے مشورہ سن کر وہ ٹال دیتے کہ:

"ڈاکٹر صاحب! اب آپ شادی کر لیں۔"

کئی سالوں کے بعد ایک دن ڈاکٹر آذر نے اسے کہہ دیا۔ "میاں! میری تو شادی ہو چکی تمہیں کیا پتہ؟"

"نہیں جی! مجھے تو آپ نے کوئی اطلاع نہیں دی۔"

"میری تو ہسپتال اور وہاں کے مریضوں سے شادی ہو چکی ہے اور انہی کی خدمت کرتا ہوں۔"

"نہیں جی ایسے بھی کوئی ہسپتالوں سے شادی کرتا ہے۔"

اس کے بعد نوکر نے ڈاکٹر کا مصمم ارادہ دیکھ کر شادی کا ذکر کرنا ہی چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر آذر کو خوشی تھی کہ ایک لاحاصل موضوع سے نجات ملی۔

دو سال بڑی مصروفیت میں گزرے۔ ان گزرے سالوں میں جہانگیر قدر کی دولت اور شہرت دونوں میں خاصا اضافہ ہوا گو جہانگیر اور درشہوار کو پتہ تھا کہ پہلی بچی پیدائش کے فوراً بعد مر چکی ہے اور اس صدمے کو کم کرنے کے لیے جہانگیر نے بیوی کو خاصا مصروف رکھا تھا۔ خریداری اور غیر ممالک کی سیاحت نت نئے تجربات اور وہاں کے رسم و رواج بھی آدمی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیں کئی ماہ کی چھٹی کے بعد جہانگیر پھر وطن واپس آ گئے۔ غیر ممالک کی سیاحت سے درشہوار کی صحت پر قابل رشک اثر ڈالا۔ ان کا گلابی رنگ اور بھی شگفتہ ہو گیا۔ یورپ سے واپس آ کر جہانگیر نے شہر سے دور اپنی نئی کوٹھی کا افتتاح کیا۔ جدید قسم کی مشینری کی مدد سے فرش پر ٹائلیں اور سنگ مرمر لگایا گیا۔ دروازے اور کھڑکیوں کو بلجیم سے خاص شیشے منگوا کر سجایا گیا۔

ایک ایک چیز جہانگیر قدر کی نگرانی میں ان کے حسنِ ذوق کو مدِ نظر رکھ کر بنائی جا رہی تھی۔ صرف کوٹھی بننے پر جہانگیر کو اتنی خوشی نہیں تھی۔ بلکہ ایک عدد صاحبزادی کے تشریف لانے سے خوشی دوہری ہو گئی تھی۔ یہ بچی قدرت کی فیاضیوں کا مرقع تھی۔ اپنے ایرانی نانا کی طرح ستواں ناک بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں، سنہری بال اور گلابی ہونٹ۔

شبینہ کیا پیدا ہوئی، کوٹھی کے در و دیوار چمک اٹھے۔ اپنی پہلی بچی کی موت پر اگرچہ درشہوار کو دلی صدمہ ہوا تھا۔ انہیں دکھ تھا۔ مرنے والی بچی کا کہ وہ آخری دیدار بھی نہ کر سکیں۔ جب

"تاسف بھرے لہجے میں انہوں نے شوہر سے اپنے دل کی کھوئی ہوئی آرزو کا ذکر کیا تو وہ لاپروائی سے بولے۔

"شہوار! وہ تمہارے دیکھنے کی چیز نہیں تھی، خاصی بھیانک مخلوق تھی"

"کیا برائی تھی میری بچی میں" مسز شہوار چونک کر بولیں۔

"اے بیگم صاحبہ! اگر آپ نے بچی کا دیدار کر لیا ہوتا تو ڈراؤنے خواب شب بھر پریشان کرتے۔ میں نے جب اسے دیکھا تو مجھے بھی خوف سا آنے لگا جیسے وہ میری نہیں کسی اور کی بچی ہو۔ میں تو پریشان ہو گیا۔ اس کا رنگ بھی گورا نہیں تھا۔ یہ چیز میرے لیۓ ایک چیلنج بن گئی۔ بالکل ناقابل برداشت اگر وہ خود نہ مر جاتی تو میرے ہاتھوں میں یہ قوت تھی کہ ۔۔"

"آپ دیوانے ہو گئے ہیں" مسز شہوار چلا پڑی۔

"کچھ بھی سمجھو میں بدصورتی برداشت نہیں کر سکتا ۔۔ اچھا ہوا اس سے نجات مل گئی ورنہ عمر بھر کی مصیبت کون لیتا"

"بچے پالنا ۔۔۔ت کا کام ہے مرد کا نہیں۔ آپ کو تو کچھ بھی نہ کرنا پڑتا اس وقت"

"ارے بھئی آپ نہیں سمجھیں گی۔ میں کیسے سمجھاؤں بس یہی کہوں گا۔ قدرت کبھی کبھی بھیانک مذاق کرتی ہے۔ میں تو اس بات پر خدا تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے ہماری اس منی کو حسن اور گورا رنگ بخشنے میں کمال فراخ دلی سے کام لیا ہے۔ ہماری گڑیا کو جو دیکھے گا تعریف کرے گا میں اپنی بچی پر کتنا نازاں ہوں"

"آپ بچی پر نازاں ہیں اسی لیۓ اخبار میں صاحبزادی کے لیۓ گورنس کا اشتہار دیا ہے"

"ایک کی بجائے دس بھی رکھنا پڑیں تو رکھوں گا۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ ا۔۔ بچی کو دیکھ بھال کی۔ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اسی کے لیۓ تو ہے"

سچ تو یہ تھا کہ شبینہ اپنے باذوق والدین کی آنکھوں کا تارا تھی۔ وہ مسکراتی تو ماں باپ کے دل کھل اٹھتے وہ مرجھا جاتی تو گھر کے در و دیوار سوگوار ہو جاتے۔

گورنس کے باوجود درشہوار شبینہ کی دیکھ بھال خود کرتیں۔ انہیں اکثر اپنے شوہر کے ہمراہ مختلف فنکشن ڈنر اور پارٹیوں میں جانا پڑتا۔ ذاتی طور پر انہیں سوشل تقریبات سے دلچسپی نہ تھی مگر شوہر کی دلجوئی بھی مقصود تھی۔ شبینہ کی گورنس مس فرزانہ یونیورسٹی کی گریجویٹ ہونے کے علاوہ بچوں کی دیکھ بھال کا چھ ماہ کا کورس بھی کر چکی تھیں۔ وہ فرزانہ کو اکثر شبینہ کی طرف متوجہ اور مستعد پاتیں تو انہیں احساس ہوتا کہ شبینہ کو صحیح تربیت مل رہی ہے۔ شبینہ اور فرزانہ کی دوستی اور آپس کی محبت کبھی کبھی ان کے دل میں شک کا بیج بو دیتی۔ کہیں فرزانہ ان کی محبت کو نہ چھین لے۔ پھر انہیں احساس ہوتا۔ فرزانہ ایک گورنس ہی تو ہے وہ کسی دن اسے علیحدہ کر سکتی ہیں۔ انہیں شدت سے اس دن کا انتظار تھا۔ جب شبینہ کی پہلی سالگرہ منائی جائے۔

کافی صبر و انتظار کے بعد شبینہ گڑیا پاؤں پاؤں چلنے لگی اور جہانگیر قدر کی نئی کوٹھی پوری شان و شوکت سے تعمیر کے مراحل طے کر رہی تھی۔ رنگین ٹائلیں باتھ روم میں فٹ کی جا رہی تھیں سنیٹری کا سامان جرمنی اور اٹلی سے آ رہا تھا۔ درشہوار کا خیال تھا کہ یہ شہر کی سب سے خوبصورت کوٹھی ہوگی۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ شبینہ کی پہلی سالگرہ نئی کوٹھی میں منائی جائے۔

اگرچہ جہانگیر بہت مصروف آدمی تھے۔ صبح کراچی، اگلے دن ڈھاکہ اور کبھی چٹاگانگ۔ قارن بزنس کے سلسلے میں ملکی تجارت کی میٹنگ میں ان کی شرکت لازمی ہوتی۔ بزنس اور تجارتیات میں انہوں نے اپنی ذہانت اور محنت سے اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔

"جہانگیر ولا" کی بنیادوں سے لے کر تکمیل تعمیر تک جہانگیر نے سب کچھ اپنی نگرانی میں بنوایا۔ گو عمارت کراچی کی مشہور شہ زور انجینیرنگ کمپنی بنوا رہی تھی مگر جہانگیر کی ذاتی توجہ اور مشورے کی بھی بے حد ضرورت تھی۔ ان کا خیال تھا کوٹھی میں ذرا سا بھی نقص سارے حسن کا ستیاناس کر سکتا ہے۔ شبینہ کی سالگرہ میں چند روز باقی تھے کہ کوٹھی تیار ہو گئی۔ دنوں میں قالینوں اور فرنیچر وغیرہ سے اسے آراستہ کر دیا گیا۔

اپنی سالگرہ کے دن شبینہ ہنس کھیل رہی تھی۔ کوٹھی کو سجاتے اور بتیاں لگانے والے مستعدی

سے کام کر رہے تھے۔ ثبینہ کتنی خوش قسمت تھی کہ اس سالگرہ سولہ لاکھ کی عظیم الشان کوٹھی میں منائی جا رہی تھی۔ ملک ملک سے جمع کئے ہوئے تحائف کیسی ترتیب و سلیقے سے کوٹھی کے گوشوں اور کارنسوں میں سجے ہوئے جہانگیر کی خوش ذوقی کا ثبوت دے رہے تھے۔ بیڈروم میں آبنوسی پلنگ، ڈرائنگ روم میں مہاگنی کی سیاہ لکڑی پر باریک کام کیا ہوا تھا۔ فرنیچر ترتیب سے رکھا تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر ریشمی اطلسی پردے آویزاں تھے۔ آج تو روشنیوں اور پھولوں کے دھارے میں یہ جہانگیر ولا شاندار محل لگ رہی تھی اور جہانگیر قدر کی گردن احساسِ تفاخر سے تنی ہوئی تھی۔

ثبینہ کے پاس اگرچہ سینکڑوں لباس تھے۔ ملک ملک سے آئے ہوئے ریشمی اور اونی گرم سوٹ۔ مگر سالگرہ کی تقریب کے لئے خصوصی طور پر چاندی کے تاروں والا قیمتی لباس تیار کرایا گیا۔ وہ اس لباس میں خوش تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی وسط اکتوبر کی اس شام کو بڑی پیاری خنک ہوا چل رہی تھی۔ بکر سیتھم کے پھول بجلیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ ثبینہ اپنی حسین گورنس کے ساتھ برآمدے میں اس کی انگلی تھامے چہل قدمی کر رہی تھی ـــ جہانگیر اور درشہوار کے لئے ثبینہ کی بیماری کا انکشاف بہت بڑے حادثے سے کم نہ تھا۔ مگر اس سے پہلے جہانگیر قدر کو بہت مصروف رہے مگر اپنی بیگم میں ایک تبدیلی وہ نوٹ کئے بغیر نہ رہ سکے۔ درشہوار بات کرتے کرتے خاموش ہو جاتیں۔ ایک موضوع کو چھوڑ کر کسی اور بات کا ذکر کرنے لگ جاتیں۔ کئی بار جہانگیر نے اس ذہنی غیر حاضری کی وجہ دریافت کرنے کی مگر ایک شام کی بجائے پر وہ پوچھے نہ رہ سکے۔

"بیگم! کیا بات ہے کچھ دنوں سے آپ کو اداس اور پریشان سی دیکھ رہا ہوں۔"

"کچھ نہیں جہانگیر آپ وہم نہ کیجیے، میں اپنی موجودہ زندگی سے بہت خوش اور مطمئن ہوں۔"

"آپ خوش اور مطمئن ہیں یہ مجھے معلوم ہے مگر آپ کو اپنے دل کی بات بتانا ہوگی۔"

"کیا کیجیے گا اور پوچھ کر؟"

"نہیں شہوار! آپ کو شبینہ کی قسم آپ کو مجھے زندگی کا ہی نہیں دکھ کا بھی ساتھی سمجھنا چاہیے"
"میری افسردگی کی وجہ نہ تو آپ ہیں نہ ہی اس بات کا آپ سے خاص تعلق ہے۔ ہو سکتا ہے میری دیوانگی پر آپ ہنسیں بھی"
"کمال ہے میں اس درجہ سنجیدہ ہو کر پوچھ رہا ہوں۔ جلدی بتلائیے۔ میں کافی صبر کر چکا ہوں"
"دراصل میں سوچتی ہوں شبینہ ایک سال کی ہو رہی ہے اگر ہماری پہلی بچی زندہ ہوتی تو وہ تین سال کی ہوتی"
"لاحول ولاقوۃ کہاں یہ ہماری تارہ سی گڑیا کہاں وہ چڑیل صفت بچی۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے"
"یہ بات اپنی جگہ پر درست سہی مگر اپنے ایمان سے کہئے نرس نے تو مجھے بتایا تھا کہ بچی بعد ایش کے وقت صحت مند اور زندہ تھی — بعد میں اچانک کیسے فوت ہو گئی؟ کہیں اسے اپنی توقع کے مطابق نہ دیکھ کر آپ نے اس کا گلہ تو نہیں دبا دیا؟"
"بھئی! میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ باپ ہو کر میں بھلا ایسی بھیانک حرکت کر سکتا ہوں"
"بھیانک حرکت!" وہ شہوار سوچ میں پڑ گئیں — "آدمی شعوری طور پر نہیں لاشعوری طور پر ایسے کام کر جاتا ہے۔ بعد میں چاہے اسے کتنا ہی پچھتانا پڑے"
"نہیں ہم پچھتاوے والا کام نہیں کرتے"
جہانگیر نے بیگم کو مکمل طور پر مطمئن کرنا چاہا مگر وہ دل میں کھٹک سی لئے ہوئے اٹھ کر چلی گئیں اور جہانگیر نے شکر کیا — کیسا منحوس موضوع زیر بحث آ گیا تھا — وہ بچی خدا کی پناہ، اگر وہ اس عالیشان اور شاندار کوٹھی میں موجود ہوتی تو ہر سمت بدصورتی کے تاریک سائے ناچتے نظر آتے۔ اچھا ہی ہوا ڈاکٹر آذر نے اس بات کی نوبت نہیں آنے دی ورنہ مجبوراً مجھے اس کے خون سے ہاتھ رنگنے پڑتے گو میں ظالم انسان نہیں ہوں مگر میری جمالیاتی حس کا یہی تقاضا تھا — اس کی وجہ سے کتنے مسائل پیدا ہو جاتے — ابھی جہانگیر ایسی باتیں ہی رہے تھے کہ سیکرٹری نے اطلاع دی سب کچھ تیار ہو چکا ہے۔

راہداریوں میں سبز پتوں اور شاخوں کی محرابیں لگائی گئی تھیں۔

"آپ خود دیکھ لیں"۔ جہانگیر اٹھے تو درشہوار بھی آگئیں۔ دونوں میاں بیوی ساتھ ساتھ چلتے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ کوٹھی کا وہ حصہ آگیا جہاں سے سجاوٹ شروع ہوئی تھی۔ ایک ایک پھول پودا رنگ روشنی ایک مناسب ترتیب سے سجا تھا۔ کہیں روشنیوں کے پھول تھے تو کہیں پر روشنیاں ستاروں کی صورت میں بکھری ہوئی تھیں۔

بیگم کے ساتھ جہانگیر قدر نے بھی اس سجاوٹ کے لئے منتظم کے حسن ذوق کی بہت تعریف کی۔ باہر روشنیوں اور قمقموں کے ہنگامے تھے۔ زنان خانے میں درشہوار نے سینکڑوں امانوں نے ساتھ اپنی راج دلاری کو آراستہ کیا۔ سال بھر کی یہ ننھی منی گڑیا بالکل جیتی گڑیا لگتی تھی۔

پہلے جہانگیر کا خیال تھا کہ بیٹی کی سالگرہ پارٹی شہر کے بہترین ہوٹل میں شان سے دی جائے۔ مگر درشہوار کے مشورے پر انہوں نے ارادہ بدل دیا۔ اس طرح جہانگیر ولا کی نمائش بھی ہو جائے گی۔ ان کی خواہش تھی۔ سب مہمان ان کے حسن و ذوق کو دیکھیں اور ان کی بلند ذوق کی داد دیں۔

چار بجے سے مہمان آنے شروع ہو گئے۔ شہر کے امرا رئیس اور بزنس کے شعبے کے بڑے بڑے سرمایہ دار، ان کے بچے اور بیویاں قیمتی غراروں، لہنگوں اور ساڑھیوں میں ملبوس چلی آ رہی تھیں۔

جہانگیر اور درشہوار کے ساتھ جہانگیر کا چہیتا دوست رضوان برابر ان کی مدد کر رہا تھا۔ بہت سے لوگ آ چکے تھے۔ جہاں گرمجوشی، مروت اور خوش اخلاقی تھی۔ خوبصورت ماحول تھا۔ ایک شخص کا جہانگیر کو شدت سے انتظار تھا۔ ڈاکٹر آذر کو انہوں نے خصوصی دعوت نامے کے ساتھ فون پر بھی اطلاع دی تھی۔

"ڈاکٹر آذر! میں جہانگیر بول رہا ہوں"۔

"خیریت تو ہے"۔ ڈاکٹر نے ٹھنڈے اور مطمئن لہجے میں کہا۔

"جی ہاں آپ کی دعا ہے۔ مجھے احساس ہے آپ بے حد مصروف آدمی ہیں مگر ۲۵ اکتوبر کو پانچ بجے آپ میری بچی تبسم کی پہلی سالگرہ میں آسکیں تو مجھے بے حد خوشی ہوگی"۔

"جہانگیر صاحب! آپ کی بچی دیکھنے کا مجھے شوق ہے۔ چار بجے ایک اپریشن ہو رہا ہے اگر جلدی کام ختم ہو گیا تو حاضر ہو جاؤں گا۔"

"شکریہ ڈاکٹر! مجھے آپ کا انتظار رہے گا۔" جہانگیر قدر نے فون رکھ دیا۔

اور اب پانچ بجے جب بھی مہمان آ چکے تھے۔ ڈاکٹر آذر کا انہیں انتظار تھا۔ پانچ بجے کے بعد ڈاکٹر کی کار جہانگیر کے آہنی گیٹ میں داخل ہوئی۔ تو جہانگیر جلدی سے آگے بڑھے۔

"واللہ آپ کے آنے پر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے۔"

ڈاکٹر کا تعارف وہ دیگر اہم مہمانوں سے کرانے لگے۔ دوسری طرف زنان خانے میں مسز شہناز مہمان خواتین کے ساتھ مصروف تھیں۔

جہانگیر قدر کو ڈاکٹر آذر نے کئی سال کے بعد دیکھا تھا۔ آج یہاں آکر پرانی باتیں جیسے بیتا وقت سے آئی تھیں۔ ابھی ڈاکٹر آذر کھڑے ہی تھے کہ جہانگیر نے گورنس سے وہ پیاری سی حسین مورت لے لی۔

"آؤ بیٹے! تمہیں تمہارے انکل سے ملائیں۔" اپنے قیمتی سوٹ کی پرواہ کئے بغیر وہ بچی کو بانہوں میں یوں پکڑے ہوئے تھے جیسے ارد گرد کی ساری چیزیں بے جان اور غیر اہم ہوں اور بس ساری کائنات یہ ایک زندہ بچی ہو۔ یوں ان کی محبتوں اور توجہ کا محور ہو سورج کی طرح۔

ڈرائینگ روم آ کر جہانگیر نے شبینہ کو ڈاکٹر آذر کی طرف بڑھایا اور فخریہ انداز سے کہا۔

"آذر! دیکھو میری ننھی گڑیا!"

ڈاکٹر نے حیرت و مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ گڑیا کو بازو میں اٹھاتے ہوئے دیکھا۔ مگر بچی کی اس حسین اور پیاری گڑیا نے انہیں گذری تلخ حقیقتیں یاد دلا دیں تو جہانگیر نے انہیں زیادہ دور جانے کی مہلت نہ دی۔

"دیکھی میری شبینہ! کتنی پیاری ہے کہ نہیں؟"

"بہت پیاری اور معصوم بچی ہے۔" کہنے کو ڈاکٹر نے یہ کہہ دیا مگر انہیں جہانگیر کے چہرے

پر لکھی ہوئی تحریر پر نظر آگئی جو صرف وہ ہی پڑھ سکتے تھے۔ ایک احساس کی طرح ایک جواب کی طرح یہ ایک وضاحت تھی۔ جیسے وہ کہہ رہے ہوں۔

"ڈاکٹر! دیکھ لیا میری بچی کیسی ہوتی چلی ہے تھی۔ تین سال پہلے پیدا ہونے والی بچی میری بیٹی کہاں تھی۔ میری اصل بچی تو یہ ہے۔ بالکل چینی کی گڑیا جیسی ہے۔"

وہ بچی جو تین سال پہلے پیدا ہوئی تھی۔ وہ تو ہم میاں بیوی پر ایک الزام تھی، کھلا بہتان تھی۔ وہ Genes Distribution کو عام آدمی کیسے سمجھ سکتا ہے اور اس ذمہ داری کو ہم اپنے سر کیسے لے لیتے جبکہ ہمیں پتہ تھا۔ یہ بے ضرر مخلوق ہر فیصلے کو قبول کرلے گی۔ یہ مرگِ مفاجات اسے قبول کرنا ہی پڑا اور ہم کیسے صاف بچ نکلے۔ ہر جرم کے دھبے ہر بے رحمی کے دھبے سے بے نیاز ہم اب بے گناہوں کی قطار میں کھڑے ہیں۔

"اوہ" ایک احساس تھا جسے ڈاکٹر آذر نہ چھپا سکے مگر جہانگیر قدر نے کوئی توجہ نہ دی۔ جہانگیر کے مہمان دوست، رشتہ داروں، کاروبار اور کوٹھی کی بناوٹ اور سجاوٹ کی تعریف کر رہے تھے۔ مگر ڈاکٹر آذر کو ہر چیز کھوکھلی اور بے جان لگی۔

کیک کاٹنے اور موم بتیاں بجھانے کی رسم ادا ہوئی۔ بچے خوش تھے۔ ثبینہ خوش تھی۔ ساری چیزیں اس کے لئے نئی تھیں۔ وہ ہر چیز کو چھو کر دیکھ رہی تھی۔

سات بجے ڈاکٹر آذر ہسپتال میں ڈیوٹی کا کہہ کر اپنے بنگلے پر آگئے۔ انھیں کچھ الاسا ہوا تھا۔ وہ کیوں مروت میں آکر اس بے حس شخص کے بلانے پر جہانگیر ولا چلے گئے اور اب یہ ذہنی خلفشار۔ ثبینہ کی سالگرہ پر فوجی بینڈ بلایا گیا تھا۔ شہر کے معززین نے ثبینہ کو قیمتی تحفے دیئے تھے۔ ٹافیاں، بسکٹ، پھول ہار، کپڑے، کھلونے۔ کمرہ چیزوں سے بھر گیا تھا۔ کئی لاکھ کی کوٹھی میں ثبینہ کی سالگرہ منائی گئی۔ جہاں ہر قدم پر رنگ و نور کی برسات ہو رہی تھی۔

اور رضوانہ جو ماں کے بطن سے پیدا ہوئی جس کے بطن سے ثبینہ نے جنم لیا۔ کیسی ویران اور تاریک گلی میں رہتی ہے۔ جہاں بجلی کا ایک قمقمہ نہیں جلتا۔ جہاں پانی بھرنے کے لئے گلی کے موڑ پر

میونسپلٹی کے نلکے پر جانا پڑتا ہے۔ جہاں ہفتے میں ایک آدھ دفعہ پانی کی وجہ سے خنجر اور چاقو چل جاتے ہیں۔

"رضوانہ! تمہارا شبلیتہ سے کیا رشتہ ہے۔ یہ سوائے میرے کوئی نہیں جانتا مگر کاش تم عمر بھر اس پل کے بارے میں نہ جان سکو جو تمہیں جہانگیر ولا کی اونچی اور مضبوط دیواروں تک لے جائے کبھی کسی نے تمہیں جہانگیر ولا، شبلیتہ اور درشہوار کے بارے میں کچھ بتایا بھی تو سمجھنا کہ یہ پریوں اور شہزادیوں کی ایک دلکش کہانی ہے۔ کبھی یقین نہ کرنا ان سے تمہارا بھی کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ اگر کبھی زندگی کے کسی موڑ پہ ان میں سے کسی نے تم سے محبت جتائی تو اسے ان کی عیاری اور فریب سے تعبیر کرنا، کبھی خلوص نہ سمجھنا۔

وہ اپنے خیال میں ہی بھولی بھالی معصوم سی آنکھوں والی اس سانولی سلونی رضوانہ کو سمجھا رہے تھے۔

ڈاکٹر آفتاب اونچے لمبے خوبرو، ہنس مکھ اور ذہین انسان ہونے کے ساتھ پچھلے پندرہ سالوں سے سرجری کے ماہر ڈاکٹر تھے۔ ان کی عمر چالیس سال کی ہو رہی تھی مگر وہ اب تک اکیلے تھے۔ انسانیت کی خدمت کے جذبے اور ہسپتال کی طویل ڈیوٹیوں سے وہ کبھی نہ اکتائے تھے جیسے یہ ان کی زندگی کا مشن ہو اور وہ اسی لیے زندہ ہوں۔ ان کی ڈیوٹی نو بجے ختم ہو جاتی۔ مگر وہ مریضوں کی خطرناک حالت دیکھ دو دو بجے تک ہسپتال میں کام کرتے۔ انہیں تسلی دیتے۔ ان کی باتیں سنتے اور ان کا درد اپنے سینے میں محسوس کرتے۔

پورے ہسپتال میں ڈاکٹر آفتاب ایک مثالی ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے بھولے سے بھی کبھی سول ہسپتال کی دوائیاں خورد برد نہیں کی تھیں۔ کسی مریض سے کوئی انعام یا نذرانہ اپنی خدمت کے صلے میں وصول نہیں کیا تھا۔ دن ہو یا رات گھر میں جب کبھی ان کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ان کی بے بی کار وقت، ماحول، بارش یا طوفان سے بے نیاز سڑکوں پہ دوڑتی ہسپتال کی طرف بھاگی جاتی۔ اپنی تنخواہ کا اکثر حصہ بے انتہا مجبور اور بے بس مریضوں کی امداد میں یوں صرف کرتے جیسے وہ ان کے اپنے عزیز ہوں۔

ڈاکٹر آفتاب اپنی چالیس سالہ زندگی میں مطمئن تھے۔ انہوں نے کبھی غیر ضروری طور پر نہیں سوچا تھا اس سے حاصل ہی کیا کہ آدمی غم اور فکر میں گھلتا رہے۔ ہسپتال میں مریض آتے جاتے رہے۔ ڈاکٹر

نے ہر شخص کے ساتھ مروت اور ہمدردی کا سلوک کیا۔ ان کی محبت سورج کی ان کرنوں کی طرح تھی جو کائنات میں بسنے والے سارے انسانوں کے لئے یکساں حرارت رکھتی۔ ان پر کوئی ٹیکس نہ تھا۔ جس مریض کو جس چیز کی ضرورت تھی۔ اپنی بساط کے مطابق ڈاکٹر آفر نے اس کی اعانت کی۔ ہسپتال میں درد دل رکھنے والے ڈاکٹروں کی شدید قلت تھی۔ اس کمی کو حتی المقدور ڈاکٹر آفر پورا کر رہے تھے۔ ان کا رویہ ہمیشہ دوستانہ اور مشفقانہ ہوتا۔ وہ صبر و تحمل سے مریضوں کی بات سنتے۔ انہوں نے ٹی بی اور سرطان کے مریضوں کو بھی آخری دم تک حوصلہ اور امید دلائے رکھا اور اپنی زندگی کی اہمیت کا سبق دیا۔

بہت سے ایسے لوگ ہسپتال میں لائے گئے جو خود تھک چکے تھے۔ حادثات نے جن کے بازو شل کر دیئے تھے جو ہار چکے تھے اور بے بسی کی حالت میں ہسپتال لائے گئے تھے۔ ڈاکٹر آفر کو تو اب تعداد بھی یاد نہیں تھی کہ ایسے کتنے لوگ تھے۔ جنہوں نے واقعی ڈاکٹر سے کچھ سیکھا تھا۔ مریضوں کو انہوں نے تسلی دی اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے جینے کا درس دیا۔ ان کی اپنی ضرورتیں، آرزوئیں، تمنائیں جنگل میں تنہا رہنے والے بانس کے درخت کے مقابلے میں برگد اور پیپل کے اس درخت کے مشابہ تھیں جو برسوں سے اپنی بانہیں پھیلائے تھکے ہارے دھوپ میں چلے مسافروں کو گرمی اور بارش سے بچاتا ہے۔ پناہ دیتا ہے!

ڈاکٹر آفر کی پوری زندگی ہی برگد کے درخت سے تعبیر تھی۔ ہسپتال کی طرف سے ایک چھوٹا سا خوبصورت بنگلہ، ضروری فرنیچر سے آراستہ انہیں ملا ہوا تھا۔ وہ خود تنہا تھے، ضرورتیں محدود تھیں۔ ذہین اور تجربہ کار اس قدر تھے کہ مخاطب کے دل کی بات جان لیتے تھے۔ شہر بھر میں ڈاکٹر آفر کی نیک نامی اور شرافت مشہور تھی۔ ان کے نزدیک عورت ماں، بہن اور بیٹی تھی۔ کسی عورت کو چوتھے رشتے کے بارے میں ان کے ذہن کبھی میں کبھی کنفیوژن پیدا نہیں ہوا تھا۔

ڈاکٹر آفر بڑے مستقل مزاج انسان تھے۔ انہوں نے جان بوجھ کر کبھی کسی کا دل نہ دکھایا تھا۔ ایک دفعہ کسی بڑے افسر کی بیٹی فریدہ نے ڈاکٹر کی شرافت، نیکی اور ان کی تنہائی سے متاثر ہو کر

ان کی زندگی ہم سفر بننے کی خواہش کی۔ مگر انہوں نے بڑے پیار سے اس کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیئے۔ جہاں جانا ممکن نہیں وہاں جانے سے کیا حاصل۔

"فری! تم ایک اچھی لڑکی ہو مگر شادی میری زندگی کے پروگرام میں شامل نہیں۔ ہاں کبھی ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمہاری پیش کش کو لبیک کہوں گا۔ اگر تمہارے والدین نے کبھی تمہاری شادی کرنا چاہی تو میرے انتظار میں وہاں انکار نہ کرنا۔ میں ٹھہرا ایک مسافر میری منزل انسانیت کی خدمت کی ارفع چوٹی ہے۔"

ان دنوں ڈاکٹر آذر کو سول ہسپتال سے وابستہ ہوئے پانچ سال ہوئے تھے۔ دل نے ایک دو دفعہ بغاوت کے طور پر شادی کا مشورہ بھی دیا۔ مگر ڈاکٹر نے دل کی بات نہ مانی۔ فریدہ کے والدین نے چند ماہ بعد ہی اس کی شادی طے کر دی اور وہ چپ چاپ دلہن بن کر رخصت ہو گئی۔

فریدہ سے بچھڑنے کا ڈاکٹر آذر کو ہلکا سا احساس ہوا مگر پھر انہوں نے سوچا فریدہ کے ساتھ شادی ہو جاتی تو ان کے اٹھارہ بیس گھنٹے ہسپتال میں رہنے پر وہ کبھی ان کے ساتھ خوش نہ رہتی اور اگر وہ اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتے تو ان کے ہسپتال میں نہ رہنے سے کتنے مریض مر جاتے۔ چلئے جو بھی ہوا اچھا ہی ہوا۔ زندگی ہر قدم پر ایک نئے حادثے اور امتحان سے دوچار ہوتی ہے۔ اس طرح کئی چھوٹے چھوٹے واقعات جو نہ دوہرانے کے باوجود ڈاکٹر کے ذہن کی تختی چھوٹے چھوٹے یادوں کے جزیروں کی طرح کندہ تھے۔

کئی مریض لڑکیاں جو خوبصورت بھی تھیں، معصوم اور ذہین بھی۔ جن کی محبتیں اور عقیدتیں ان کے دل کی چاہتوں کی طرح مقدس اور عظیم تھیں۔ جنہوں نے بڑی بے ساختگی سے ڈاکٹر آذر کی بے پناہ ریاضتوں اور خدمتوں کا اعتراف کیا تھا اور اپنے دل کی ڈھکی چھپی تمنا کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ ایک لڑکی روحی بانو نے خط لکھا اور عید کے موقع پر عید کارڈ پر خوبصورت سا رومانی شعر لکھ بھیجا۔ ایک اور پیاری سی لڑکی نوشی لب نے موسم سرما میں ڈاکٹر آذر کے لئے براؤن پل اوور بنایا۔ انجم ان کے ہسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں گلے کے کینسر کی مریضہ تھی۔ وہ

میٹرک کی طالبہ تھی۔ جب باغوں میں پھول کھل رہے تھے ۔ دور کسی یوکلپٹس کی ڈالی پر کوئل لوہن سا نغمہ گا رہی تھی ۔ آموں کے پیڑ پر بور لگا تھا۔ ڈاکٹر نے بڑی دلسوزی سے انجم کا علاج کیا اور ہسپتال کے سرجری کے ماہرین کی کمیٹی نے انجم کے گلے کا اپریشن کیا مگر اپریشن کے دو دن بعد ہی انجم اپنی زندگی کے کرب سے نجات پا گئی - اگر اپریشن نہ ہوتا تو وہ پندرہ بیس دن اور زندگی کا عذاب جھیل لیتی - مگر وہ مر گئی - اس کی بڑی بہن ریحانہ ایف اے میں پڑھتی تھی - اس کی سگی ماں مر چکی تھی - اس کا باپ کسی دور علاقے میں سرکاری دورے پر تھا اور سوتیلی ماں انجم کی لاش بھی لینے نہ آئی - اتنی چھوٹی سی عمر میں وہ مرنے سے پہلے وصیت کر گئی کہ میری لاش میڈیکل کے طلباء کو دے دی جائے تاکہ وہ تجربے کر کے اس مرض پر تحقیق کر سکیں -

انجم کی موت کے بعد ریحانہ ایک دفعہ ہسپتال آئی - اس دفعہ وہ صرف ڈاکٹر آفندی سے ملنے آئی تھی اپنی بہن کی موت نے ماں کے بچھڑنے کی یاد تازہ کر دی - وہ خود کو تنہا محسوس کرتی تھی اور ڈاکٹر آفندی " برگد کی چھتنار چھاؤں " جو اسے اس آفت سے بچا سکتے تھے - مگر اس خوبصورت لمبے اس حسین لڑکی کے سامنے وہ بے حس سے ہو گئے جیسے ان کے دل کا ہر جذبہ اور ہر امنگ مر چکی ہو وہ اس مشین کی طرح ہیں جس میں کسی عورت کے احساسات سمجھنے کا شعور ہی نہیں - یہ ایک بار تو نہیں ہوا تھا - کتنی ہی بار وہ سنگ دل بے حس اور لاپروا بنے رہے -

اس بات کو پندرہ سال گزر گئے مگر اب گزری عمر کے لمحوں کے ساتھ کبھی کبھی وہ بچھڑی محبتوں کی پیش کش یاد آتی تو وہ سوچ کر رہ جاتے - شاید وہ گزری باتیں زبانِ حال سے انہیں کہہ رہی ہوں آپ بزدل تھے ، ڈرپوک تھے مگر وہ لڑکیاں بڑی جرأت مند تھیں - جنہوں نے اپنے دل کا حال تو کہہ دیا تھا - اگرچہ فتح و شکست نصیبوں کی بات تھی -

یہ ساری باتیں اتنے سالوں کے بعد کیوں یادوں کے دریچوں سے جھانک رہی ہیں - شاید ان یادوں اور باتوں کی کڑی آج کے کسی واقعے سے آ ملتی ہے - وہ سب لڑکیاں تھیں اور رضوانہ بھی ایک لڑکی ہے - وہ لڑکیاں بھی بے گناہ تھیں اور رضو بھی معصوم ہے جو پیدا ہوتے ہی عدالت

میں لائی گئی اور مبہم قرار دے دی گئی۔ دولت مند گھرانے کی دہلیز کے نیچے گہری کھائی میں لڑھکا دی گئی۔ جہاں بیماری اور موت کا راج تھا۔ صرف اس لئے کہ وہ اپنے والدین کی توقع کے مطابق حسین اور نظر نواز نہ تھی۔ اس کا رنگ سنگ مرمر کی طرح سفید نہ تھا۔ جس کی شکل ماں باپ میں سے کسی سے مشابہ نہ تھی۔

شاید کچھ لوگوں کو محبت شفقت اور اپنے خون کے مقابلے میں اپنی جھوٹی آن اور چاہت عزیز ہوتی ہے۔ اسی لئے تو رضوانہ کو انہوں نے موت کے لبے جس ہاتھوں میں سونپنے کے لئے کہہ دیا تھا۔ اس وقت ڈاکٹر آذر کو بچی کی قبر کی گہرائی ٹھنڈی بھیانک لگی اور سلیم میاں کا غریب خانہ دکھائی دیا۔ جہاں بیس سالوں سے کسی بچے کی کلکاری سنائی نہ دی تھی اور اس نادر عطیہ پر سلیم اور زیب النساء کا دل فرطِ انبساط سے اچھل اچھل گیا۔ انہیں اظہارِ ممنونیت کے لئے الفاظ نہ مل سکے۔ ان کی نظر میں ڈاکٹر آذر اس فرشتے کی طرح تھے جنہیں خدا نے صرف بچی دینے کے لئے بھیجا ہے۔ پھر ڈاکٹر آذر سے سلیم میاں نے بچی کا نام رکھنے کے لئے مشورہ کیا۔

"میں تو گڑیا ہی کہوں گا آپ جو مرضی ہو نام رکھ دیں۔"

"میرے دل میں عرصے سے خواہش تھی کہ خدا ہمیں بیٹی دے تو میں اس کا نام رضوانہ رکھوں گی"

زیب النساء نے گویا برسوں سے دل کی ڈھکی چھپی خواہش بیان کر دی۔

"بہت پیارا نام ہے۔" سلیم میاں کے علاوہ ڈاکٹر آذر نے بھی یہ نام بچی کے لئے بہت پسند کیا۔

جب سے رضوانہ سلیم میاں کے گھر آئی تھی۔ گاہے گاہے ڈاکٹر آذر ہفتے میں ایک آدھ دفعہ اس کا حال پوچھنے آتے۔ کبھی کبھی مٹھائی یا کوئی تحفہ اس کے لئے لے جاتے۔ ڈاکٹر کو احساس ہوتا جیسے روزِ اول سے ہی رضوانہ نے ان کے دل میں بیٹی کی جگہ پائی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں جو کچھ ہو سکا رضوانہ کے لئے کریں گے تاکہ وہ اس دنیا میں ایک باوقار اور کامیاب انسان کی طرح زندگی گزار سکے۔

انہیں کبھی یوں لگتا جیسے رضوانہ ان کی اپنی بچی ہو۔ مہینے میں چار چھ مرتبہ وہ ننھی رضوانہ کو دیکھنے اور اسے پیار کرنے کے لئے چلے جاتے۔ ان کی بے بی کار غریب محلے کی گلی کے موڑ پر آ کر رکتی اور بے شمار پھول، پھل، مٹھائی، فراک اور کھلونے وہ گڑیا کے لئے لاتے۔ اسے صحت مند ہنستے مسکراتے دیکھ کر ان کے دل کو ایک گونا سکون محسوس ہوتا جیسے بچپن کی ایک محرومی کی تلافی ہو گئی ہو۔ وہ چھ مہینے کی ہوئی تو ڈاکٹر چچا کو خوب پہچاننے لگی کئی مرتبہ وہ اسے دس پندرہ منٹ کی سیر کے لئے اپنی گاڑی میں باہر بھی کھلی ہوا میں لے جاتے۔

رضوانہ تین سال کی ہوئی تو ہر اتوار کو ڈاکٹر چچا کی آمد کا انتظار کرتی۔ اگر کسی خطرناک کیس کی وجہ سے یا اچانک کسی ایمرجنسی کیس کے سلسلے میں ڈاکٹر کسی اتوار کو نہ آ سکتے تو ننھی سی بچی اپنی حق تلفی سمجھ کر روٹھ جاتی۔

”مٹھائی بھی نہیں لوں گی۔ کیلا بھی نہیں کھاؤں گی۔ آپ اتوار کو کیوں نہیں آئے ؟“

ڈاکٹر آفندی اس کی اس معصومانہ شکایت پر اسے گود میں اٹھا کر پیار کرتے۔ اس کی پیشانی چومتے اور وعدہ کرتے آئندہ اتوار کو چھٹی نہیں ہوگی اور پھر وہ مان جاتی۔

پانچ سال کی عمر میں وہ سکول جانے لگی۔ ایک اتوار کو پھر ڈاکٹر آفندی رضوانہ کو دکھائی نہ دیئے لیکن اگلے دن وہ خود ہی وضاحت کرتے آ گئے۔

”میری گڑیا رانی اگر میں یہاں آ جاتا تو ایک آدمی میرے نہ ہونے سے مر جاتا !“

”تو کیا وہ آدمی بچ گیا ہے ؟“

رضوانہ کا دل طوفانی ہواؤں میں پتے کی طرح کانپنے لگا۔

”ہاں گڑیا ! میں نے اپنا فرض پورا کیا اور وہ آدمی ٹھیک ہو گیا !“

وہ یوں خوش ہوئی جیسے اس اجنبی مریض سے اس کا دلی تعلق ہو۔

اب تو وہ اردو اور انگریزی کا سبق اتوار والے کو باقاعدگی سے اپنے ڈاکٹر چچا کو سناتی اور انعام میں کچھ نہ کچھ وصول کرتی۔

سلیم میاں اور زیب النساء ایسی ہونہار اور فرمانبردار بیٹی پر نازاں تھے۔ انہیں خبر تھی کہ اس کی زبان کی درستی اور تربیت میں ڈاکٹر آفندی کا کتنا بڑا ہاتھ ہے۔ ہر اچھے کام پر وہ اسے چھوٹی چھوٹی چیزوں کے تحفوں سے نوازتے۔ عید، تہوار کے موقع پر ڈاکٹر ان کے گھر جاتے۔ یہ گھر جہاں غربت تو تھی مگر اپنائیت اور محبت کی گرم جوشی نے انہیں کبھی اجنبیت محسوس نہیں ہونے دی۔

چھ آٹھ سال کی عمر میں ہی وہ رسالے کتابیں پڑھنے لگی۔ وہ ذہین تھی۔ بہت کچھ جاننے اور سیکھنے کی مشتاق تھی۔ گھر کا ماحول وسیع نہ تھا۔ محلے کے لوگ یا تو مزدور تھے یا فیکٹری ورکر جو دن بھر کی ناکامی اور مایوسی کو شام کے وقت سستی قسم کی شراب میں ڈبوتے اور ہر شام گرد و نواح کے گھروں سے تلخ کلامی اور ہر قسم کی گالیاں اور ہاتھا پائی کا منظر دیکھنے میں آتا۔ بیویاں لڑ جھگڑ کر اپنے میکے چلی جاتیں اور فیکٹری ورکرز کی زندگی میں اور بھی تلخی گھل جاتی۔

گو اس بات کو دس برس گزر گئے مگر ڈاکٹر آفندی کو جب کبھی تنہائی کا لمحہ ملتا انہیں رضوانہ کے مستقبل کا خیال ضرور آتا۔ جہانگیر قدیر جیسے دوست کا خیال آتا اور ان سے وابستہ ساری باتیں یاد آتیں اور ان کے کراچی جانے سے ایک ہفتہ پہلے ان کی ایک سالہ بچی شبیبہ کی سالگرہ پارٹی کی شان و شوکت ان کا جگر شق کر دیتی۔ شبیبہ تو سنگ مرمر کی مورتی، ملکوتی حسن والی گڑیا انہیں یاد تھی۔ مگر اپنی رضو تو ایک انسان ہے۔ سانولی سلونی سی مگر دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یہ فرق میری منی گڑیا خدا کرے کبھی نہ جان سکے۔ ورنہ احساسِ زہریلا ہے اگر تیرا ننھا سا دل برداشت نہ کر سکا تو وہ دن میری زندگی کا بدترین دن ہوگا۔

رضو پانچویں کلاس میں تھی کہ اتنے چھوٹے سے گھر پہ آفت ٹوٹ پڑی۔ اس کے پیارے ابّو کو موسم سرما کے آغاز میں نمونیا ہو گیا۔ ان کے بوڑھے اور دبلے پتلے بدن میں بیماری اور بیرونی حملے کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ تو بس زندہ تھے۔ شاید وہ دس سال پہلے مر چکے ہوتے مگر جو نئی روح ان میں کام کر رہی تھی وہ رضو کو پانے کی خوشی تھی جو ان کے جسم کو روز فیکٹری لے جاتی اور شام ڈھلے واپس لاتی۔ انہوں نے تو بہت دفعہ اپنے حصے کا کھانا مٹھائی اور کپڑا بھی رضوانہ

کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ایثار و قربانی کا یہ چلتا پھرتا مجسمہ ڈاکٹر آذر کے سنبھالا دینے اور انتہائی کوشش کے باوجود بھی جانبر نہ ہو سکا۔

مرتے ہوئے سلیم میاں کے دل میں جانے کیا کیا ارمان تھے۔ رمنو بہت چھوٹی ہے۔ ان کی خواہش تھی۔ کم از کم وہ میٹرک کر لیتی تو وہ کسی بھی اچھے شریف لڑکے سے اس کا بیاہ کر دیتے ان کی پیاری بیٹی خوش رہتی تو ان کا دل بھی شاد اور مطمئن ہوتا۔ مگر رمنو ابھی گیارہ سال کی بھی نہیں تھی کہ موت کے فرشتے نے باپ کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔ زندگی کتنی مختصر ہے۔ ان کے بعد زینی اور رمنو پر کیا گزرے گی۔ سلیم میاں کی روح جیسے مضطرب سی تھی۔ سینے میں جیسے کوئی قیدی کبوتر اڑنے کے لئے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ان کا جسم درد و کرب کی انتہائی منزلوں پر تھا۔ یوں جیسے کسی شکنجے میں ان ہڈیاں ٹوٹنے لگی ہوں۔ پھر جیسے خاموشی چھا گئی اور اس کے ساتھ ہی سلیم میاں کا محض سرد اور بے جان جسم باقی رہ گیا۔ روح جانے کن وادیوں کی طرف پرواز کر گئی۔

سلیم میاں کو اور کئی محلہ داروں کی موجودگی میں ڈاکٹر آذر نے اپنے ہاتھ سے قبر کی گہرائیوں میں اتارا۔ ان کا دل رمنو کے تصور سے رو سا دیا۔ آہ یہ زندگی جس کو بچانے کے لئے انہوں نے حتی المقدور کوشش کی تھی۔ سلیم میاں کو دفنانے کے بعد وہ گھر کے ویرانے میں داخل ہوئے۔

"مجھے افسوس ہے رمنو! میں نے ہر ممکن کوشش کی مگر تمہارے ابو کا کمزور جسم اس بیماری کا مقابلہ نہ کر سکا۔"

"ہوں" وہ اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کی آبشاریں بہاتی ہوئی بولی "آپ ماہر ڈاکٹر ہیں آپ میرے بابا کو نہیں بچا سکے۔ آپ کو کچھ نہیں آتا" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ڈاکٹر آذر نے اسے بہت تسلی دینے کی کوشش کی "اس میں خدا کی کوئی مصلحت ہوگی"۔

"ہم غریب تھے! اس میں خدا کی کوئی مصلحت ہوگی۔ ہمارے بابا کو چھین لیا اس میں بھی ان کی کوئی مصلحت مجھے بتائیں۔ غریبوں پہ ظلم در ظلم ہوتا ہے۔ ان کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں وہ بھوکے ہوں ننگے ہوں۔ ساری مصلحتیں ہم غریبوں کے لئے کیوں ہیں؟"

ڈاکٹر آفندی کے دل میں ماضی کی بازگشت کی طرح ایک ننھی سی بچی کی سسکی گونجی۔

"ہاں رضو! میں بھی سوچتا ہوں۔ سارے دکھ تمہیں کیوں ملتے رہیں۔ مصائب کا ہر بار تم ہی کیوں نشانہ بنتی ہو"

"میں مجبور ہوں، کمزور ہوں، غریب ہوں، چھوٹی ہوں، میں کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میرے بس میں ہوتا تو اس شہر کی سب اونچی اور بلند عالی شان عمارتوں کو آگ نہ لگا دیتی"۔

"یہ تو تخریب پسندی ہوئی۔ میں اس بات کے لئے کبھی تمہاری حوصلہ افزائی نہیں کروں گا"۔

گھنٹے بھر تک رضو اور ڈاکٹر آفندی کی بحث جاری رہی اور زیبی اپنے گھر کے کمرے میں منہ چھپائے روتی رہی۔ آٹھ بجے ڈاکٹر کو ہسپتال جانا تھا۔ وہ جاتے ہوئے دونوں کو بہت تسلی دے گئے مگر رضوانہ کو پورا گھر وحشت زدہ محسوس ہو رہا تھا۔ اتنی بھیانک خاموشی اور تاریکی ہے اور یہ لالٹین کی روشنی کیسی زرد اور سوگوار سی ہے۔ ایک خوف نے اس کے جسم میں کپکپی طاری کر دی۔ وہ سردی اور خوف کے مارے اپنی ماں سے لپٹ کر رونے اور سسکیاں لینے لگی۔

"ہائے بابا! آپ کتنے اچھے تھے۔ آپ نے ہمیشہ میری ضرورتوں کا خود خیال رکھا۔ ہم آپ کو کہاں ڈھونڈیں؟"

شب کے پچھلے پہر کہیں جا کر اسے نیند آئی۔ آنسو اس کی گالوں پر سوکھ چکے تھے۔ وہ خواب میں ایک بار چونکی۔ وحشت زدہ نگاہوں نے تاریکیوں میں کچھ تلاش کیا اور چاروں طرف پھیلی خاموشیوں نے کچھ جواب نہ دیا گیا تو وہ تکیے میں منہ چھپا کر سو گئی۔ پھر کتنے ہی دن بڑے مصروف گزرے شوہر کی وفات پر زیب النساء کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ تفکرات نے ان کے چہرے پر کچھ اور شکنیں ڈال دیں۔ وہ اس مصائب کے دور میں بھی خوش تھیں۔ اپنی ہستی کو وہ اسی دن ہی پس پشت ڈال چکی تھیں جس دن رضوانہ انہیں ملی تھی۔ ایک جیتی جاگتی گڑیا کے روپ میں! اور یہ ہی جینے کا سب سے بڑا سہارا تھی۔ انہوں نے پوری کوشش کی۔ کہ رضو کو باپ کی محرومی کا احساس نہ ہو مگر اپنے باپ کی موت کے بعد وہ پھر سکول جانے لگی مگر اکثر وہ کھوئی کھوئی رہتی۔ کوئی بلاتا تو اس

کی طرف دیکھتی رہ جاتی، زبان سے کچھ نہ کہتی۔ پہلے وہ اپنی امی سے سینکڑوں سوال کیا کرتی تھی۔ مگر اب باپ کی موت نے اس کے سوچ و فکر پہ بھی گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ قنوطی سی ہو کر سوچتی۔ یہ بایوسیاں ناکامیاں موت کی اندھی کھائیاں شاید ہمیشہ اس کے مقدر میں ہی لکھی ہوں تو کسی کا کیا قصور؟

اس عمر میں جبکہ لڑکیاں بہت شوخ اور کھلنڈری ہوتی ہیں۔ شرارت ان کی آنکھوں سے جھانکتی ہے۔ ان کی شوخیاں سے ماں باپ کو خوف آتا ہے۔ ان کی موجودگی گھر میں ہنگامے کی پیامبر ہوتی ہے۔ اس عمر میں رضوانہ کتنی سنجیدہ اور کم گو تھی۔ اس کا تخیل ہمیشہ اونچی فضاؤں اور بادلوں کا ہم رکاب ہوتا۔ نیلے آسمان گورے بادلوں اور چاند سے اسے عشق سا تھا۔ چاند کو وہ اپنا دوست سمجھتی تھی۔ ایک دن وہ آرام کرسی پہ بیٹھی اپنی تاریخ کی کتاب پڑھ رہی تھی کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ آسمان پہ تیرتے ہوئے بھورے بادل کا ایک حصہ بن گئی ہے جس کے کنارے سورج کی کرنوں کو چھو کر سنہرے ہو گئے ہیں۔ وہ بلندی پہ اڑتی چلی جا رہی ہے۔ گلیوں میں رینگتے مٹی میں لتھڑے نیچے اسے حیرت و مسرت کے احساس کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ اس کی اپنی گردن غرور فخر اور احساس برتری اونچی ہو گئی ہے مگر ایسے ہی کسی لمحے اچانک ہی اس کا وجود بادل سے ٹوٹ کر گر پڑا اور وہ زمین پہ آ رہی۔ بادلوں سے ٹوٹ کر اسے بہت چوٹیں آئیں۔ ابھی وہ بے بسی کی حالت میں گرم سڑک پہ پڑی تھی کہ ایک طرف سے تیز رفتار کار اسے کچلنے کے لئے آ رہی تھی۔ دوسری طرف ایک میلے کچیلے کپڑوں والی غریب سی بڑھیا نے اس کرنوں کے لباس والی لڑکی کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور بولی:

"کیسی معصوم بچی ہے۔ کس ظالم نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔"

وہ اس کمسنی میں بھی احتجاج کر بیٹھی۔

"نہیں نہیں، میں انسان کہاں ہوں۔ میں تو سنہری کرنوں کے ہار والی شہزادی ہوں۔ میرا مقام بادلوں پہ ہے۔ میں اس زمین کی کہاں ہوں؟"

بوڑھی عورت نے اسے تسلی دے کر سمجھایا "بلندیوں پر سبھی خواب دیکھتے ہیں۔ مگر بادل

میں اسی زمین کی پیداوار ہیں، یہیں پیدا ہوئے، یہیں مریں گے۔ مگر بیٹی تو میری ہے۔ میری زندگی ویرانے کی بازگشت تھی مگر تیرے ملنے سے میرے آنگن میں نغمے گونج اٹھے ہیں۔ دیکھ میرے دل میں تیرے لیے کتنی گرمی اور محبت ہے۔"

عورت کا چہرہ ایک سوال بن گیا تو اس کے دل سے نہیں نہیں کی آوازیں نکلیں مگر اس کا یخ بستہ پانیوں میں ٹھٹھرا ہوا جسم اس بوڑھی عورت کے جسم کی محبت بھری حرارت سے جی اٹھا، تبھی وہ چلا پڑی۔

"ماں! میں تمہارے ساتھ رہوں گی کبھی یہاں نہ جاؤں گی۔"

اگرچہ زیب النساء کو رضوانہ کی خاطر سبھی کام کرنے پڑتے اور وہ خوشی سے کر بھی رہی تھی۔ مگر وہ جسمانی طور پر خالی ہو چکی تھی، شوہر کی ناگہانی موت نے اس کی کمر جھکا دی تھی۔ مگر رضو کی محبت اور چاہت اس کے جینے کا بہانہ تھی۔ ایک دفعہ ایسی بدحالی آئی کہ ڈاکٹر آفندی نے رضو کا واسطہ دے کر مالی امداد کرنے کی پیشکش کی۔ مگر زیبی غریبی میں خودی کی نگہبانی کرنے والی عورت تھی۔

"نہیں آفندی بھائی! ابھی مجھ میں کچھ کرنے کی ہمت باقی ہے۔"

ڈاکٹر نے ایسی چٹان کی طرح ٹھوس ارادہ اور موم جیسا دل رکھنے والی خوددار عورتیں کم ہی دیکھی تھیں۔ اس بڑھاپے میں وہ دو ایک گھروں میں معمولی سے معاوضے پر بچوں کو قرآن پڑھانے اور لڑکیوں کو سلائی کڑھائی سکھانے جاتی اور اس معاوضے میں ماں بیٹی کا گزارہ مشکل سے ہوتا۔ اوپر سے رضو کی تعلیم اپنی جگہ ضروری تھی۔ ڈاکٹر آفندی کی کسی مدد کو کبھی زیبی نے اپنی خودداری کے لیے چیلنج سمجھا تھا۔ ان کا تو بس یہ جی چاہتا تھا کہ رضوانہ کو پالنے اور اسے پڑھانے میں اپنے سر پہ تنگ اور مصائب کا پہاڑ اٹھا کر وہ یہ بات سچ ثابت کر دے کہ سچی لگن اور محبت اپنے خون اور اپنی جنی ہی کے لیے ہی نہیں بلکہ اس بچے کے لیے بھی ماں کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے جسے جنم کسی اور نے دیا ہو مگر پالنے والی اور ماں ہو۔

اس بھری دنیا میں سندا کے بعد ان کی نظر میں سب بڑے محسن ڈاکٹر آفندی تھے۔ جنہوں نے

انہیں اور ان کے شوہر سلیم میاں کو بڑھاپے اور مایوسی کی دہلیز پر سسکتے ہوئے ان کی سونی سونی خالی آغوش کو معصوم سی بچی کی شرارتوں اور قہقہوں سے بھر دیا تھا۔

"اللہ کیا دنیا میں ایسی سندر مورت بھی کوئی ہوگی!" بار بار محبت سے رضوانہ کی ڈھیروں بلائیں لے ڈالتیں۔

جب کبھی ڈاکٹر انور رضو کے لئے کوئی تحفہ یا ضرورت کی کوئی چیز لے کر آتے تو زیب النسا کہتی "ڈاکٹر بھائی! آپ تکلیف نہ کیا کیجئے۔"

"آپ مجھے غیر نہ سمجھئے۔ رضو مجھے اپنی بچی کی طرح پیاری ہے۔ اسی کے بہانے ہفتے میں بازار چلا جاتا ہوں اور اس کے لئے کچھ لا کر مجھے انتہائی خوشی ہوتی ہے۔"

یہی نہیں رضوانہ بڑی اپنائیت اور محبت سے اپنے ڈاکٹر چچا سے چھوٹی چھوٹی فرمائشیں کرتی اور اپنی چیزیں پا کر بہت مسرور ہو جاتی جیسے ڈاکٹر چچا نے اسے بہت کچھ دے دیا ہو۔ بڑے معصوم انداز سے وہ اپنے اسکول کی روداد اور سہیلیوں کی باتیں انہیں سنایا کرتی۔

وہ ساتویں جماعت میں ہوئی تو ڈاکٹر انور نے امتحان میں امتیازی کامیابی پر حوصلہ افزائی کے لئے تحفے میں اسے خوبصورت سوئیٹر اور فاؤنٹین پن دیا۔ دونوں چیزیں پا کر وہ خوشی سے نہال ہو کر ڈاکٹر چچا کے گلے میں جھول گئی۔

"اوہ میرے اچھے چچا آپ کو میرا کتنا خیال ہے۔"

"اچھا یہ تو بتاؤ ہماری بیٹی بڑی ہو کر کیا بنے گی؟"

"ڈاکٹر بنوں گی۔" وہ ایک بار پہلے بھی اسی سوال کا یہی جواب دے چکی تھی۔

"بڑی مستقل مزاج ہے ہماری رضو ـــ جب زیب بہن پچھلے سال میں نے یہی سوال کیا تھا تو اس نے یہی جواب دیا تھا۔"

زیب النساء کا چہرہ پچھلے سال کے مقابلے میں اس سال بڑا متفکر سا ہو گیا۔ وہ قریب ہو کر بولیں

"ڈاکٹر بھیا! اس کی بچپن والی باتوں پہ دھیان نہ دیا کیجئے۔ بڑی ایچ ایس سی میں آ گئی رہتی ہے۔

کہتی ہے امریکہ اور روس والے چاند تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ میری تو اب یہی تمنا ہے کہ یہ میٹرک تک پڑھ لے تو کوئی اچھا سا شریف لڑکا دیکھ کر لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دوں۔"

ڈاکٹر آذر زیر لب مسکرا کر رہ گئے۔ مگر گیارہ بارہ سال کی عمر میں ہی وہ بڑی بے باک سی تھی بڑے ناز سے بولی:

"ہاتھ پیلے کرنے کے لئے تو دو پیسے کا رنگ کافی ہے۔ بلکہ ایک دوپٹہ بھی اس سے رنگا جائے گا۔ ہاں اس مرتبہ عید کے موقع پر میں نے مہندی نہیں لگائی تھی۔ میں کل بازار سے مہندی لے آؤں گی۔ لگو سردیوں کے موسم کیا مہندی کون لگائے۔ نہیں تو گرمیاں آئیں گی تو دیکھا جائے گا مہندی لگانے کے لئے عمر پڑی ہے۔ مگر میں امی کی خاطر مہندی لگاؤں گی اور میرے اچھے ڈاکٹر چچا! آپ مجھے ڈاکٹری میں داخلہ ضرور لے کر دیجئے گا۔ ایک دن اس راستے سے گزرتے ہوئے آپ بتایا تھا کہ وہ جو بڑی اونچی سفید گنبدوں والی عمارت ہے وہ میڈیکل کالج کی ہے۔ وہاں دور دور سے لڑکے لڑکیاں پڑھنے آتے ہیں۔ میں بھی ان کی طرح برف جیسا سفید کوٹ پہنوں گی۔ اور ڈاکٹر بن کر بیماروں کا علاج کروں گی۔"

"پگلی ہے میری بیٹی! تو تو کچھ نہیں سمجھتی جو جی میں آتا ہے بول دیتی ہے۔"

زینب نے محبت کی نگاہوں سے اپنی سانولی سلونی سنجیدہ سے چہرے والی بچی کو دیکھا۔ جو اتنی سی عمر میں بہت کچھ معلوم کرنا چاہتی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی۔

"بیٹی! ہم تو ابا ہیچ میں تمہیں پڑھا کیسے سکھائیں گے ——— یہ راہ تو بڑی لمبی ہے، جانے کہاں لے جاتی ہے۔"

رضوانہ اگر عام سی معمولی ذہن والی سو آئی کیو والی بچی ہوتی تو اس کی ضرورت پوری کرنا کچھ مشکل نہ ہوتا اور زیبی جیسی سیدھی سادی رضو سے چار دہائیاں پہلے پیدا ہونے والی خاتون کے لیے اسے اپنی سوچ کے سانچے میں ڈھالنا آسان ہوتا ہے۔ مگر وہ تو صرف روٹی کھانے اور تن ڈھانکنے کے لیے زندہ نہ تھی۔ وہ تو بہت کچھ پانا، بہت کچھ جاننا چاہتی تھی۔ اس کے دماغ میں سوالوں کا ایک جم غفیر تھا اور گزرتے دنوں کے ساتھ زیبی کو روزگارِ زمانہ نے اتنی مہلت کہاں دی تھی کہ وہ یہ سوچ سکیں کہ دنیا میں روٹی کپڑے کے علاوہ اور بھی کوئی سوچنے کی بات ہے۔ انہیں کیا خبر تھی۔ یہ جو عام سی شکل والی لڑکی ہے۔ اس کے اندر کی دنیا اتنی ہی انوکھی اور عجیب ہے۔ بظاہر کوئی خاص بات نہ ہونے کے باوجود اس کی سوچیں قطار در قطار سوالات کے جواب چاہتی ہیں۔ اس کے چہرے پر ان جانی فکروں کے سائے لہراتے ہیں۔ یہ آٹھویں جماعت میں پڑھنے والی رضوانہ ہفتے بھر تک ذہن میں جمع ہوتے سوالوں کو ایک کاغذ پر لکھ لیتی اور اتوار یا جمعہ کا انتظار کرتی۔ جس دن اس کے پیارے چچا آتے تو رسمی سی باتوں کے بعد زیب النساء تو چائے بنانے لگ جاتیں مگر رضو کی باتوں کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔ کئی بار باورچی خانے سے زیبی اسے ٹوکتیں۔ ”یہ کیا بدتمیزی ہے ڈاکٹر صاحب تھک ہار کر آتے ہیں، چین سے لمحہ بھر کو بیٹھنے دیا کرو۔“

”ہماری استانی نے کہا تھا جو لمحہ بیت جائے پھر لوٹ کر نہیں آتا۔ میں کیوں وقت ضائع کروں؟“

"تم تو بیس پچیس گھنٹے پڑھتی ہو"

"آپ کون سا مجھے کالج پڑھائیں گی" رشو بڑبڑائی۔

"ہم تمہیں پڑھائیں گے۔ تم دل چھوٹا نہ کرو" ڈاکٹر چچا کے حوصلہ دلانے پر وہ پھر اسی موضوع کی طرف پلٹ آئی۔

"میرے پچھلے سوال کا جواب آپ نے ڈکشنری سے ڈھونڈ لیا ہو گا"

"پاکستان اور آسٹریلیا کے موسموں میں اتنا تضاد کیوں ہے؟ ہمارے یہاں شام ہوتی ہے اور امریکہ میں صبح ہوتی ہے"

ڈاکٹر قدیر اپنی وسیع معلومات کی روشنی میں جغرافیائی اور تاریخی نقطہ نظر سے ہر بات کی وضاحت کرتے۔ ایک دو سوالات کے جواب سن کر وہ مطمئن نہ ہوتی۔ سوال پر سوال کئے جاتی۔

"اردو ہماری قومی زبان ہے تو انگریزی پڑھنا کیوں ضروری ہے؟ کیا یہ ذہنی غلامی کی نشانی نہیں؟ کیا کوٹ پتلون پہننے والے مہذب لوگ ہوتے ہیں۔ کیا میرے بابا دھوتی پہننے کی وجہ سے غیر مہذب تھے؟"

"دراصل انگریزی انٹرنیشنل زبان ہے اور ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے۔ اسلام جہاں جہاں پھیلا وہاں لوگ عربی جاننے لگے۔ انگریزوں نے جہاں جہاں حکومت کی انگریزی وہاں بولی جانے لگی سائنس اور ٹیکنالوجی میں جتنی ترقی ہوتی ہے اس کا لٹریچر انگریزی زبان میں پہلے شائع ہوتا ہے، پہلے ریسرچ ہوتی ہیں جو انگریزی زبان میں کام کرنے والے بہت سے عالم اور سائنس دان ہیں۔ اردو میں ریسرچ کا کام اور تراجم پر بہت پیسہ خرچ آتا ہے۔ اس لئے ہم خود ریسرچ کا کام کرنے کے مقابلے میں انگریزی سے بالواسطہ علم حاصل کر لیتے ہیں۔ ہمارے ملک کے طلباء ڈاکٹر اور انجینئر عالمی دنیا میں اُٹھے ملی ممالک کے برابر ہیں مگر جتنے بھی ہیں وہ مغربی ممالک میں اعلیٰ تعلیم صرف اسی وجہ سے حاصل کر رہے ہیں کہ ان کا ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔ اس پر بھی ہمارے بہت سے طلباء مغربی ممالک میں صرف زبان کی کمزوری کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوتے۔ حالانکہ وہ بھی اس ملک کے طلباء جتنے ہی ذہین ہوتے ہیں"

"ارے تم سیاست کی باتیں چھوڑو چلو ڈاکٹر بھیا کو چائے پینے دو" زیبی نے درمیان میں کھنڈت ڈال دیا۔

سچ تو یہ تھا کہ ڈاکٹر نہ صرف تفصیلاً اس کی معلومات میں اضافہ کرتے بلکہ ادب و اخلاق کی اچھی اچھی مثالیں بھی دیتے۔ وہ اس میں صبر و تحمل اور بردباری کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے وہ ہر سال یا اس کی سالگرہ کے علاوہ عید شب برات پر اسے مذہبی رہنماؤں اور دنیا کی محنتی اور عظیم ہستیوں کی زندگی کارناموں کی کتابیں لاکر دیتے۔ یہی نہیں وہ اسے کہانیاں بھی سناتے۔ اتنی ساری معلومات جان کر بھی ڈاکٹر آفتاب نے اس کے دل و ذہن کی دنیا کی مضطرب کیفیت اس کے چہرے پر اکثر جھلکتی دیکھی۔

ایک دفعہ پندرہ بیس روز تک ڈاکٹر آفتاب کو ہسپتال میں گاڑی کے ایک حادثے کی وجہ سے بہت مصروف رہنا پڑا۔ کافی احتیاط اور کوشش کے باوجود دو بیمار مریض ہوئے مر جاتے اور ڈاکٹر آفتاب چاہنے کے باوجود رضو کو دیکھنے نہ جاسکے ۔۔۔ انہیں پتہ تھا۔ اتنے عرصہ تک نہ آنے کی وجہ سے رضو شکوؤں اور شکایتوں کا پہاڑ کھڑا کر دے گی اور بہت منانے کے بعد مانے گی۔

اس شام ڈاکٹر آفتاب گھر میں داخل ہوئے۔ ان کی آنکھیں بے خواب سی تھیں۔ مگر انہوں نے دیکھا رضو ایک کرسی پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی ہے۔ اس کی امی سل بٹے پر شام کی ہانڈی کے لیے مصالحہ بنا رہی تھیں۔ دروازے پر دستک دے کر ڈاکٹر آفتاب گھر میں داخل ہوئے

"اسلام علیکم!" وہ قدرے بلند آواز میں بولے۔

"ارے آپ ڈاکٹر بھائی! آیئے آیئے" زیب النساء کام چھوڑ کر آنچل سے سر کو ڈھانپتی ہوئی کرسی بڑھانے لگیں۔

"سنایئے کیا حال ہے! معلوم ہوتا ہے ہسپتال میں گاڑی کے حادثے کی وجہ سے کام بہت بڑھ گیا ہوگا"

قبل اس کے کہ ڈاکٹر آفتاب جواب دیں۔ رضو روٹھتے ہوئے بولی:

"جائیے ڈاکٹر چچا! میں آپ سے نہیں بولتی۔ آپ اتنے دن تک نہیں آئے۔"

"رضو! میری غیر حاضری ایک مجبوری سمجھو۔ گاڑی کے حادثے اور کئی پرانے اپریشن کی وجہ سے مجھے زیادہ تر اپریشن تھیٹر میں ہی رہنا پڑا۔ اس دوران کئی بار سوچا تھوڑی سی فرصت مل جائے تو اپنی گڑیا بیٹی کا حال پوچھ آؤں۔ مگر کوشش کے باوجود نہیں آ سکا۔ ہاں میرے لئے کیا سزا تجویز کر رہی ہو؟"

آخری بات سن کر زیبی باورچی خانے سے چلائیں۔

"رضو! کتنی مدت کے بعد تمہارے ڈاکٹر چچا آئے ہیں۔ اب زیادہ سوالات کر کے پریشان نہ کرنا کچھ دیر دم لینے دو۔ میں چائے لے آؤں تو تم اپنا کام شروع کرنا۔"

"امی! میں تو کچھ بھی نہیں کہتی۔ چچا جان خود اتنے دنوں تک نہ آنے کی وجہ سے سزا چاہتے ہیں اور میں کہتی ہوں۔ بھلا آپ کو ہم کیا سزا دے سکتے ہیں!"

"شاباش بیٹی! گستاخی کی کوئی بات نہ کرنا ورنہ تمہارے چچا کہیں گے کہ یہ ساری بدتمیزیاں ضرور اس کی ماں سکھاتی ہوگی۔"

"توبہ کیجئے زیبی بہن میں بھلا ایسے سوچ سکتا ہوں۔"

"ڈاکٹر چچا مجھے بتائیے یہ کالے گورے کا کیا سلسلہ ہے۔ کل اخبار میں لکھا تھا۔ ہزاروں کالے لوگوں کو امریکہ میں گولی نشانہ بنا دیا گیا۔ کیا صرف اس لئے انہیں مار دیا گیا کہ وہ کالے تھے۔ اور مشرقی پاکستان میں صرف اس لئے بے شمار مغربی پاکستان کے پنجابیوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان کے گھر بار لوٹ مار لئے گئے، وہ بنگلہ بھاشا کی بجائے اردو بولتے تھے۔ اپنے ہی وطن میں لٹ جانا کتنا بڑا المیہ ہے۔ ہے نا! ڈاکٹر چچا آپ بتاتے کیوں نہیں۔ ایک تیسرا سوال ان دو باتوں کو سوچ کر میرے ذہن میں پیدا ہوا ہے۔ آپ مجھے بتائیں۔"

"نہیں رضو! تیسرا سوال مجھے پتہ ہے تمہاری اپنی ذات کے متعلق ہے۔ ضروری نہیں، تمہارے پہلے دونوں سوالوں کے ساتھ تیسرے کا جواب بھی دے سکوں۔"

"آپ کو سوال تو بتایا نہیں اور جواب کے لیے آپ فکر مند ہو گئے ہیں۔ مجھے پتہ ہے آپ ہر سوال کا جواب جانتے ہیں۔"

"امریکہ میں قتل و غارت گری اور مشرقی بنگال میں انسانوں کو زندہ جلانا وہاں کے باشندوں کی تنگ نظری اور تعصب کی نشانی ہے۔ امریکہ کے ماہرین نفسیات کالے لوگوں میں احساس کمتری پیدا کرنے لیے ان کا آئی کیو سفید لوگوں کی نسبت کم بتاتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کے بنگالی مغربی پاکستان خصوصاً پنجاب کے لوگوں کی ذہانت ان کی قابلیت اور کئی لحاظ سے برتری اپنے صوبائی تعصب کی وجہ سے تسلیم نہیں کرنا چاہتے۔ وہ اردو سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے اردو کو قومی زبان سمجھ لیا گیا تو ان کی بنگلہ بھاشا ختم ہو جائے گی اور کئی قسم کی معاشی، سماجی اور سیاسی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے ہم مشرقی اور مغربی پاکستان کے لوگوں میں اختلافات رہا ہے۔ حالانکہ ہم تو سارے مسلمان ہیں۔ اسی تعلق کے تحت علامہ اقبال رح نے کہا تھا۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر

مصر کے کرنل ناصر نے تو کہا تھا۔ "ہم عرب پہلے ہیں مسلمان بعد میں ہم لوگ مسلمان تو ہیں مگر عرب نہیں — بھلا ہم عرب کیوں نہیں؟"

"یہ تو بڑی سادہ سی بات ہے کہ جو شخص جہاں پیدا ہوگا۔ وہی اس کی قومیت ہوگی اور قومیت کبھی کبھی مذہب پر سبقت لے جاتی ہے۔ یہ ایک المیہ ہی تو ہے۔"

"امریکہ میں ماہرین نے ذہنی تجربات کر کے ثابت کیا ہے کہ کالے لوگ سفید لوگوں سے کم ذہن ہوتے ہیں۔ کل ہی میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔"

"سفید لوگوں نے اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے لئے یہ کیا ہے تاکہ کالے لوگ احساس کمتری کا شکار رہیں اور ان کے برابر حقوق کا مطالبہ نہ کریں۔"

"مجھے بتائیے کیا کالا ہونا جرم ہے؟"

"رشنو! تمہیں ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔ تم میٹرک اچھے نمبروں سے پاس کرو تو تمہیں ایف ایس سی میں داخلہ لے دیں اور پھر تم ڈاکٹر بن جاؤ۔"

"کالے لوگ تو کند ذہن ہوتے ہیں اور میں ——"

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ڈاکٹر انور نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تمہیں ایسی بے ہودہ باتوں پہ یقین کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"میرے دماغ میں بے شمار سوال ہیں۔ کبھی دفعہ ایک ہی بات ذہن میں چکر کاٹتی ہے اندھیرے میں چمگادڑ کی طرح۔"

"ہر چیز کے بارے میں سوچنا، جاننا اور محسوس کرنا اچھی بات نہیں۔"

ڈاکٹر انور نے جیسے اس کی سوچ پہ پہرہ بٹھانا چاہا۔

"اس میں آخر برائی کیا ہے؟" رشنو چڑ سی گئی۔

"احساس اور فکر کی آخری حد ذہن کی خرابی تک پہنچا دیتی ہے۔"

"دکھوں کی آخری منزل نجات پر ختم ہوتی ہے۔"

"ایسے قنوطی انداز میں نہ سوچا کرو۔" ڈاکٹر انور نے ایک بار پھر اسے ٹوکا۔

"ہماری ٹیچر کہتی ہے کہ زیادہ غور و فکر کرنے والے لوگ فلسفی اور حقیقی ہوتے ہیں۔"

"سارے لوگ سچ نہیں بولتے۔"

"یہ بھی تو ایک قسم کا تعصب ہے کہ بغیر چھان بین کے ہم دوسروں کو جھوٹا کہہ دیں۔ کیا یہ اچھی بات نہیں کہ دوسروں کے بارے میں اچھی رائے رکھیں مگر آپ مجھے باتوں میں نہیں الجھا سکتے میں ہر بات کی تہہ میں جانا چاہتی ہوں۔"

"بھئی حقیقت پسند ہو گئی ہے ہماری بیٹی!" ڈاکٹر انور شوخی سے بولے۔

اتنے میں زینی چائے لے آئی۔ ساتھ میں نمکین بسکٹ بھی تھے۔ چھوٹی سی میز پر پیالیاں رکھ کر چائے بنانے لگی۔ ڈاکٹر نے ایک بسکٹ رشنو کی طرف بڑھایا۔

"لو یہ بی بسکٹ کھاؤ غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"میں بچی نہیں ہوں۔" وہ بلی کی طرح غرائی۔

"اچھا بڑی بی، بزرگ، حضرت، یہ خطاب مناسب ہے؟"

رضو زبان کو دانتوں میں دبا کر زیر لب مسکرائی۔

ایک لمحہ خاموشی سے صورت حال کا جائزہ لے کر زیبی نے کہا۔

"جانے کس مٹی کی بنی ہوئی ہے یہ لونڈیا۔ کسی بات کو نہ سمجھتی ہے نہ سوچتی ہے جو جی میں آتا ہے کر گزرتی ہے۔"

"انٹیلیکچوئل لوگوں کی نشانی ہے کہ وہ دوسروں کی بنائی ہوئی راہوں پر نہیں چلتے۔" ڈاکٹر آذر کسی بہانے اسے ہنسانا چاہتے تھے۔

"بھلا یہ عمر ہے ایسی سنجیدہ بحثیں کرنے کی۔"

وہ کسی گہری سوچ میں کھو سی گئی۔۔۔ پھر خود ہی بولی۔

"کیا میں کھلونوں سے کھیلنے کی عمر میں ہوں؟"

"نہیں صاحب آپ کو تو اس عمر میں حج کرنے کے لئے چلے جانا چاہیے۔ کہو تو تمہارا پاسپورٹ بنوا دوں؟"

"اس دیار میں وہ لوگ جاتے ہیں، جنہیں سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے اور مجھے وہاں جا کر بھی سکون نہ ملا تو؟"

وہ سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"رضو! بعض باتوں کا آدمی کے لئے نہ جاننا ہی اچھا ہوتا ہے۔ یہ رنگ و بو کی دنیا کبھی کبھی اپنے دامن میں اتنا تلخ زہر چھپائے ہوتی ہے کہ اس سچ کی ہلکی سی کرن بھی آدمی کے دل میں خنجر کی نوک بن کر اتر جاتی ہے اور تمہارا دل بڑا معصوم اور نازک ہے۔ وہ پردہ بڑا خوبصورت ہوتا ہے جو ہر بد صورتی کو چھپا لیتا ہے۔"

مالوزمنو کے سینے پر خنجر سا لگا اس کے جسم کا سارا خون سمٹ کر اس کے چہرے پر آگیا۔

"ڈاکٹر چچا! کیا میں کالی ہوں؟" اس نے درد انگیز نگاہوں سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"رمنو! تمہیں یہ کس نے کہا؟ وہ شخص تمہارا قاتل اور میرا دشمن، جو تم سے یہ کہے۔" ڈاکٹر چلائے۔

"آدمی جھوٹ بول سکتے ہیں، آئینہ جھوٹ نہیں بولتا۔"

"اس سے مت پوچھو جو احساس نہیں رکھتا اور جس کے سینے میں دل نہیں ہے۔"

"ہر شخص مجھے آپ کی طرح نہیں بہلا سکتا۔ نہ ہی کسی خوش فہمی میں مبتلا کر سکتا ہے۔ پچھلے سہ ماہی امتحان میں میرے سو میں سے ستر نمبر آئے۔ شنانہ کے صرف بیس نمبر تھے۔ وہ اپنی بہن انیسہ سے کہنے لگی۔

"اس سے نہ بولا کرو۔ یہ کالی ہے، چڑیل ہے۔"

ڈاکٹر اختر کو گمان ہوا جیسے انہوں نے ناقابلِ تردید جھوٹ بولا ہو اور اس پر سچ نے ایک لمحے کے لئے ان کی زبان گنگ کر دی۔۔۔ انہیں برسوں پہلے کی بات یاد آئی

"رمنو! وہ تم سے جلتی ہیں۔ اپنی نالائقی کو چھپانے کے لئے وہ تمہیں باتیں بناتی ہیں۔ تم پھر بھی ان سے صلح جوئی سے رہو۔ آدمی کو فراخدل ہونا چاہئے۔"

"میں فراخدل بن کر ان سے صلح کروں۔ وہ تو مجھ سے نفرت کرتی ہیں۔ میری غربت کا مذاق اڑاتی ہیں۔ میرے پرانے کپڑے اور گھسے ہوئے جوتے دیکھ کر تمسخرانہ انداز سے ایک دوسری کو اشارے کرتی ہیں۔ جیسے میں اچھوت ہوں، ان سے کمتر مخلوق ہوں۔ اگر کوئی خدا ہے تو میں پوچھتی ہوں کہ اس نے کیوں خود اپنے بندوں کے لئے ہمیں ایک تماشہ بنا دیا۔ کیا ہم پتھر ہیں۔ کیا ہمارا احساس مر چکا ہے؟ اور آپ میرے دل کو ایسا بنانا چاہتے ہیں جس میں جہان بھر کے زہر اور تلخیاں بھر جائیں اور پھر بھی دل کے دامن سے پھولوں کی مہک آئے۔ یہ نہیں ہو سکتا"۔۔۔ وہ باغیانہ انداز سے بولی۔

"وہ انسان بڑے عظیم ہوتے ہیں جو نفرتیں پا کر دوسروں کو محبت دیتے ہیں۔ یہ جذبہ تو ایک

ت ہوتے ہیں۔ کسی بھی انداز میں ڈھال لو غصہ، نفرت، محبت اور ہمدردی آدمی کے اپنے اختیار

ہمیں کیا ملا۔ یہ ضروری نہیں مگر ہم دوسروں کو کیا دیتے ہیں یہ ضروری ہے۔"

"آپ کے برابر ہو کر میں بھی اسی طرح سوچوں گی۔"

"میں نے یہ خزانہ برسوں کے بعد پایا۔ تم اسے پانے کے لئے اتنے سال کیوں برباد کرو۔"

ممکن تھا کہ یہ بحث کچھ اور طویل ہو جاتی کہ زیب النساء آگئیں اور خفگی سے رضو کی طرف دیکھ کر بولیں۔ "تم بہت اونچا بول رہی تھیں۔ کیا کوئی بحث چھڑ گئی ہے؟"

"بعض باتوں کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں۔ ڈاکٹر چچا مجھے سمجھانا چاہتے ہیں۔"

"ہماری صاحبزادی تو انسائیکلو پیڈیا ہے۔" ڈاکٹر انور زیر لب مسکرائے۔

"ڈاکٹر چچا! میری طرف دیکھ کر بتائیے کیا میں بہت کالی ہوں؟"

"تمہیں کون کہتا ہے؟"

"جو چیز میں نے جان لی اس کے لئے بھی کسی ثبوت کی ضرورت ہے؟"

"کبھی دفعہ نظر آنے والی چیزیں وہ نہیں جو ہم سمجھتے ہیں۔ کئی دفعہ سچ کے بارے میں ہم کبھی نہیں جان سکتے۔ میں تمہیں وسیع القلب مثالی انسان بنانا چاہتا ہوں۔"

"ایسے مثالی کردار آپ کو خلیل جبران کی کتابوں میں ہی ملیں گے۔"

"کیا تم نے خلیل جبران کو پڑھا ہے؟"

"میں تو اس کی کتابوں کا پورا سیٹ ختم کر چکی ہوں۔ مگر میں اس کے کرداروں جیسی نہیں۔ ایک عام سی لڑکی ہوں۔ جو خوشی ملنے پر ہنس سکتی ہے اور دکھ ملنے پر چلا سکتی ہے۔ ممکن ہے احتجاج بھی کروں۔"

"اس ردعمل سے کیا حاصل ہوگا۔ کسی کو کوئی فائدہ نہیں اور خدا دکھ سہنے اور صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

"میں فرشتہ نہیں ہوں، نہ ہی پیغمبروں میں سے ہوں۔"

"اپنے عمل اور کردار سے آدمی فرشتوں سے ارفع ہے۔"

اتنا کچھ کہنے اور سمجھانے کے باوجود ڈاکٹر آذر کو ڈر تھا۔ کہیں یہ لڑکی باغی نہ ہو جائے۔"

"آپ اور کتابیں کہتی ہیں کہ خدا عالم الغیب ہے، وہ غنی ہے، وہ علیم ہے، پھر میرے لئے تو وہ اندھا بھی ہے اور بہرہ بھی۔ کیا وہ نہیں جانتا مجھے کیا چاہئے تھا۔ اس دنیا میں رہنے کے لئے۔ مجھے اس نے کھلے سمندروں میں پھینک دیا ہے۔"

"ڈارون کہتا ہے صرف وہی جاندار زندہ رہ سکیں گے جن میں ماحول سے مفاہمت کرنے کی صلاحیت ہو گی۔"

جانے کتنے دنوں کا لاوا اس کے سینے میں پک رہا تھا۔ کہ آج قطرہ قطرہ بہنے والے آنسوؤں نے آتش فشاں کا روپ دھار لیا اور آذر کے مضبوط دل پر جیسے جلتے تیل کی بوندیں گرنے لگیں اور ان کے کانوں میں ماضی کی بازگشت گونجنے لگی۔

"ڈاکٹر! اس بچی کی آج کی موت اسے باقی عمر کے روگ سے نجات دلا دے گی۔ میں نہیں چاہتا یہ عمر بھر لوگوں سے ہمدردیوں اور پیار کی بھیک مانگے اور لوگ اس پر نفرت کے پتھر پھینکیں۔"

یہ تو اس بد نصیب پر بات کئی صدیوں سے ہونے والا ڈرامہ ہے۔ ہم کتنے تہذیب یافتہ کیوں نہ ہو جائیں۔ یہ کالے گورے کا امتیاز نہیں مٹ سکتا۔

"ڈاکٹر آذر خدا کے لئے اس بچی کو ختم کر دیں۔ آپ کے لئے یہ دو منٹ کا کام ہے۔"

ڈاکٹر کے لبوں سے آہ نکل گئی — عذاب کے دو منٹ کتنے لمبے ہوتے ہیں۔

"یہ نہیں ہو سکتا میں ڈاکٹر ہوں۔ میں نے میڈیکل کی ڈگری لیتے ہوئے عہد کیا تھا کہ میرا کام زندگی دینا ہو گا۔ زندگی مٹانا نہیں۔ میں اس وعدے کی عہد شکنی نہیں کر سکتا۔"

انہیں تیرہ سال پہلے کی باتیں یوں یاد آنے لگیں جیسے کل کا واقعہ ہو اور صفوانہ کی پوری زندگی ایک سوالیہ نشان بن کر پوچھ رہی ہو۔

"مجھے کیوں بچایا تھا آپ نے؟"

ایک شام زیب النساء کپڑے دھو رہی تھیں کہ اس دوران انہیں حرارت سی محسوس ہوئی پھر سردی لگنے لگی۔ بڑی مشکل سے کپڑوں کو کھنگال کر انہوں نے رسی پر ڈالا۔ مگر سر اس درد سے پکڑا رہا تھا۔ یوں جیسے ہاتھ پاؤں ساتھ چھوڑ رہے ہوں۔ انہوں نے بمشکل خود کو سنبھالا اور بستر تک جانے سے پہلے ہی وہ فرش پر سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ اب اتنی ہمت نہ تھی کہ اٹھ کر بستر تک جاتیں۔ رحمو کو پڑھنے میں محو تھی۔ مگر ماں کو زمین پر سر پکڑے بیٹھے دیکھ کر، چھلانگ لگا کر آئی۔

"امی! کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں بیٹی! ذرا مجھے سہارا دے کر میرے بستر پر بٹھا دو۔ لگتا ہے ہڈیوں سے جیسے دم نکل گیا ہو۔"

"اللہ! امی آپ کو کچھ نہ ہو۔ میں نے آج ناشکری کی تھی۔ ڈاکٹر باجی کے سامنے صاف کہہ دیا تھا کہ اللہ میاں نے ہم سے بے انصافی کی ہے۔ ہمیں کچھ نہیں دیا۔ حالانکہ اتنی اچھی ماں دی ہے۔ اور ابو کی طرح کتنے پیارے کتنے مہربان ہیں اور اللہ جی آپ کتنے اچھے ہیں۔ ہم کتنے بُرے تیری نعمتوں کا شکریہ ادا نہیں کرتے۔ بس اب معاف کر دو اور میری امی کو کچھ نہ کرو۔"

وہ دل ہی دل میں شدت سے مجبور ہو کر التجا کر رہی تھی۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو اس ہستی کو تو خود ہی کے لئے عید کے دس روپے دے دیتی۔

امی کو سہارا دے کر اس نے بستر پہ آرام سے لٹایا۔ پر اب اسے امی کے بدن کی حرارت کا خیال تھا ایک سوء ٹن کی طرح ـــ

اسی لمحے اسے ابا کا خیال آیا۔ کاش وہ زندہ ہوتے تو امی کے لئے ڈاکٹر کو بلا لاتے اور وہ ماں کی دیکھ بھال کرتی۔ ڈاکٹروں میں سب سے قابل تو اس کی نظر میں ڈاکٹر آذر ہی تھے ورنہ باقی سب تو قصائی تھے جو مریض کو پیسے بٹورنے کے لئے اچھی دوائی نہیں دیتے۔

برآمدے میں ایک چکر لگا کر وہ واپس آگئی۔ امی کو اکیلی چھوڑ کر ڈاکٹر کو بلانے کے لئے جانا اسے گوارا نہ تھا۔ اگر گھر میں کوئی تیسرا فرد ہوتا تو یہ سوچ اور فکر تو نہ ہوتی۔ امی کی حالت لمحہ بہ لمحہ غیر ہوتی جا رہی تھی۔

کتنا اچھا ہو اگر ڈاکٹر چچا آجائیں۔ ان کے آنے سے یہ بے بسی اور غیر محفوظ ہونے کا احساس تو کم ہو جائے۔ یہ اکیلا پن، یہ امی کے بچھڑ جانے کا خوف جو دل سے چمٹ سا گیا ہے۔

ہائے اللہ میاں ڈاکٹر آذر کو بھیج دے تو امی کی حالت کیسی ہو رہی ہے۔ جلتی ہوئی پیشانی پہ ہاتھ رکھ کر خوف کچھ اور بڑھ گیا۔ ٹھنڈے پانی میں کپڑا بھگو کر اس نے امی کے ماتھے پہ رکھا۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

ڈاکٹر چچا ہمیں آپ کی بہت ضرورت ہے۔ آپ اگر آج نہ آئے تو کل جانے امی کو کیا ہو جائے ذہن میں پیدا ہوتے والے اندیشوں کو دھکیل کر اس نے باہر پھینکا۔ پر ایک سفید چادر والی تصویر ہزار مخالفت کے باوجود ڈھٹائی سے اس کی سوچ کے پردے سے چمٹ گئی۔

وہ چلا اٹھی۔ ــ " نہیں نہیں ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں یہ کبھی نہ ہونے دوں گی۔ میں اپنی جان دے دوں گی۔ میری ماں کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ گھبراہٹ میں وہ ٹھنڈے پانی کے قطرے امی کے منہ میں ڈالنے لگی۔ امی کے ہاتھ پاؤں بے دم سے ایک طرف کو پڑے تھے۔ ان کی نبض بڑی سست تھی جیسے تھک گئی ہو۔ بار بار رعنا کی نگاہ باہر کے دروازے کی طرف اٹھ جاتی۔

کوئی آ جائے ــ اور پھر آخر اس کی دعا قبول ہو جائے گی۔ یہ تو اس کے وہم و گمان

میں بھی نہیں تھا — دروازے پر آہٹ ہوئی۔

"یہ وہم نہیں" رضو نے چھلانگ مار کر دروازہ کھولا۔

"ارے ڈاکٹر چچا! آپ؟" وہ خوشی سے دیوانی ہو گئی۔

"خیریت تو ہے"

"آپ آگئے ہیں۔ اب خیریت ہی ہوگی۔ امی کی طبیعت خراب ہے"

"چلو میں دیکھوں"

رضو نے لالٹین کی بتی اونچی کر دی۔

ڈاکٹر نبض اور چہرہ دیکھ کر الٹے پاؤں واپس گئے اور کار میں سے اپنا میڈیکل بیگ لے آئے۔

"پگلی! مجھے فون کر دیا ہوتا۔ میں ہسپتال میں ہی تو تھا" وہ سٹیتھسکوپ سے امی کا معائنہ کرتے ہوئے بولے۔

"فون کرنے کے لئے بھی تو گھر سے باہر جانا پڑتا اور اس وقت تو پوسٹ آفس بھی بند ہو جاتا ہے"

"مجھے خیال نہیں رہا تھا۔ صبح میری پڑھنے کی عینک یہاں رہ گئی تھی اور میں اسی کی تلاش میں دوبارہ اب آیا تھا"

"شکر ہے آپ آگئے ورنہ خدا جانے کیا ہو جاتا"

ڈاکٹر چچا نے بے ہوشی ختم کرنے کا انجکشن دیا۔ پانچ منٹ بعد ہی امی کو ہوش آگیا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ پر ان چند گھنٹوں نے انہیں جیسے برسوں کا مریض بنا دیا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب، مجھے کیا ہو گیا تھا؟"

"یونہی ذرا بے ہوش ہو گئی تھیں۔ میں دوائی دے رہا ہوں" ڈاکٹر نے نسخہ لکھنے کے بعد بیگ سے دوائی نکالی اور امی نے رضو کے رخساروں پر پھیلتے آنسو دیکھ لئے۔

"کیا بات ہے میری بچی! یہ آنسو کیسے؟"

"امی آپ کو جانے کیا ہو گیا تھا اور مجھے آپ کی بے ہوشی سے خوف آنے لگا تھا۔ مجھے یوں

محسوس ہوا جیسے آپ بھی مجھے چھوڑے جا رہی ہیں۔ شکر ہے ڈاکٹر چچا آگئے۔"

"سچ تو یہ ہے ڈاکٹر بھائی! آپ کے ہم پر ان گنت احسانات ہیں۔"

"آپا! ایسا نہ کہیں میرے نزدیک سلیم بھائی کی طرح تھے۔ آپ میری بہن کی جگہ ہیں اور یہ پگلی رضو گو لڑاکی ہے مگر مجھے بیٹی کی طرح عزیز ہے۔ مجھے اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ ہسپتال میں میری بے پناہ مصروفیات نے آپ لوگوں کے لئے کبھی کچھ کرنے کی فرصت ہی نہیں دی۔"

"آذر بھائی! ایسا نہ کہیں خدا کے بعد آپ کی ہستی ہے۔ جو ہم دونوں کا سہارا بنی ہوئی ہے میری دعا ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ سکھی رکھے اور آخرت میں بھی ان نیکیوں کا اجر دے۔"

"رضو! تم اپنی امی کا دھیان رکھنا۔ میں دو ایک دوائیاں اور انجکشن لے کر ابھی آتا ہوں۔"

ادھر ڈاکٹر آذر نے گھر سے باہر قدم رکھا اور امی کے چہرے پر زردیاں چھانے لگیں

"امی آپ کو کیا ہو گیا؟" رضوانہ چلائی۔

زینب نے شفقت سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔

"رضو میری بچی میں کوئی دم کی مہمان ہوں۔ کبھی ڈاکٹر سے بھی زیادہ مریض اپنی حالت کو بہتر جانتا ہے کہ اور کتنے سانس باقی ہیں۔ میری کوتاہیوں کو میری کمزوری اور بڑا پن سمجھ کر نظر انداز کر دینا۔ مائیں مرتی ہیں تو بچوں کو باپ کے حوالے کرتی ہیں، باپ مرتے ہیں تو وہ بچے ماں کے سپرد کرتے ہیں۔ پر تیرے اکیلے پن کا دکھ مجھے نوچ رہا ہے۔ آج کے بعد تو اپنی بوڑھی اور بیمار ماں کی باتیں ڈھونڈے گی پر وہ قبر کی گہرائیوں میں دفن ہو گی۔ تو میری آواز کو ترسے گی پر میں آوازوں کے رشتوں سے دور جا رہی ہوں۔ تو میرے دل کی محبت کی گرمی ڈھونڈے گی پر برف کی طرح ٹھنڈے انسان تجھے ملیں گے۔ یہ ساری دنیا لاشوں جیسے ٹھنڈے انسانوں سے بھری پڑی ہے۔ مگر احساس اور اپنائیت کی حرارت سے پگھلنے والا دل شاذ ہی ملے گا۔ میں نے آج تک تجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ تجھے جنم دینے والی کوئی اور عورت تھی۔ مگر تو نے اپنے بچپن کو گھر کا سمجھ کر اپنایا ہے۔ میرے بعد ہمیشہ اور ابھی ڈاکٹر چچا کو اپنا رہبر اور استاد سمجھنا۔

ممی!" وہ پوری جان سے چلا کر رو دی۔

"نہ رو میری بچی! کون جانے زندگی کے کتنے حصے آنسوؤں اور آہوں سے گندھے ہیں۔ کتنے صحرا اور ویرانے تیرے راستوں میں بچھے ہیں۔ تیرے آنسو میرے لیے نشتر کی نوک میں ڈھلی ڈھول بھی زیادہ تیز ہیں نہیں برداشت کر سکتا۔ میں تو پھر بوڑھی ہو چکی ہوں۔ میرے جسم کا ایک ایک جوڑ کام کی زیادتی سے تھک چکا ہے۔ اب میرا جی چاہتا ہے۔ ایک سکون بخش نیند سو جاؤں۔ اور یوں بھی زندگی کا ایسا موڑ ہے جہاں آگے جانا ممکن نہیں ہوتا۔ اگر ڈاکٹر آذر کہیں کہ میں ٹھیک ہو جاؤں گی تو وہ ایک ڈاکٹر کی پیشہ ورانہ تسلی ہو گی۔ انہیں خود معلوم ہے کہ یہ کھٹارا مشین بے کار ہو چکی ہے۔ اس کے بچے کھچے ثابت حصے بھی ٹوٹ چکے ہیں۔ میری دعا ہے زندگی میں تجھے خوشیاں ملیں۔ میری بڑی تمنا تھی۔ تیری شادی کر کے تیرا گھر آباد کرتی اور پھر میں خوشی سے مرتی۔ پر ایسے نہیں ہونا تھا۔"

امی کی بات نامکمل رہ گئی۔ ڈاکٹر آذر جلدی سے گھر میں داخل ہوئے۔ میری تلاش کے بعد وہ قیمتی انجکشن لے آئے تھے۔ جو زیب النساء کے سانسوں کی تعداد بڑھا سکتا تھا۔ وقتی طور پر موت کو ٹال دیتا — جونہی وہ گھر میں آئے۔ اماں کی آنکھیں ٹھہر سی گئیں۔

"کیا حال ہے آپا کا؟" انہوں نے پہلا سوال کیا۔

"ابھی باتیں کر رہی تھیں ابھی چپ ہو گئی ہیں۔"

بجلی کی تیزی سے انہوں نے زیبی کی کلائی پر ہاتھ رکھا۔ اتنی سست نبض۔ ابھی ٹھہری کہ ٹھہری۔ انہوں نے جلدی سے آلہ نکال کر دل کی حرکت چیک کی۔ ندی کی ٹھہری ٹھہری لہریں جیسے کوئی کشتی بڑی آہستگی سے ڈوب رہی ہو۔ فوراً ہی انہوں نے دوائی سرنج میں بھری۔ رشو نے امی کی خزاں رسیدہ شاخ جیسی کلائی سیدھی کی۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگایا۔ مگر دوران خون تقریباً رک چکا تھا۔ ساری دوائی باہر نکل آئی۔

"اوہ" ڈاکٹر کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ گھنٹے بھر کی تلاش کے —— بعد یہ انجکشن

بازار سے ملا تھا۔ مگر زیبی تم نے ہماری آخری اعانت بھی قبول نہیں کی۔ تم ہمیشہ سے باوقار اور خود دار رہی ہو۔"

انہوں نے روئی سے دوائی صاف کی اور چادر سے زیبی کا چہرہ ڈھانپ دیا تو رضو کی خاموشی کا قفل ٹوٹا۔

"ڈاکٹر چچا! یہ کیا ہو؟"

"جیسے یہ ہوا اسے ایسے ہی تسلیم کرنا پڑے گا۔"

زیبی کا چہرہ موت کے بعد جیسے دُھل کر صاف ہو گیا ہو۔ موت پریشانیوں کی تحریریں اپنے ساتھ لے گئی۔ بے جان مٹی کا ڈھیر باقی رہ گیا تھا۔

بجلی کی تیزی سے رضو کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ ماں کی موت کو تسلیم نہ کرے۔ ایک لمحے کے لئے وہ امی کے بے جان جسم میں کسی حرکت کا انتظار کرتی رہی۔ مگر سچائیاں اسے ڈسنے لگیں۔ اس کا ذہن ایک نقطے پر آ کر الجھ گیا۔ اگر اس لاش کی سچائی کو نہ مانوں تو کتنی عافیت ہے۔ اگر مان لیا۔ تو زندگی کے آئینے میں کئی دراڑیں پڑ جائیں گی۔

"میں نہیں مانوں گی۔ میں نہیں مانوں گی۔"

وہ بلند آواز سے چلائی۔ تو ڈاکٹر آفندی کو یقین سا ہونے لگا کہ اس کا ذہن ماں کی موت کے واقعے کو تسلیم نہیں کر سکا۔ ماں جیسی عظیم اور چاہنے والی ہستی کی ایک دن کی علالت اور اچانک موت کو یہ تیرہ سال کی بچی کیوں مانے، وہ سچ کو سمجھے تو کہاں سے!

"ڈاکٹر چچا! آپ کہہ دیں اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ صبح وہ جاگ جائیں گی۔ آپ نے کہہ دیا تو میں یقین کر لوں گی۔"

"نہیں رضو۔ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"

"آپ میری خاطر جھوٹ بول دیں۔ میری تسلی کے لئے۔"

"ایک دفعہ پہلے تمہاری خاطر جھوٹ بولا تھا۔ دنیا کی سب سے بڑی حقیقت موت ہے۔ میں نے

اپنی ہر تدبیر آزمالی۔ لیکن افسوس میں تمہاری ماں کو نہیں بچا سکا۔"

"آپ ڈاکٹر ہیں آپ کو ڈاکٹر کون کہتا ہے۔ میری امی کے سامنے آپ کا علاج بیکار ثابت ہوا۔ کیسے کہوں کہ آپ بہترین فزیشن ہیں۔"

"ہاں رضو! زندگی میں ایسے مرحلے بھی آتے ہیں کہ زندگی موت بن جاتی ہے اور کبھی دوسرے کو بچا لیں۔ ہم زندہ رہتے ہیں۔ خدا عظیم قدرت ہے۔ آؤ تمہاری امی کی مغفرت کے لیے دعا مانگیں کہ خدائے بزرگ و برتر انہیں بخش دے۔"

"زندگی میں تو بخشش ہو نہیں سکی مرنے کے بعد کیا ہو گی۔ جن لوگوں نے ساری زندگی بھوک، فاقہ کشی اور مصائب میں گزاری اور مر گئے۔ انہیں آپ اور خدا جنت کا لالچ نہ دیں۔"

"ہشت پگلی! ایسی باتیں نہیں کرتے۔ مایوسی کفر ہے اور خدا کی رحمت مایوس نہیں ہونا چاہیے۔"

"مایوسی کفر اور رحمت"۔ وہ بڑے طنزیہ لہجے میں بولی۔

"میری امی مر گئیں۔ آپ مجھے کہتے ہیں رونا نہیں۔ میں کیوں نہ روؤں۔ میں روؤں گی۔ کون مجھے روکے گا؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اتنے میں بی ہمسائی نے دریچے کا پٹ کھولا۔

"اے رضو بیٹی۔ کیا ہوا تمہاری ماں کو صبح تو اچھی بھلی مجھ سے باتیں کر رہی تھیں؟"

"میری امی مجھے چھوڑ گئی ہیں۔"

"ششو کی ماں چھلانگ مار کر آئی۔ اتنے میں اِرد گرد کے گھروں کی بے شمار عورتیں جمع ہو گئیں۔ کچھ ڈاکٹر آذر سے مرینہ کی اچانک موت کا سبب پوچھ رہے تھے اور باقی عورتیں رضو کو تسلی دے رہی تھیں۔

"نہ رو میری بچی! خدا تمہیں صبر دے۔ تو ہماری بیٹی کی طرح ہے۔ ہم تجھے کمی محسوس نہ ہونے دیں گے۔ بڑی خوبیاں تھیں زیب النساء میں۔"

"شرافت تو بس بہن پر ختم تھی۔ نیک، مروت والی اور شوہر پرست عورت تھی۔" ششو کی ماں

دوسری عورتوں کو بتا رہی تھی۔

گہری شام کو زیب النساء کو قبر کی گہرائیوں میں دس بیس محلے والوں کی ہمراہی میں دفن کر دیا گیا۔ ڈاکٹر آذر نے سب کام اپنے ہاتھ سے کیا۔ شنو کی ماں نے تسلی دی۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں رضو بیٹی کے پاس رات کو ٹھہروں گی۔" شب کے گیارہ بجے ڈاکٹر آذر اسے تسلی دے کر کل آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ پر رضوانہ کے پورا گھر قبر کی طرح تاریک اور ویران تھا۔

زیب النساء کی وفات پر رضو کے آنسو ہی نہ تھمتے تھے۔ ڈاکٹر آذر ہسپتال اپنی ضروری ڈیوٹی دینے رکے رہے سجاتے تو وہ ہمسائے کی لڑکی یا عورت کو رضو کا خیال رکھنے کی تاکید کر جاتے مگر تین دن سے نہ اس نے کھانا کھایا تھا نہ ہی سکول پڑھنے گئی تھی۔ روتے روتے اس کا حلق خشک ہو جاتا تو چند گھونٹ پانی کے اتار لیتی۔ شب بیداریوں سے اس کا چہرہ بے رونق اور آنکھیں ویران تھیں۔ شب کے کسی پہر آنکھ لگتی بھی تو ڈراؤنے خواب سے وہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھتی۔

ڈاکٹر آذر اس کے کھانے کے لئے کوئی چیز لاتے تو سر ہلا دیتی۔

"نہیں ڈاکٹر چچا مجھے کچھ کھانے کی خواہش نہیں۔ دل پر ایک بوجھ سا ہے۔ یہ سوچ کر کہ امی کو اتنی جلدی نہیں مرنا تھا۔ انہیں اگر وقت پر میڈیکل ایڈ مل جاتی تو وہ بچ سکتی تھیں۔ آپ شب و روز مرتے جیتے انسان دیکھتے ہیں۔ آپ ان کے لئے بے حس ہو جاتے ہیں۔ انسانی زندگی کتنی قیمتی ہے۔ مجھے اس کا احساس اب ہوا ہے۔"

"مجھے یہ احساس تمہاری پیدائش سے بھی پہلے کا ہے۔ تم کیا جانو ہماری زندگی کن امتحانوں اور مرحلوں سے روز گزرتی ہے۔ ہمیں ہر قسم کے نظارے روز دیکھنے پڑتے ہیں۔ ہمیں اپنے اندرونی احساسات کو چھپانے پر قدرت حاصل ہے۔ اگر ہم کسی مریض کی بیماری یا موت پر رونے لگ جائیں تو ہماری ڈیوٹی کون انجام دے۔ ہم مریضوں کا علاج کیسے کریں۔ ہم رونے لگے تو مریضوں کو تسلی دینے والا کون ہوگا۔ ہاں یہ بات کئی دنوں سے تمہیں کہنا چاہتا تھا کہ بے شک ارد گرد کی ہمسایہ خواتین تمہاری دلجوئی کرتی ہیں۔ مگر کتنے دن ایسا ہوگا۔ میں بھی نہیں جا ہوں گا۔

کہ تمہاری تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جائے۔ تمہاری امی کی طرح میری بھی یہ خواہش رہی ہے کہ تم پڑھ لکھ کر ڈاکٹر یا پروفیسر بنو۔ جو کام وہ انجام نہیں دے پائیں۔ ان کو پورا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اب جس قدر جلدی ہو تمہیں یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔"

"نہیں میں یہاں سے کبھی نہیں جاؤں گی۔ اس پرانے بوسیدہ مکان میں امی کے نحیف ہاتھوں کو میں نے کام کرتے دیکھا ہے۔ انہیں چلتے پھرتے، ہنستے بولتے دیکھا ہے۔ ان کی ہنسی کی پرچھائیاں اس گھر کے در و دیوار سے لپٹی ہوئی ہیں۔ یہیں میرے اچھے ابو کی لاش آئی۔ میں نے انہیں اشکبار آنکھوں سے کسی لمبے سفر پر جاتے دیکھا تھا۔ یہاں میری امی اور ابو کے سائے رہتے ہیں۔ میں یہاں سے کیوں جاؤں ڈاکٹر چچا! پلیز مجھے یہاں رہنے دیں۔"

"تم اکیلی یہاں رہو گی۔ تمہارا رونا اور تنہائی تمہیں پاگل کر دے گی۔ تمہارے امی ابو کی زندگی اچھی تھی یا بری وہ اپنی زندگی گزار چکے اب دیکھنا یہ ہے کہ تم اپنی زندگی کا کیا کرتی ہو کئی دنوں سے تم سکول نہیں گئیں۔ کتنا حرج ہوا ہو گا۔ میں بہت مصروف سہی مگر میں تمہیں پڑھاؤں گا۔"

"میں جتنا پڑھنا چاہوں اتنا ہی پڑھائیں گے؟"

بلکہ اس سے بھی زیادہ بہت زیادہ، یہ میری دلی خواہش ہے تم پڑھائی جاری رکھو۔ چلو میرے یہاں تمہیں کچھ سہولتیں حاصل ہوں گی۔ میں نے کل ہی تمہارے لئے ایک کمرہ ٹھیک کروایا ہے۔ آؤ میں تمہاری چیزیں اکٹھی کرنے میں مدد کروں۔ تم میری بیٹی جیسی ہو۔ میں کوشش کروں گا کہ میرے بنگلے میں تمہاری مناسب دیکھ بھال ہو۔ تمہارا سکول بھی وہاں سے کافی قریب ہے۔"

ڈاکٹر آذر کے سمجھانے بجھانے پر وہ ان کے ساتھ اپنی کتابیں، امی ابو کی کچھ نشانیاں سمیٹنے لگی۔ آنسو یہاں سے جانے کے تصور سے بہے جا رہے تھے۔ اس کی پڑھائی جاری رہے، اس وقت وہ اس بارے میں سوچ رہی تھی۔ رضو کی اپنی چیزیں تو ڈاکٹر آذر نے اٹھا

ہیں۔ مگر وہ امی کے ہاتھ کے کاڑھے ہوئے میز پوش اور تکیے کے غلاف سمیٹتے ہوئے رو رہی تھی۔ آنسو اس کے ماضی سے لپٹی محبتوں کی ایک داستان کہہ رہے تھے۔ کار میں اس کی چیزیں ڈاکٹر آذر نے خاموشی سے رکھیں۔ انہیں تو اعتبار نہ تھا کہ یہ ضدی اور اکھڑ سی ٹوٹے دل والی لڑکی اس کھنڈر جیسے گھر میں رہنے پر بضد ہو جاتی تو اس کی زندگی ہموار کرنے اس کے مستقبل کو سنوارنے کا انہیں موقع نہ ملتا۔ وہ ویرانوں کی بازگشت بن کر رہ جاتی یا پھر پاگل ہو جاتی۔ ان دو صورتوں سے تو وہ رضو کو بچانا چاہتے تھے۔

ہسپتال جانے سے پہلے انہوں نے رضو کو اس کا کمرہ دکھایا۔ پھر انھیں گھر کا تعارف کراتے ہوئے گھر کے نوکر اور نوکرانی سے تعارف کرایا۔

"یہ میری بیٹی رضوانہ ہے۔ تم لوگوں کے ہوتے اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔"

مالی سے تعارف کراتے ہوئے بولے۔ "مالی چاچا! یہ میری بیٹی ہے۔ اب سے یہاں رہے گی۔ اسے پھولوں کا بہت شوق ہے۔ شام کو اسے گلاب یا موتیا کے پھول ضرور دیا کرنا۔"

رضوانہ نے پھر سکول جانا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر آذر روز ایک آدھ گھنٹہ شام کو اسے پڑھانے اور سمجھانے میں صرف کرتے۔ اس سے ایک مہینے میں ہی اس کا رویہ معمول پر آ گیا۔ گو ڈاکٹر آذر فزیشن تھے۔ مگر باقاعدہ طور پر نفسیاتی کلینک نہ ہونے کے باوجود وہ ہسپتال میں ہی مریضوں کی ذہنی صحت کا جائزہ لے کر ان کا علاج کرتے۔ اب تو بہت کم ایسے مریض تھے جو جسمانی تکلیف کے ساتھ ذہنی مریض نہ ہوں۔

ڈاکٹر آذر کی عالمگیر ہمدردی اور محبت کے باوجود رضوانہ کا رویہ اعتدال پر لانے کے لئے انہوں نے اس پر خصوصی توجہ دی۔ ورنہ اس گھر میں تو وہ پہلے ایسی تھی جیسے کوئی جنگلی بلی لائی گئی ہو۔ جارحیت پسند اکھڑ مزاج، لاپروا اور بہت کم وہ اپنی ماں کی موت کو خیال و خواب سمجھتی رہی۔ اگر ڈاکٹر آذر جیسا دور اندیش، مستقل مزاج، تجربہ کار ڈاکٹر نہ ہوتا تو رضوانہ کا سنبھلنا مشکل تھا۔ ان کی توجہ، ہمدردی اور پیار نے اسے بہت سنبھال دیا۔

جدید سامان آراستہ بنگلے میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ کبھی دل بھر آتا اور یادیں چلاتیں۔ امی ابو سے بچھڑنے کا احساس دل کو نوچتا تو وہ اکیلے میں آنسو بہا لیتی۔ اس کے دل کی کیفیت کو سمجھنے والے ڈاکٹر آذر اسے تسلی بھی نہ دے سکتے۔ اس میں ڈاکٹر کی بے پناہ مصروفیتوں اور عمر کے تضاد کو بڑا دخل تھا۔ ہسپتال میں انہوں نے ذہنی طور پر رمنو کو کبھی نہیں بھایا تھا اپنائیت اور مغاہمت کی اس فضا میں رہتے ہوئے انہیں کئی برس بیت گئے۔

رضوانہ نے میٹرک کا امتحان دینا تھا۔ اگرچہ وہ خود پڑھائی میں بڑی سنجیدہ تھی۔ مگر پھر بھی ڈاکٹر آذر نے اسے الگ الگ پرچے کی تیاری کرائی اور دونوں کی محنتوں کا نتیجہ ملا کہ اس کی میٹرک میں امتیازی نمبروں سے فسٹ ڈویژن آ گئی۔ اس خوشی میں ڈاکٹر چچا نے اسے ایک سنہری گھڑی انعام میں دی اور خوش ہو کر کالج میں داخلہ لے دیا۔ سکول کے مقابلہ میں کالج کا ماحول وسیع تھا — آزادی کی فضائیں بے شمار دلچسپیاں اور مختلف تقریبات منعقد ہوتیں مگر رضو وہ تو صرف پڑھائی کے لئے کالج آتی اور واپس چلی جاتی — پر ایک احساس گھر اور کالج ہر جگہ اس کے ساتھ سائے کی طرح رہتا۔ وہ سوچتی جیسے وہ سدا سے تنہا ہے اور ایسے ہی رہے گی۔ اپنی ذات کی تنہائی نے اسے قنوطی سا بنا دیا۔ وہ ڈاکٹر آذر کے ہزار سمجھانے کے باوجود اپنی سوچ کے دھارے کو بدل سکی۔ اسے لگتا ڈاکٹر چچا کوئی انسان نہیں بلکہ اور ہی مخلوق ہے۔ جس کا دل محبتیں، ہمدردیاں اور انسانوں کی خدمتیں کر کے کبھی تھکتا۔ کیسے مستقل مزاج ہیں۔ ایک مسلسل مسکراہٹ ان کے چہرے پہ رہتی ہے اور یہ کتنی رفعتوں اور بلندیوں پر نظر آتے ہیں اور میں کالج کی آزاد فضا میں بھی اپنی ذات کے قید خانے میں محصور سی ہوں۔ کوئی بہن بھائی، ماں باپ، چچا تایا۔ کوئی بھی تو نہیں۔ خوشی کا کوئی لمحہ زندگی میں آتا ہے تو آنسوؤں کی یلغار اور محرومیوں کی قطار آنکھوں کے سامنے کھڑی ہوتی ہے۔

دوسرے مجھے اپنی محبت میں شریک کرنا چاہتے ہیں مگر میں ہنسوں بھی تو کیسے؟ ابھی یہ دنیا سے اٹھ چلی تھی۔ اگر ڈاکٹر چچا اس لمحے میری مدد نہ کرتے تو کون جانتا میری ہستی، میری ذات، میری شخصیت صدمہ ہزار ٹکڑوں میں بٹ چکی ہوتی۔ کوئی سمجھ ہی نہ سکتا کہ میں کون تھی، کہاں سے آئی اور کہاں گئی۔

مجھ جیسے کمزور لوگ روز ہی فنا کی گھاٹیوں میں اتر جاتے ہیں۔ موت سے ساز باز کر لیتے ہیں۔ پر ڈاکٹر چچا آپ کو بس نے کہا تھا کہ آپ میرے لئے سراپا ہمدردی بن جائیں۔ شاید امّاں بی نے مرنے سے بہت دن پہلے آپ سے کہا ہو۔

"ڈاکٹر چچا! آپ نے ہمیشہ رفو کو اپنی بیٹی کی طرح سمجھا ہے۔ میرے بعد بھی اس کا خیال رکھیے گا کہ اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔"

گویا امّاں بی نے ڈاکٹر صاحب کے کندھوں پر میرا بوجھ ڈال دیا اور میں ان کی رائے معلوم کئے بغیر ان کے لئے ایک ذمہ داری بن گئی۔ میں کوشش کروں گی، جتنی جلدی ہو سکے۔ آپ کے کندھوں سے یہ بار ٹال سکوں۔ ڈاکٹر چچا! آپ کو زیادہ دیر تک یہ احساس نہیں ہوگا کہ میں آپ پر بوجھ ہوں۔ آپ نے مجھے بیٹی سمجھا اور میں بیٹی بن گئی۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ میں بڑی ہو جاؤں تو میری شادی آپ کو ہی کرنا پڑے گی۔

نہیں، نہیں، ڈاکٹر چچا میری تعلیم تک آپ میرا خیال رکھئے۔ مگر میری شادی کا ہرگز نہ سوچئے۔ مجھے شادی نہیں کرنا ہے۔ میری روح سدا تنہا رہی ہے۔ اور میں عمر بھر تنہا رہوں گی۔ کسی کو اپنی زندگی میں دخل انداز نہ ہونے دوں گی۔ کسی کو کیا حق ہے کہ میرے دکھوں اور محرومیوں میں شریک ہو۔ میری تنہائی کا روگ بیٹھے۔ میں جس حال میں بھی رہوں گی ٹھیک ہے۔

ڈاکٹر چچا آپ فکر نہ کیجئے — میں زیادہ عرصہ آپ کے لئے سوہانِ روح نہ بنوں گی۔ پر یہ سب کچھ تو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ مگر کوئی ہے جو ان آوازوں کی بازگشت کو روک دے۔ جو صبح کے اجالوں اور شب کی تاریکیوں میں مجھ سے سرگوشیاں کرتی ہیں۔ وہم بن کر میرے اعصاب پر

جھنجھوڑتی ہیں۔ ماضی کی چیختی چلاتی صدا بن کر میرے کانوں میں زہر گھولتی ہیں۔ تم کالی ہو منحوس ہو، چڑیل ہو، وہ سب سکول کی لڑکیوں تمسخرانہ ہنسی میں کیسے بھول جاؤں۔ میں نے ہمیشہ ان سب سے اچھا سلوک کیا ہے۔ بُرے لوگوں کے بارے میں بھی اچھے طریقے سے سوچا ہے۔ مگر یہ کوئی دینے لینے یا خرید و فروخت کا مسئلہ نہیں۔ یہ تو ہر شخص کا انفرادی سلوک ہے جو دوسروں سے روا رکھتا ہے۔

گیٹس کہتا ہے حسن دل میں ایک خوشی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ مگر مجھے دیکھ کر کس کے دل میں خوشی پیدا ہو سکتی ہے۔ حسن تو یہاں کہیں میرے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔

میرے کالج کی فضا کتنی وسیع ہے۔ بہار ہے پھول اور شادابیاں ہیں۔ سب سے بڑھ کر خوش مزاج، حسین اور پیاری لڑکیاں ہیں۔ تفریح کے مواقع ہیں۔ مگر مجھے ہنسی کیوں نہیں آتی۔ کیا مجھ میں اور دوسری لڑکیوں میں فرق ہے۔ پارٹیوں سے میں جان چراتی ہوں۔ شور ہنگامے مجھے خوف زدہ کر دیتے ہیں۔ کسی فنکشن میں جاؤں تنہائی آسیب کی طرح میرا پیچھا کرتی ہے۔ دنیا میں میرے کسی دوست کے نہ ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ مجھے یاد دلاتی ہے کہ اب اس دھرتی پر کسی سے تیرا خون کا رشتہ نہیں رہا۔ کتنے سالوں سے یکسانیت کے جہنم زاروں میں بھٹک رہی ہے جیسے کوئی منزل یا ٹھکانہ نہ ہو۔ خانہ بدوشوں کی طرح جن کی ساری زندگی ایک راستہ ہوتی ہے منزل کوئی نہیں۔ کوئی زمین ان کی اپنی نہیں ہوتی۔ جس پر وہ اپنا گھر بنا کر رہ سکیں۔

گو ڈاکٹر چچا نے میری زندگی میں بڑی تبدیلیاں لانے کی کوشش کی ہے۔ میری ہر ضرورت کا خیال رکھا ہے مگر میری اندرونی دنیا میں کوئی رنگ نظر نہیں آتا۔ سرخ، سبز، نیلا، پیلا، سفید اور سیاہ، صرف ایک بے رنگ سلیٹی پردہ تنا ہوا ہے چاروں طرف۔

اس پردے کی بے رنگی دور کرنے کے لئے کئی دنوں سے جب بھی وہ فارغ ہوتی کوئی نہ کوئی منظر کاغذوں پہ بنانے کی کوشش کرتی۔ اسے یاد تھا۔ بچپن میں وہ چاک اور کوئلے سے گھر کی دیواروں اور فرش پر آڑی ترچھی لکیریں لگاتی تھی۔ کوئی درخت، پھول، بوٹا بنا کر اس میں رنگ

بھرتی تھی۔ اب کالج میں پھر بچپن کا وہ ڈھکا چھپا شوق جاگ اٹھا تھا۔ اسے امّی کی جھڑکیاں یاد آگئیں۔ جب سلیٹ پر اس نے انسانی شکل بنائی تو اماں نے دبی زبان سے اسے روکا۔ اس کے فضول شوق کی حوصلہ شکنی کی۔

"تصویر بنانے والا جہنم میں جائے گا۔ اصل خالق تو خدا ہے۔ جس نے اس کی نقل کی۔ اس نے گناہ کیا۔"

اماں بی اسے مذہبی مسائل سمجھانے کے علاوہ اس کے اس گمراہ کن شوق کو بھی ختم کرنے کے حق میں تھیں:۔

"قیامت کے دن ان پرندوں اور انسانوں میں جان ڈالنی پڑے گی۔"

"پھر کیا ہوا۔ جان ڈال دیں گے۔"

"اوئی اللہ تو تصویروں میں جان ڈالے گی۔" پانچویں جماعت کی طالبہ کے صاف جواب نے اماں بی کو چونکا دیا۔

'یہ چھوکری یا تو زیادہ سمجھ دار ہے ورنہ پھر اس کا دماغ گمراہ ہے۔"

"تو اور کیا اللہ میاں سے کہہ دیں گے۔ پلیز ان میری بنائی ہوئی تصویروں میں جان ڈال دیں۔ ہماری امّی کا شوق ہے کہ پرندے بولیں۔"

"بھلا میں کیوں تصویروں کو جاندار کرانے لگی۔" اماں بے حد سنجیدہ ہو جائیں۔

یوں وہ ہنسی ہنسی میں اماں سے بڑی مزیدار باتیں سنتی۔ اسے یاد تھا۔ شروع میں اماں نے اسے عربی کا قاعدہ پڑھنا سکھایا تھا جس میں لکھا تھا۔

"اللہ ایک ہے۔" وہ ضد میں آ کر کہتی۔

"اماں! اللہ ایک کیوں ہے؟ میں تو دو کہوں گی۔"

اماں کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ وہ اللہ کے معاملے میں بحث نہ کیا کرے۔ سیدھی طرح شرافت سے اللہ کو ایک ہی سمجھ جائے جیسے دنیا بھر کے مسلمان ایک خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ مگر رضو اللہ کے

معاملے میں ہمیشہ ہی نوک جھونک کرتی — اسی لئے اماں کبھی کبھی بھڑک اٹھتی۔

"جہنم میں جائے گی نجات — اس طرح اللہ میاں خفا ہو جاتے ہیں۔"

"میری ذرا سی بات پر اللہ میاں خفا ہو جائیں گے اور وہ جو چور، ڈاکو اور سمگلر راتوں رات کوٹھیوں اور کاروں کے مالک بن جاتے ہیں۔ کسی کو نہیں بتاتے کہ یہ دولت ہم نے کیونکر حاصل کی ہے۔ ایسے بے ایمان قاتلوں سے اللہ کیسے حساب لے گا؟"

"نہیں بیٹی! جہنم بڑی بری جگہ ہے۔"

"اس گھر سے تاریک اور ہماری گلی سے تنگ جگہ تو نہ ہوگی۔ جہاں رات کو خرگوش جتنے بڑے چوہے آزادی سے دوڑتے پھرتے ہیں۔ لندن میں طاعون چوہوں کی وجہ سے پھیلا تھا۔"

"جنت میں دودھ کی نہریں ہوں گی۔ شیریں پھلوں کے باغ۔" اماں نے یوں جنت کی حمایت کی۔

"کیا کوئی شخص کوہ قاف دیکھ کر آیا ہے جہاں پریاں رہتی ہیں؟"

"نہیں۔ کسی نے کوہ قاف نہیں دیکھا۔"

"تو پھر جنت بھی ایک خیالی چیز یا جگہ ہے۔ کوئی وہاں سے ہو کر نہیں آیا۔"

"بیٹی! تو مذہب میں بڑی نکتہ چینی کرتی ہے۔ تجھے کون ایسی فضول باتیں سکھاتا ہے؟"

"کئی باتیں آدمی اپنے آپ سیکھ لیتا ہے۔"

آج اماں بی کی وفات کو چار سال ہو چکے تھے۔ ان کی برسی کے موقع پر وہ امی اور ابو کی قبر پر پھولوں کے ساتھ آنسوؤں کی مالا نذر کرنے جاتی تھی۔ قبرستان ایسی جگہ تھی جہاں پہنچ کر اسے زندگی کی ساری جد و جہد بے سود نظر آتی۔ اس کے بس میں ہوتا تو اس شہر خموشاں کے ایک گوشے میں ایک جھونپڑی بنا لیتی۔ ایک دن دبی زبان سے اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو ڈاکٹر بھیا نے ایسی ڈانٹ پلائی کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

"ہمارے جیتے جی ایسی بے ہودہ باتیں سوچنے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں اپنے خیالات پر کنٹرول کرنا ہوگا۔ ورنہ ذہنی مریض بھی تو انسان ہوتے ہیں۔ اگر تمہیں پڑھائی کے بعد فرصت ملتی ہے تو

کچھ کھانے پکانے کی طرف توجہ دیا کرو۔ ٹائپ شارٹ ہینڈ سیکھو۔
مجھ سے جو ممکن ہوتا ہے میں تمہارے لئے کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اپنی طویل غیر حاضریوں اور مصروفیتوں کی وجہ سے تمہاری ہر بات میں نہیں سن سکتا۔ جو چیزیں اپنے اختیار میں نہ ہوں اور ہم تبدیل نہ کر سکتے ہوں۔ انہیں ویسے ہی قبول کرنا پڑتا ہے۔ میں اپنا زیادہ وقت ہسپتال میں رہنے پر مجبور ہوں۔ شاید اس لئے کہ وہاں کئی ڈاکٹر اور دوسرا میڈیکل سٹاف مریضوں کی دیکھ بھال اور علاج کے لئے موجود ہے مگر وہ ایمانداری سے اپنا فرض انجام نہیں دیتا۔ بہت سے ڈاکٹروں اور نرسوں میں جذبے اور خلوص کی کمی ہے۔ جس کی وجہ سے کئی زندگیاں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ ان کے اپنے جذبات کی خودغرضی سے کئی گھرانوں کے چراغ گل ہو جاتے ہیں۔ میں جب تک ہسپتال میں رہتا ہوں۔ اپنے ماتحت سٹاف کی باقاعدہ چیکنگ کرتا ہوں۔ جو لوگ ڈیوٹی پر دیر سے آتے ہیں۔ ان کی رپورٹ ہسپتال کے ایڈمنسٹریٹر تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ تاکہ مریض بن آئی موت نہ مر جائیں۔ میں اپنے مشن میں کچھ اتنا مگن ہوں کہ شادی بھی کرنے کی فرصت نہیں مل سکی اور اب تو کچھ عادت سی ہو گئی ہے۔ اور پھر میری گاڑی اس جنکشن سے گزر چکی ہے جہاں آدمی گھر بسانا چاہتا ہے۔"

ایک شام رضوانہ کو کئی برسوں کی بھولی بسری یاد آ گئی،

"ڈاکٹر چچا آپ کو بتانا پڑے گا کہ میں کس کی بیٹی ہوں!"

ڈاکٹر آذر اس ناگہانی حملے کے لئے تیار نہ تھے۔ چونک کر بولے۔

"یہ بات کس نے تمہیں بتائی ہے۔"

"امی نے انتقال سے تھوڑی دیر پہلے مجھے بتایا تھا کہ میں ان کی منہ

بوڑھی ہو چکی ہوں۔"

"تو یہ بات ہے۔" ڈاکٹر چچا تاسف سے بولے۔

"مجھے دکھ ہے آپ نے یہ بات مجھ سے چھپائی ہوئی ہے۔ اب میں اتنی بچی نہیں ہوں کہ چھوٹے چھوٹے حادثے نہ سہہ سکوں۔ سچ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو مجھے آپ ضرور بتائیے، آپ کو اپنی سب سے عزیز چیز کی قسم۔"

"رضو تم کبھی کبھی عجیب ضد کرتی ہو۔ یہ تو تمہیں پتہ ہوگا کہ شادی کے بعد پندرہ بیس سال کے بعد زیب النساء کے یہاں بدقسمتی سے ایک بچہ ہوا تو پیدائش سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ اور ہم جان چکے تھے کہ اب زیبی کبھی ماں نہ بن سکے گی۔ اس دن ہسپتال سے رخصت ہوتے ہوئے سلیم میاں نے درخواست کی کہ اگر کوئی لاوارث بچہ مجھے مل سکے تو میں انہیں دے دوں۔ اس واقعہ کے پندرہ دن بعد شہر کے ایک دولت مند اور حسن کا خاص ذوق رکھنے والے بزنس ایڈمنسٹریٹر کی حسین بیگم نے ہمارے ہسپتال میں ایک بچی کو جنم دیا۔ بیوی کو تو خبر نہ ہو سکی۔ مگر شوہر نے اپنی اور بیوی کی صورت سے مختلف چند گھنٹے پہلے دنیا میں آنے والی بچی کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ کہ یہ بچی میری بیوی کے کردار کے لئے ایک چیلنج ہے۔ اسے ختم کر دو۔ اور میں نے بچی اپنے دوست سلیم میاں کے حوالے کر دی۔ سلیم اور زیبی نے حتی المقدور چاہا کہ وہ تمہیں اپنے سے بہتر زندگی دیں۔ انہوں نے تمہیں خوش رکھنے کی پوری کوشش کی اور اپنی زندگی گذار کر چلے گئے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ تم کیا کرتی ہو۔"

ڈاکٹر چچا! پھر اس شخص نے کبھی آپ سے اس بچی کے بارے میں نہیں پوچھا۔ مگر انہیں اس کے خیال میں تو مر چکی تھی ہیں۔ ۔۔؟"

"میں نہیں سمجھتا کہ میں نے تم پر کوئی احسان کیا ہے مگر جو کچھ مجھ سے ہو سکا ہے وہ میں نے کیا ہے اور کرتا رہوں گا۔ تم ایک زندہ حقیقت ہو۔ خون کے مقابلے میں درد اور پیار کا رشتہ سب سے بڑا رشتہ ہے۔ تمہاری زندگی اتنی ہی اہم پہلے دن تھی اور اتنی اہم آج بھی ہے۔"

"ڈاکٹر چچا مجھے آپ سے بہت کچھ ملا ہے۔ سب کچھ جس کی مجھے توقع بھی نہیں تھی۔ میں آپ کی کس درجہ شکر گزار ہوں۔ اس کا اندازہ آپ کو نہیں ہو سکتا۔"

اپنوں کا کیا شکریہ ——— میں تو سمجھتا ہوں۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے پیسہ، وقت، محبت۔ اور شفقت وہ تنہا ہمارا اثاثہ نہیں دوسروں کا بھی اس میں حصہ ہے بڑے ہی تنگ دل اور بدقسمت ہیں وہ لوگ جو ہر چیز کو تنہا اپنی ملکیت سمجھتے ہیں اور مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنے سامان زیست میں دوسروں کو بھی شریک کرتے ہیں، میری بھی خواہش ہے کہ ایسے لوگوں کی فہرست کے کسی کونے میں میرا بھی نام لکھا جائے۔"

"جیسے ابو بن ادھم نے فرشتے سے کہا۔ اپنی سنہری کتاب میں میرا بھی نام لکھ لیجئے، جو اللہ اور اس کے بندوں سے محبت کرتے ہیں۔ اگلے دن جب فرشتے نے اپنی وہی کتاب دکھائی تو ابو بن ادھم کا نام سر فہرست تھا اور آپ کا نام ——"

"اب رہنے دو ہم تو کل گزرے وقت کی داستان بن جائیں گے۔ مگر میری آرزو ہے کہ تم ایک محنتی اور مستقل مزاج ہر حادثے کو ہنسی خوشی جھیلی جانے والی لڑکی بنو۔"

"تو کیا میں پتھر بن جاؤں۔"

"پتھروں کو تراش کر ہیرے بنائے جاتے ہیں۔"

اس شام گو ڈاکٹر آذر نے ہر بات بڑے عام سے سطحی انداز سے تبائی تھی مگر اس رات رضو سو بھی نہ سکی۔ اس کے بعد کئی دن تک ڈاکٹر صاحب بارہ بجے کے بعد ایک یا دو بجے جب وہ ڈیوٹی سے واپس آئے تو رضو کے کمرے میں بتی روشن دیکھی۔ دن کو انہوں نے نوٹ کیا وہ ہنستی بھی کم تھی اور بات بھی کرتی تھی۔ اپنی ہم عمر کالج کی لڑکیوں کی طرح وہ چمکیلی آنکھوں والی چالاک و چونچال شوخ لڑکی نہیں لگتی تھی۔

ایک شام کسی آرٹسٹ کی تصویری نمائش میں رضو جانا چاہتی تھی مگر ڈرائیور لاپتہ تھا۔ دیر ہو جانے کے خیال سے وہ نوکر سے ڈرائیور کی غیر ذمہ داری کی وجہ سے الجھ رہی تھی۔ اتفاق سے ڈاکٹر آذر گھر پر تھے۔ دن بھر میں پندرہ بیس منٹ کے لئے وہ ایزی چیئر پر نیم دراز ایک آدھ سگریٹ سلگا کر جسمانی اور نفسیاتی طور پر تھوڑا سا آرام محسوس کرتے تھے اور پھر اپنی ڈیوٹی پر جانے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔

وہ اس وقت نوکر سے ڈرائیور کی اس لاپرواہی کی وجہ سے الجھ رہی تھی کہ ڈاکٹر آذر کو اپنے کمرے سے باہر آتے دیکھ وہ دانتوں میں انگلی دبا کر رہ گئی۔ وہ زیر لب مسکرائے۔

"اب ایسی بھی کیا کاہلی میری مانو تو ڈرائیور کی محتاجی چھوڑ دو۔ وہ بھی انسان ہے۔ گھر بار والا ہے۔ سو کام پڑ جاتے ہیں۔ میں نے تو ہفتوں اس کے نہ آنے کا بھی گلہ نہیں کیا۔ اتوار اور جمعہ کو وہ آجاتا ہے۔ پانچ دن ہفتے میں ضرور وہ کہیں اور کام کرتا ہے۔ تم ڈرائیونگ سیکھ لو مجھے تو گاڑی کی اتنی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ تمہیں جہاں جانا ہو وقت پہ پہنچ جایا کرو گی۔"

"اب میں ڈرائیونگ سیکھوں۔" وہ تعجب سے بولی۔

"تمہاری عمر کی لڑکی تو امریکہ میں ٹرک اور طیارے بھی چلا لیتی ہیں۔ یہ تو پھر کار ہے۔"

"میں ڈرائیونگ کی تو کوئی حادثہ کر بیٹھوں گی۔"

"اس لئے شاید عملی طور پر تم کرتی کچھ ہو اور ذہن کسی اور دنیا میں ہوتا ہے۔"

"آپ کو کیسے پتہ چلا۔"

"ہسپتال میں مریضوں کا علاج کرنے کے ساتھ ساتھ میں ان کے BEHAVIOR پر بھی نظر رکھتا ہوں۔ خاص طور پر جو بچے ذہنی پراگندگی کا شکار ہوں۔ ان کا تو صرف کردار کی تمیز سے علاج ہوتا ہے۔"

یوں باتوں باتوں میں رضو نے تو ڈرائیونگ سیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔

اتنی تھکن کے باوجود ڈاکٹر آذر اسے آرٹ کونسل چھوڑنے چلے گئے۔

نمائش کے بعد رضو در کشتے میں خود ہی گھر آگئی۔

اس شام وہ جانے کیوں بڑی خوش خوش سی تھی۔ کھانے کی میز پہ آج ڈاکٹر چچا کو دیکھ کر اس کے دل میں مسرت کی کرن سی چمکی۔

کھانے کے دوران کوئی خاص بات نہ ہوئی۔

"کوفی یا چائے؟" خالہ ماں نے پوچھا۔

"رضو کو کوفی بہت پسند ہے آج کوفی ہی سہی۔" ڈاکٹر آذر فراخدلی سے بولے

کوفی پینے کے دوران وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑی۔

آپ کو پتہ ہے وہ شخص کتنا عقلمند اور دور اندیش تھا جس نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ اس ناپسندیدہ بچی کو قتل کر دو۔"

"تم جہانگیر قدر کی بات کر رہی ہو۔ تمہیں پتہ ہونا چاہیئے کہ جنم دے کر گھر سے دھتکارنے والے ماں باپ نہیں کہلاتے۔ اصل باپ وہی ہوتے ہیں جو ہمیں پالتے اور پیار دیتے ہیں، جو دوسروں کو زندہ رکھنے کے لئے خود مر جاتے ہیں۔ والدین اور بچوں کا رشتہ پیدا کرنے اور مار نے کی حد تک نہیں۔ انہیں پالنا اور بہتر زندگی دینا بڑے جذبے اور ایثار کا معاملہ ہے اور اس عمل میں تمہارے امی ابو نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ ان کی زندگی اتنی طویل نہ تھی کہ تمہیں ایک مثالی لڑکی کے روپ میں دیکھ کر خوش ہوتے۔ رضو اگر تم اپنے جنم دینے والے والدین سے ملنا چاہو تو میں تمہیں ان سے ملا سکتا ہوں۔ مہینے دو مہینے بعد ان کا لاہور سے گزر ہوتا ہے۔ پر میں سوچتا ہوں تمہیں ان سے مل کر خوشی نہیں ہوگی۔"

"جنہیں دیکھا نہیں جو قطعی اجنبی ہوں، میرے دل میں انہیں دیکھنے کی کیا آرزو ہوگی۔"

"جب کبھی جہانگیر قدر لاہور آتے ہیں مجھ سے ملنے آتے ہیں ورنہ پھر فون کر کے حال ضرور پوچھتے ہیں۔"

"کیا وہ بہت خوش شکل آدمی ہیں۔" رضو اپنا اشتیاق نہ چھپا سکی۔

"ابھی تک ویسے ہی صحت مند اور دلکش شخصیت ہے ان کی۔"

"اور میری ماں کیسی ہے؟"

"تمہاری ماں تو مر گئی۔۔۔۔۔"

"اوہ معاف کیجیے جہانگیر قدر کی بیگم کیسی صورت کی ہیں۔ کیا ان کا کوئی اور بچہ بھی ہے؟"

"بے حد حسین خاتون ہیں ان کے آباؤ اجداد ایران کے رہنے والے تھے۔ جہانگیر قدر کی شادی کے بعد ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ شبنم اب تو وہ پندرہ سولہ سال کی ہوگی۔ بڑی پیاری بچی تھی۔ جب میں نے پہلی سالگرہ پر اسے دیکھا، بالکل چینی کی گڑیا لگتی

بھی میرا خیال ہے اب تم جا کر آرام کرو۔ اور میں ہسپتال چلتا ہوں کچھ سردی بھی ہو گئی ہے تم اچھی طرح کمبل اوڑھ کر سونا اور زیادہ دیر تک نہ جاگا کرو۔"

"ڈاکٹر چچا مجھے آپ اتنی نصیحتیں کرتے ہیں مگر میں دیکھ رہی ہوں، آپ زیادہ سے زیادہ سگریٹ پینے لگے ہیں۔"

"ہاں مجھے بھی اس کا احساس ہونے لگا ہے مگر میں اس چیز پر یقین رکھتا ہوں کہ اگر تھوڑی سی چیز خراب ہی کیوں نہ ہو۔ انسان کو اور خوشی دیتی ہو تو اسے کیوں چھوڑیں۔ زندگی میں جہاں بے شمار ناخوش کرنیوالی باتیں ہیں۔ وہاں ایک ذرا سی خوش رہنے والی چیز میں سگریٹ ہی تو ہے اچھا میں چلتا ہوں۔ آج نائیٹ ڈیوٹی ہے۔ صبح جب آؤں گا تو تم کالج جا چکی ہو گی۔"

"خدا حافظ ڈاکٹر چچا۔"

وہ اپنے کمرے میں جاتے ہوئے بولی۔

ڈاکٹر آذر آزادیِ خیال کے حامی تھے انہوں نے رضوانہ کے کسی شوق پر کبھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کبھی اسے دن بھر اپنے کمرے میں قید اور کبھی صبح سے لے کر شام تک گھر سے غائب پایا۔ محض تجسس کے لئے انہوں نے پوچھا تو وہ بتاتی: "آج سارا دن میں نے چڑیا گھر میں مختلف جانوروں کا جائزہ لینے اور مطالعہ کرنے میں گزارا۔ کچھ نوٹس بھی بنائے ہیں۔ گو یہ مسئلہ بہت دلچسپ ہے۔ مگر ان سب کو اتنے چھوٹے چھوٹے پنجروں میں بند دیکھ کر میرا بس چلے تو انہیں چھانگا مانگا یا سندربن میں چھوڑ آؤں۔

"خیر چھوڑو اس بحث کو ــ یہ بتاؤ۔ آج تمہارا سارا دن اپنے کمرے میں بند رہنے کا کیا سبب تھا؟"

"کچھ نہیں آج کل مَیں پینٹنگ کرتی ہوں۔"

یہ جواب ایسا مطمئن کرنے والا نہیں تھا، مگر رضو کا غیرِ متوازن [illegible] کبھی کبھی ڈاکٹر آذر فکر مند ہو جاتے۔ انہیں اس کی دیکھ بھال [illegible]

کوتاہی کا احساس تھا مگر ہسپتال ان کی نظر میں سب سے توجہ طلب جگہ تھی وہ شام چار بجے گھر آنے کے لئے سوچتے مگر ہسپتال جیسی جگہ جہاں قدم قدم پر حادثات تھے، نہیں معلوم ہوتا اگلے لمحے کیا ہو گا۔ ایمر جنسی کیس میں یک بیک مریضوں کی حالت سنبھلتی اور بگڑ جاتی۔ انہیں فوری طور پر دیکھنے دوائیوں اور انجکشن کا ردِ عمل دیکھنے کے لئے ڈاکٹر آذر سے بہتر اور کوئی نہ تھا۔ وہاں حتیٰ کہ ہسپتال کی ماتحت نرسیں بھی ان کے اُن تھک وجود کے اندر کبھی نہ تھک کر چھلکنے والی روح ان کی اصول پرستی کم گوئی اور محتاط رویے کو دیکھ کر سوچنے لگتیں، جانے کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔ یہ شخص زندگی بھر شادی نہیں کی۔ کئی نرسیں اپنی سے دگنی عمر کے اس ڈاکٹر کے خواب دیکھتیں، جس نے کبھی ناقدانہ نظروں سے اپنے ساتھ کام کرنے والی سسٹر اور نرسوں کو نہ دیکھا تھا، کوئی پارٹی کسی ڈاکٹر کو خوش آمدید کہنے کے لئے ہوتی یا الوداعی ڈاکٹر آذر کو اس پارٹی میں آتے ضرور دیکھا جاتا، پر جاتے ہوئے کبھی کسی نے نہ دیکھا تھا، اس وقت جب پارٹی میں لوگ ہنسی مذاق میں مصروف ہوتے سینیئر جونیئر کا فرق مٹ جاتا اور بے حد محتاط رویئے والے ڈاکٹر مظہر اور کرنل یوسف بھی بڑی شوخی کے موڈ میں ہوتے لوگ آذر کو ڈھونڈتے مگر وہ اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے ہسپتال آجاتے۔

ایک دن مسز لچھمی نے سٹاف انجم کو بتایا۔

”ارے تمہیں پتہ ہے ڈاکٹر آذر نے اپنی زندگی ہسپتال کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ کیا مجال ہے جو پچھلے دس پندرہ سالوں میں ایک بھی سکینڈل ان کے بارے میں پھیلا ہو۔“

”ایسی راہبانہ زندگی تعجب کی بات ہے۔“

نئی آنے والی مسٹر ریحانہ نے دل ہی دل میں سوچا اور ڈلیوٹی پر چل دی۔

کئی واقعات قدم قدم پر ڈاکٹر آذر کی ایک ہی رخ پہ بہنے والی ندی جیسی زندگی کا راستہ روکتے سوال کرتے پوچھتے ان کی زلیست کی پگڈنڈی کا رخ بدلنے کی کوشش کرتے، مگر وہاں تو گلیشیئر تھے جن پہ ہر موسم سرما میں برف کی ایک اور تہہ جم جاتی ہے۔

ایک دن ڈاکٹر آذر نے رضو کے ہاتھ کی بنائی ہوئی تصاویر کی تعریف کی سال بھر میں گاہے گاہے بنائی جانے والی تصاویر اور سبزیاں اس کے کمرے میں ہی بند تھیں۔ اس نے اپنی تصاویر دکھانے کے لئے کبھی اپنی کلاس فیلوز کو دعوت نہ دی تھی۔

"کیا ساری تصاویر اپنے لئے ہیں کبھی انہیں باہر کی ہوا بھی لگاؤ۔ میں بھرا سڑے بسنے جسموں کی چیر پھاڑ کرنے والا تمہارے آرٹ کو کیا سمجھوں۔"

"ڈاکٹر چچا ابھی میں وہاں تک نہیں پہنچی، جہاں پہنچ کر آدمی صحیح معنوں میں فنکار کہلائے۔ میری تصویریں ابھی اس قابل نہیں کہ میں انہیں کسی نمائش میں بھیجوں۔

ایف اے میں اس نے کچھ بے سروپا سی تصویریں بنا لی تھیں جنہیں صرف وہ ہی سمجھ سکتی تھی۔ الجھی ہوئی سوچیں مگر بی اے میں آکر اس کے ہاتھ میں صفائی ترتیب و تناسب رنگوں کا بہتر انتخاب آ گیا تھا جس سے اس کی تصویروں میں حقیقت کا رنگ آ گیا، کالج میں وہ سب سے الگ تھلگ رہتی۔ اس کی ہم جماعت لڑکیوں نے کبھی اس عام سی صورت والی لڑکی سے اس کے حالات کے بارے میں نہیں پوچھا تھا، وہ اپنے ایک آدھ ہم جماعت سے اس کی خاموشی اور اداسی کی وجہ محض دلچسپی کے لئے جاننے کی کوشش کرتیں مگر وہ ٹال جاتی

آدمی ہر ایک کو اپنے اندر کی دنیا نہیں دکھا سکتا۔ اور یہ میری تصویریں تو بس ایسے ہیں جیسے۔

"جگر کی آگ نے پھولوں کا روپ دھارا ہے۔"

دوسروں کو اپنے الام کی آگ میں ہم کیوں جلائیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ آدمی اپنی ذات کے پنجرے میں تنہا رہے یا پھر چائے ایک پیالی میں ڈوب جائے۔ اللہ چائے مجھے کتنی پسند ہے اور پسندیدہ چیز کیسے آدمی کے لئے اس درجہ زہریلی بن جاتی ہے یہ اسے کبھی سمجھ نہ آیا تھا۔ مگر جس دن ڈاکٹر نے شب بیداری اور چائے کو اس کی صحت کے لئے خطرہ قرار دیا تو وہ جھنجھلا گئی۔ کتنا عجیب شخص ہے۔ یہ طویل شب بیداریوں کے ہی تو وہ لمحے تھے۔ جب میں نے خوب صورت پورٹریٹ دلکش سبزیاں اور مختلف تاثرات والے چہرے بنائے۔ رات کے کسی لمحے اس کے ذہن میں کسی خیال کا خاکہ ابھرتا اور وہ دوسرے لمحے کا انتظار کئے بغیر کینوس اور برش اس کے ذہن میں کسی اگر ڈاکٹر یوسف کی بات مانوں تو یہ آرٹ ورک کون کرتا۔ اور تصویروں کی نمائش میں شرکت کون کرتا۔ اور شب بیداریوں کے ساتھ اگر دو چار کپ چائے۔ میں پی لوں۔ تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ یہ چائے ہی تو ہے زہر تو نہیں جسے پی کر میں مر جاؤں گی۔

لوگ تو شراب پیتے ہیں اتنی تیز وسکی وادکا اور جن پیتے ہیں کہ سینہ میں بھی اندر سے جل جائے۔ یہ اندر کی دنیا بھی تو کبھی حسین نہیں ہوتی۔ یا اگر لوگ سخت جان نہیں تو زندگی ضرور ایک پتھریلی چٹان ہے۔ لوگ یہ سب کچھ کرتے ہیں مگر انہیں سرطان نہیں ہوتا۔ اگر مہنگی شراب نہ ملے تو سستی وسکی پیتے ہیں۔ وہ بھی نہ ملے تو سپرٹ پیتے ہیں L.S.D کھاتے ہیں۔ میر وانہ اپنے

پھیپھڑوں میں بھرتے ہیں یہ نہ ہو تو مارفیا کے انجکشنوں سے اپنے بازو چھلنی کرتے نہیں تھکتے۔ زندگی کے مصائب اور اس کی برقراری یہ دلچسپ توازن ہے اور غالب نے خوب کہا ہے۔

اک گونا بے خودی مجھے دن رات چاہیئے،

یہ راکٹ کھا کر سڑکوں کے بیچ مدہوش رہنے والے زندہ رہنے کے لیئے بے خود ہوتے ہیں اور بے خودی انہیں موت کی راہوں پہ لے آتی ہے۔ موت سے آنکھ مچولی کھیلنے والے اس شہر میں کتنے ہزار انسان ہیں جو جینے کے لیئے مرنے اور مرنے کے لیئے جیتے ہیں، جانے یہ کھیل کب سے جاری ہے۔

مگر میں ان سب لوگوں سے کتنی مختلف ہوں۔ اور اگر میں اپنی ایک پسندیدہ چیز کو اپناتی ہوں تو ڈاکٹر یوسف کیوں اعتراض کرتے ہیں یہ نہ کرو وہ نہ کرو۔ ایک زمانے سے مجھ پر دوسرے اپنے فیصلے صادر کرتے رہے ہیں۔ میں جیسے کوئی پتھریلی چٹان ہوں۔ ایک وقت تھا جب میں چھوٹی تھی۔ اب تو میں بی اے میں پڑھتی ہوں۔ اب مجھے کسی نے کچھ کرنے سے روکا تو میں لڑ پڑوں گی۔ اور ڈاکٹر چچا مجھے چاہے اجڈ اور بد تمیز ہی قرار کیوں نہ دے دیں۔ میں اب اپنے لیئے خود فیصلہ کروں گی۔ کیا اچھا ہے کیا برا ہے کم از کم اپنے لیئے تو یہ سوچنے کا مجھے اختیار ہونا چاہیئے۔

بی اے میں داخلہ لینے کے بعد رضو نے اپنی چند ایک بہترین پینٹنگ آرٹ کونسل کی تصویروں کی نمائش میں بھیجیں۔ گرمی وغیرہ پہاڑی مقامات کی نیچرل منظر کشی کے لیئے وہ سوات ایبٹ آباد اور کاغان سے گئی، دیہاتی ماحول کی عکاسی کے لیئے وہ اپنی دو ایک ہم جماعت کے ساتھ چھٹیوں میں دیہات میں چلی جاتی۔ اس طرح اسے نیچر کے قریب رہنے کا موقع ملتا رہتا۔ اس کی ہر تصویر دوسری تصویر سے

مختلف ہوتی، گو آرٹ کے موضوع پر اس کی کوئی خاص سٹڈی نہ تھی ۔ مگر تصویروں میں نیچرل ماحول کے ساتھ اپنے تخیل کا حسن بھی شامل ہوتا ۔ یہ اس کے لئے ضروری تھا، ورنہ ہو بہو تصویر چاہیئے ہو تو فوٹوگرافی میں آدمی مہارت حاصل کرے۔

کئی دفعہ ڈاکٹر چچا بھی یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ آرٹ میں اس کی تصویریں کتنی بہتر ہوتی جا رہی ہیں ۔ یقین نہیں آتا کہ یہ دبلی پتلی لڑکی کے شاہکار ہیں اسی بچی کے جسے ایک دن کمبل میں لپیٹ کر میں کسی کو دے کر آیا تھا، جیسے بیس سال کی بجائے یہ کل کی بات ہو۔

اس ماڈرن دور میں جب اپنے آپ کو قابل توجہ بنانے کے لئے لوگوں کے لباس میں تیزی سے تبدیلی آ رہی تھی، شخصیتوں پر ایسی ملمع سازی ہو گئی تھی ۔ کہ اصل صورت کو پہچاننا مشکل ہو گیا تھا ۔ اور رضو زمانے کی تبدیلیوں سے بے نیاز اپنی ہی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی، پر اس کا فن دن بدن نکھر رہا تھا ۔ آرٹ کے حلقے میں اس کی شب بیداریوں کی داد دی جاتی ۔

کئی لوگ جو اسے جانتے نہ تھے ان کا خیال تھا کہ رضو بھاری بھرکم کسی بڑے آدمی کی بیوی ہوتی جو اپنے شوہر کی وجہ سے تیزی سے مشہور ہو رہی ہے، جس کی گردن غرور اور فخر سے تنی ہو گی، مگر اس کے مداحوں نے اسے پہلی دفعہ دیکھا تو حیران رہ گئے، وہ تو کہانیوں اور افسانوں کی حسین گڑیوں کے برعکس سانولی سی عام سی صورت والی دبلی سی انیس سال کی لڑکی تھی، ایک لڑکے کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"ارے یہ آپ ہیں تو اتنی چھوٹی سی ہیں ۔"

رضو تو کچھ نہ بولی ۔ مگر اس کی ہم جماعت نادرہ کہے بغیر نہ رہ سکی

"آپ کا خیال ہے ان کی عمر آپ کی عمر جتنی ہونی چاہیئے" "اس سے کیا [illegible] کیا حاصل — کہ میری عمر کیا ہونی چاہیئے تھی۔" رضو نے کہا۔

"یہ بات نہیں مس —" لڑکے نے زبان سے تو کچھ نہ کہا، مگر اس کی بے زبانی شکایت کر رہی تھی۔ "میں نے کبھی نہ سوچا تھا، آپ ایسی ہوں گی۔ میرا تو خیال تھا آپ اپنے تخیل کی طرح حسین ہوں گی۔ دودھ جیسی سفید رنگت ہنس جیسی گردن — سیاہیوں جیسی کالی آنکھیں — شانوں پر جھکی ہوئے سیاہ زلفیں اور ہونٹوں پر مونا لیزا جیسی مسکراہٹ —" رضو اپنے دل میں چلا پڑی — "یہ تخیل میں نے خود بنایا ہے۔ اور مجھے کس لئے بنایا ہے — یہ تم اپنے آپ سے پوچھو۔"

اس تقریب کے بعد رضو پر بڑی افسردگی چھائی رہی۔ اس نے تہیہ کر لیا۔ وہ اب کبھی کسی نمائش میں نہیں جائے گی، صرف اپنی تصاویر بھیجنے پر اکتفا کرے گی۔

انہی دنوں گورنمنٹ کالج میں ملک کے آرٹسٹوں کی تصویروں کی نمائش تھی، رضو کو دعوت نامہ ملا اور اسے جانا پڑا۔ اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ وہ کئی طلبا کی آٹوگراف بک کے درمیان گھری ہے۔ اس نے ہر صفحے پر کچھ لکھ کر دستخط کر دیئے، پھر دل ہی دل میں سوچا، میں تمہیں کیا دوں۔ میرے پاس دینے کے لئے کچھ بھی نہیں، تم لوگ مجھے جانتے ہو۔ مگر میں گمنام مجرم کی طرح کسی تقریب میں جاتی ہوں، مگر کوئی نہ کوئی ستم گر مجھے پہچان کر دوسروں کو بتا دیتا ہے۔ اور میں جانے کتنے برسوں سے خود کو ڈھونڈ رہی ہوں، اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش میں ہوں، میں اپنے انجام کو کھوج رہی تھی۔ مگر کسی نے کہہ دیا — کیا تمہیں اپنے آغاز کا پتہ ہے اور مجھے اپنی لاعلمی

اور جہالت کا احساس ہوا۔ یہاں تو انجام کے ساتھ آغاز کا بھی پتہ نہیں۔ صرف یہ پتہ ہے کہ اب کیا ہو رہا ہے۔

کسی اخبار یا رسالے میں اور کئی مشہور آرٹسٹوں کے ساتھ میری بھی تصویر آتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ اس اخبار کے پچاس ٹکڑے کر کے پھینک دوں۔ اپنی تصویر دیکھ کر میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے استہزایہ انداز میں ہنستی جاؤں۔ یہاں تک کہ ہنس ہنس کر بے ہوش ہو جاؤں۔

ہفتے کو شہر کے اونچے درجے کے ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں تصویری نمائش تھی۔ نمائش میں کالج فائن آرٹ کے طلبا بھی آئے ہوئے تھے ان کی خواہش تھی کہ رضو سے ماڈرن آرٹ کے موضوع پر کچھ تبادلہ خیال ہو۔ وہ اکیلی دوسرے آرٹسٹوں کے شاہکار دیکھ رہی تھی کہ چند کالج کی شوخ طالبات نے اسے جا لیا۔ ایک نے اپنی آٹو گراف بک آگے بڑھا دی۔ دوسری نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تو یہ ہیں رضوانہ — کیوں تمہیں شک ہے — کتنا پیارا نام ہے —"

"میں تو سمجھی تھی یہ بڑی حسین ہوں گی اپنے ناولوں اور شاہکاروں کی طرح — مگر یہ تو میری توقع کے خلاف ہیں"

عظمیٰ نے اگرچہ آہستہ سے کہا تھا۔ مگر وہ بات برچھی کی طرح رضو کے کانوں سے ہوتی ہوئی دل کی گہرائیوں کو کاٹ گئی۔

آٹو گراف پر اس نے لکھا۔

ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔

"رضوانہ"

"مجھے خوشی ہے کہ آپ کو میرے شاہکار پسند ہیں اور مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے خیال جیسی نہیں ہوں، مجھے خوشی ہے کہ میرا نام اچھا ہے۔ لوگ جیسے خود اچھے نہیں ہوتے، ان کا نام بھی اچھا نہیں ہوتا۔ مجھے اپنے نام پر فخر ہے۔"

کیسے پتھر یلے دل سے احساس سے عاری ہو کر رضو نے کہا تھا۔

"آپ میری سہیلی کی بات کا برا نہ مانیئے یہ کچھ زیادہ ہی شوخ ہے۔" ایک لڑکی بولی۔

"اس جمہوریت کے دور میں ہر شخص کو آزادی رائے کا حق ہے ـــ" عذرا چمک کر بولی۔

"پر جہاں سے دوسروں کی ناک شروع ہوتی ہو۔ ان کے احساسات مجروح ہوتے ہوں۔ وہاں سے آپ کی آزادی کی سرحد ختم ہو جاتی ہے ـــ" رضوانہ کہے بنا نہ رہ سکی۔

"میں اپنی سہیلی کے رویئے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" رضو مسکرا کر ان سے رخصت ہوئی۔

نمائش سے وہ جلد ہی گھر آگئی۔ مگر اس کے کانوں میں عظمیٰ کی آواز کی گونج تھی۔ نہ مٹنے والی پتھر کی لکیر کی طرح ـــ

"ہم نے تو سمجھا تھا آپ بڑی سمارٹ اور حسین ہوں گی آپ تو یونہی سی نکلیں۔"

"معاف کیجئے میری سہیلی کچھ زیادہ ہی شوخ ہے برا نہ مانیے۔ خیال تو میرا بھی تھا کہ آپ ـــ"

"بہت حسین ہوں گی۔"

رضوانہ نے اپنے آپ جملہ مکمل کر دیا۔

اس کے سینے سے آتش فشاں کا دھواں نکلا اور ہونٹوں سے بھیانک سی چیخ نکل گئی۔

"ہاں میری دوستو جو تم نے سمجھا میں وہ نہ تھی اور میں جو کچھ تھی تم نے مجھے وہ نہ سمجھا۔ اور یہ کوئی نہ سمجھے گا۔ تمہارا کوئی قصور نہیں اور میں بھی تو بے قصور ہوں۔ اور میرے ابا انہوں نے بھی میرے بارے میں بہت کچھ سوچا تھا پر جب میں سامنے لائی گئی۔ تو وہ چلائے "نہیں یہ میری بیٹی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو بڑی بھیانک بچی ہے یہ میرے لیے ایک چیلنج میری بیوی کے اجلے کردار پر ایک دھبہ ہے اسے مار دو ختم کر دو۔ ڈاکٹر آذر اور اس دن میرے دامن سے خانہ بدوشی کا ایک پروانہ باندھ دیا گیا۔

یہ کیسی دنیا ہے یہ کیسی بستی کے لوگ ہیں جو گناہ خود کرتے ہیں پر پھانسی کے تختے عمر قید اور جیون بھر کی گھڑی سزا کسی اور کے لئے منتخب کرتے ہیں۔ انصاف کس در سے کوئی مانگے۔ کئی سوال ہیں۔ جن کا جواب ساری خدائی نہیں دے سکتی۔ کتابیں ہیں جو دکھ نہیں دیتیں۔ یہ تو بے ضرر دوستوں کی طرح ہیں۔ کبھی ساتھ نہیں چھوڑتیں۔ جب تک ہم خود نہ انہیں دور کر دیں۔ ایک شخص کتابوں کی طرح ہے۔ اور صد پیار بھی ۔۔

" اللہ میرے آذر چچا ۔۔ " مارے عقیدت کے رضوانہ کی پلکیں نمناک ہو گئیں شام کے اندھیارے میں وہ اپنے کمرے کے دریچے پر جھکی، دسمبر میں کھلے گل سیتقم کے پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔ زرد پھول اندھیرے میں بلی کی آنکھوں کی طرح چمک رہے تھے۔

میرے اچھے ڈاکٹر چچا آپ ہمیشہ سلامت رہیں۔ انسانیت کی خدمت کرنے والی طویل عمر پائیں۔ سدا مسکرائیں اور آپ کی محبت اور نگہبانی میرے لئے کوٹی

دھوپ میں برگد کی چھتر چھاؤں بنی رہے۔ ہر قطرہ قطرہ آب حیات مجھے ملتا رہے۔
میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔"

"کھانا تیار ہے۔" نوکر نے آٹھ بجے اطلاع دی۔

وہ کھانے کی میز پر آئی۔ ایک گلاس ایک پلیٹ اور چمچہ ایک کانٹا ایک چھری سلیقے سے رکھی تھی۔

وہ تھوڑے سے چاول کھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب نے فون کیا تھا۔ وہ دس بجے کے بعد آئیں گے۔" نوکر نے اطلاع دی۔

دسمبر کے اوائل میں شامیں کتنی اداس اور خنک ہوتی ہیں۔ وہ پھر دریچے میں آکھڑی ہوئی۔

بہت تاریکی پھیل جائے تو چیزیں معدوم ہو جاتی ہیں۔ دریچے میں جھکی جنگلی گلاب کی بیل کتنی سوکھ گئی ہے۔ کتنی عجیب منزلیں اور کتنے پُراسرار سونے راستے ہیں جن پر ہم گامزن ہیں۔

ہم نے کہاں جانا ہے نہیں معلوم اس نامعلوم منزل کا کتنا فاصلہ طے ہو چکا ہے اور کتنا باقی ہے کچھ پتہ نہیں۔

اسے احساس اس وقت ہوا جب اس کی ٹانگیں شل ہو گئیں۔ کئی گھنٹے ہو چکے تھے رات کی خاموشی میں کچھ سکون ملنے کی بجائے اس کا دل اور بھی مضطرب سا ہو گیا۔ اور اس ذہنی اضطراب سے رہائی کب ملے گی۔ یہ زندگی کیوں میری صلیب بنی ہوئی ہے میری نجات کا دن کب آئے گا۔

طویل برآمدے میں قدموں کی چاپ اٹھی۔ اس نے نظر گھما کر دیکھا۔ ڈاکٹر چچا ابھی ابھی ہسپتال سے لوٹے تھے۔ ڈرائیور نے کار گیراج میں لاکر دروازہ بند کیا تو سرما کی

شب کا سناٹا چیخ اٹھا۔ پر رضو کا دل سینے میں زخمی چڑیا کی طرح سہم گیا۔
یہ معمولی اور چھوٹی چھوٹی باتیں اور آوازیں مجھے کیوں ڈراتی ہیں۔ میرے دل کو سہماتی ہیں۔

قدموں کی چاپ قریب تر ہو گئی۔ رضوانہ نے مڑ کر دیکھا۔

دروازے پر ڈاکٹر چچا چہرے پر مستقل قسم کی مسکراہٹ لئے کھڑے تھے۔

"خیریت تو ہے دریچے میں کھڑے ہو کر اختر شماری ہو رہی ہے میرا خیال تھا، شاید تم کوئی تصویر بنانے میں مصروف ہو۔"

"نہیں موڈ کی بات ہے نکمہ اور الجھے تفکرات زیادہ ہوں تو آدمی کوئی سلیقے کا کام نہیں کر سکتا۔"

"ایک کام کر سکتے ہے۔"

"کیا ۔۔۔؟" وہ سوالیہ نظروں سے بولی۔

"جب تمہاری افسردگی بڑھ جائے تو تم سیر و سیاحت کے لئے ذرا کھلی فضا میں نکل جایا کرو۔ ماحول کی تبدیلی سے ذہنی دنیا میں بھی کچھ فرق پڑ جاتا ہے ایک چیز کا مجھے بھی احساس ہے تمہاری کوئی ہم نفس ہوتی تو مل بیٹھ کر اچھا وقت گزر جاتا۔"

"جو چیز ممکن نہ ہو تو اس کے ذکر سے کیا فائدہ۔"

"تم خود کو دنیا میں اکیلی نہ سمجھو۔ تمہاری ایک چھوٹی بہن شبنم بھی ہے جہانگیر قدر کی بیٹی۔"

وہ دل سے اٹھنے والا دھواں پی گئی۔ "میرا اس کا کیا ساتھ۔؟"

"کیوں ۔۔۔؟"

"وہ ٹھہری ایک بڑے باپ کی بیٹی۔" رضوانہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"جہانگیر قدر میں کونسا بڑا پن ہے جس شخص میں انسانیت محبت شفقت اور

ایثار کی ایک کرن ہے، وہ کہاں کا بڑا آدمی ہوتا ہے۔ ہاں وہ دولتمند
اور مشہور آدمی ضرور ہیں جو آسائش ثمینہ کو ملی ہے وہ سب تمہیں نہیں ملا۔
مگر جو کچھ ہے اس کا فائدہ تم کہاں اٹھاتی ہو۔"

"کیا انہوں نے ثمینہ کو گھر سے نکالنے کی کوشش نہیں کی اگر ایسا ہو جاتا تو
دنیا میں ایک اور جلا وطن لڑکی کا اضافہ ہو جاتا۔ اور مجھے کتنا ملال ہوتا۔"

"جہانگیر اپنی اس بیٹی سے بہت پیار کرتے ہیں، پچھلے دنوں وہ اپنی بیٹی کے
ساتھ یہاں آئے ہوئے تھے، انہوں نے مجھے اپنی رہائش گاہ پر بلایا، مگر میں
مصروف تھا جا نہ سکا۔ شام کی فلائیٹ سے وہ کراچی جانے سے پہلے تھوڑی دیر
کے لئے مجھے ہسپتال ملنے آئے تھے، بہت خوش مزاج بچی ہے۔ شوخ سی آج کل
وہ ایف ایس سی کر رہی ہے۔"

"کیا انہوں نے کبھی میرا ذکر کیا" یہ سوال کر کے رضو خود ہی پشیمان ہو گئی۔

"نہیں جو چیزیں آدمی زندگی کے ساتھ ذہن سے بھی نکال دے ان کا کیا ذکر۔
بہرحال بے حد مصروف آدمی ہیں۔ اب تو وہ پاکستان کے چوٹی کے حساب دانوں میں
شمار کیے جاتے ہیں، بہت ذہین آدمی ہیں۔" اگر تمہارا دل چاہے تو میں کبھی
ثمینہ سے تمہاری ملاقات کرا دوں۔"

"نہیں میری کوئی بہن نہیں اور ماں باپ ان کیلئے تو میں مر چکی ہوں پھر بھی جانے
کیوں کبھی کبھی میں اکیلی ہوتی ہوں تو ان کے بارے میں سوچتی ہوں۔

"ان بے حس لوگوں کے لئے نہ سوچا کرو جو انسان نہیں چٹانوں کی طرح سخت ہیں
ہاں زندگی کے کسی موڑ پر ان سے تمہاری ملاقات ہوئی تو مجھے احساس ہے تم محسوس کرو گی۔"

"نہیں چچا جان میں ان سے کبھی نہ ملنا چاہوں گی جس راستے سے وہ گزرے ہیں وہ
راستہ چھوڑ دوں گی جس شہر میں وہ بستے ہیں میں اس شہر سے چلی جاؤں گی۔"

"اتنی نفرت ــ" ڈاکٹر چچا مصنوعی تعجب سے بولے۔

"میں نفرت ایجاد نہیں۔ یہ نفرت تو پہلا تحفہ میری پیدائش پر مجھے دیا گیا ہے۔"

"کتنے لوگ زندگی میں ملتے ہیں جنہوں نے ہم سے نفرت کی ہمیں ناپسند کیا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ بجائے اس کے کہ ہم نفرتوں کو اپنے دلوں میں زندہ رکھیں کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ اس شخص کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیں' یہ سب سے بڑی سزا ہم اپنے دشمنوں کو دے سکتے ہیں۔"

"نفرتیں تو خودرو پودوں کی طرح پل بڑھ جاتی ہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ تمہارے امتحان کی تیاری کیسے ہو رہی ہے۔"

"ٹھیک ہی ہے کوشش کروں گی فسٹ نہیں تو سیکنڈ کلاس تو ضرور آ جائے۔"

"یہ بات میں بار بار نہیں کہنا ضروری سمجھتا کہ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو تم کہہ سکتی ہو اچھا اب تم آرام کرو۔ میں بھی آج کچھ زیادہ تھک گیا ہوں ــ چلتا ہوں۔"

"شب بخیر ــ چچا جان ــ"

مختلف قسم کی تقریبات میں شرکت کرنے سے رضوانہ کو احساس ہوا وہ آوازیں جو آسیب کی طرح کئی سالوں سے اس کا پیچھا کرتی رہی ہیں۔ ان سے اس وقت تک کے لئے نجات مل جاتی ہے جب تک وہ کسی تقریب میں بے شمار لوگوں کے ہجوم میں ہوتی ہے دو لڑکیاں آپس میں ہنسی مذاق کر کے خوش ہوتیں تو رضو کو احساس ہوتا جیسے وہ اسی کے بارے میں بات کر رہی ہیں۔ اس کے جی میں آتا ان میں سے کسی کا منہ نوچ لے اس کے ناخنوں کے زخموں سے لہو رسنے لگے۔ سرخ سرخ بہتا ہوا لہو شاید اس کے قلب کی تسکین کا سامان ہو سکے۔ مگر نہیں یہ تو کھلم کھلا اذیت پسندی ہو گی۔ اور اذیت پسند ابنارمل ہوتے ہیں اور میں ابنارملیٹی کے بہتے دھارے کے سامنے کب تک بند باندھتی رہوں، ہوش مندی سے نباہ کب تک کروں۔ اور مجھے ڈاکٹر چچا کب تک اپنے آپ پر بوجھ بنا کر رکھیں گے۔ میں نے تو بی اے کے بعد نوکری کی بات کی تو وہ بگڑ گئے۔

"میں چاہتا ہوں تم ایم اے کر لو نوکری کا شوق ہے تو کسی کالج میں لیکچرار لگ جاؤ گی بی اے تو بہت ناکافی تعلیم ہے۔"

تو دو سال اور پڑھنے کی ضرورت ہے اور یہاں ڈاکٹر چچا خود ریٹائر ہونے کی عمر میں ہیں۔ اگر میں لڑکا ہوتی تو پڑھ لکھ کر ان کے بڑھاپے میں سہارا ہوتی۔ اور اب وہ مجھے لڑکی سمجھ کر قدم قدم پر رہنمائی کرتے ہیں۔ صرف میری دلبستگی کے لئے وہ مجھے پارٹیوں اور ہسپتال کے سٹاف کی مختلف قسم کی تقریبات میں لے جاتے ہیں۔

کیسی شاندار راہبانہ زندگی گزاری ہے۔ کوئی الجھاؤ کوئی پریشانی اور پچھتاوا نہیں۔ اپنے آپ کو دوسروں کے لئے وقف کر کے کیسے مطمئن اور خوش ہیں جیسے باقی ماندہ زندگی کے لئے زاد راہ اکٹھا کر لیا ہو۔ کبھی شکست کا احساس نہیں۔ کچھ کھونے کا دکھ نہیں۔"

ایک دن مارے تجسس کے وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ "ڈاکٹر چچا آپ تو بڑی باوقار شخصیت کے مالک تھے۔"

اور پھر ڈاکٹر۔۔!

"تمہارے باپ کی شخصیت مجھ سے زیادہ باوقار تھی۔ پر ہمارے نظریات میں بڑا تضاد تھا۔"

"اس جلا دستی کا تذکرہ کیوں آپ نے چھیڑ دیا۔"

وہ بے زاری سے بولی۔

"بات کہاں پہنچ گئی۔ تم کیا کہنا چاہتی تھی۔ وہ اسے نفسِ مضمون کی طرح لے آئے۔

"کیا آپ نے کسی کو نہیں چاہا۔ کسی نے آپ کو دل میں جگہ نہیں دی

"تمہارا کیا خیال ہے۔" انہوں نے الٹا رضوانہ سے سوال کر دیا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"چاہا بھی گیا اور پسند بھی کیا گیا۔"

"پھر آپ نے اس کی قدر نہ کی۔"

"میں نے ان معصوم جذبات کی قدر نہ کرنے پر معذرت کر دی کہ میری زندگی میں وائف یا رومینز کی گنجائش نہیں۔"

"آپ خود کسی سے متاثر ہوئے ہوں، کسی کو پسند کیا ہو۔"

رضو تجسس سے بولی۔

"میں نے اسے پسند ہی نہیں کیا بلکہ اس حد تک وفا کی ہے کہ خود کو اس کے لئے وقف کر دیا ہے۔"

"وہ کون ہے؟" رضو حیران رہ گئی، اب تک اس گھر میں رہ کر وہ اس ہستی سے کیوں بے خبر رہی۔

بارہ چودہ سالوں سے تم دیکھ رہی ہو ہسپتال میرا گھر ہے اور وہاں کے مریض میرے خاندان کے افراد کی طرح اور انہیں ٹھیک کرنا میری زندگی کا اولین فرض دیکھو کہاں تک میں اپنا فرض ادا کر سکتا ہوں۔"

"آپ کی زندگی میں میرا کوئی حصہ نہیں۔"

"حصہ ہے کیسے نہیں۔ تم میری بیٹی کی طرح تمہاری تعلیم اور مستقبل کے ساتھ تمہاری خوشی کا مجھے بہت خیال ہے۔"

"کیا خبر اپنے ہاتھ میں خوشی کی لکیر سرے سے ہے بھی یا نہیں۔"

"لکیر تو بہت لمبی ہو گی۔ تھوڑی سی تلاش کی ضرورت ہے۔ تمہاری دو ایک ہم جماعت سہیلیاں ہونی چاہئیں، انہیں گاہے گاہے کبھی چائے پارٹی پر بلا لیا کرو۔

اور ہنس بول کر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کروگی۔ مجھے تمہاری تنہائی پسندی کی عادت سے شکایت ہے اس سے آدمی ناکارہ اور بے بس سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ کم سے کم تم تنہا نہ رہا کرو۔"

ڈاکٹر آذر کو ہسپتال ڈیوٹی پر جانا تھا وہ تو چلے گئے، مگر رضوانہ کو ان کی کہی ہوئی باتیں یاد آنے لگیں۔ "تمہاری وہ ہم جماعت سہیلیاں ہونی چاہئیں جنہیں تم گاہے گاہے کسی چائے پارٹی پر مدعو کرو اور کچھ وقت ہنسی خوشی میں گزر سکے۔

او ہ آپ کو کون بتائے یہ مدعو کرنے کا مسئلہ نہیں یہ تو ذہنی ہم آہنگی کا مسئلہ ہے مجھے پتہ ہے ان لڑکیوں کا پسندیدہ مشغلہ تو فلموں جدید فیشن اور کزن کی باتیں کرنا ہے۔ میری کوئی بات ان سے میل نہیں کھاتی۔" اور میرے ساتھ ذہنی ہم آہنگی صرف اس لڑکی کی ہو سکتی ہے جو اس آگ کے دریا سے گزری ہو۔ جو میری طرح اپنی ذات کے پنجرے میں مدتوں قید رہی ہو۔

ایسی سہیلی نجانے کہاں چھپی ہے۔ زندگی کے کسی موڑ پر میری اس سے ملاقات بھی ضرور ہو گی۔ اس سے مل کر مجھے جو احساس ہو گا۔ شاید میں اسے خوشی کا نام دے دوں۔ ورنہ اس ہاتھ میں خوشی کی کوئی لکیر نہیں ہے۔"

وہ کچھ دیر بے معنی انداز میں اپنے ہاتھ پر ہتھیلی آڑی ترچھی لکیروں کو گھورنے لگی۔ اور تقدیر کی لکیر کس درجہ کٹی پھٹی جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی ہے جیسے گاڑی پٹڑی سے اتر گئی ہو۔ گویا تقدیر نے جو زہر کا جام میرے لئے چنا ہے۔ میں اسے پیتی جاؤں۔ مگر کیوں؟

میں اتنی مجبور بن کر زندہ نہیں رہوں گی۔ میں ان لکیروں کو بدل دوں گی۔ اس کے ذہن میں بجلی کی طرح ایک خیال آیا۔ اور وہ بھاگ کر دراز میں سے ایک

بلیڈ لے آئی ۔ تقدیر کی لکیروں کو بدلنے کا تماشہ میں کیوں نہ کروں ۔ یہ تدبیر میں کیوں نہ آزماؤں۔ اس خیال کے ساتھ ہی انبار میلٹی کا پرندہ اس کے ذہن میں پھڑپھڑانے لگا۔ وحشی پرندے نے اس کے خونیں ذہن پر اپنی چونچ ماری۔ نیل تراشنے والا بلیڈ اس کے ہاتھ میں تھا۔ آج میں اسے کسی اور کام میں لاؤں گی۔ اس کی آنکھوں میں وحشی سی چمک آگئی ۔اس نے احتیاط سے میز پر ہاتھ پھیلایا۔ لکیروں کا جال پورے ہاتھ پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ تھوک لگا کر ہاتھ کی ساری لکیریں مٹا دیتی۔ جیسے وہ بچپن میں سلیٹ پر لکھا ہوا لمحے بھر میں مٹا کر پھر نئی گنتی اور پہاڑا لکھتی تھی۔ اور آج بھی اگر یہ لکیریں مٹ جائیں تو کیا میں اپنی مرضی کی لکیریں نہ ہاتھ پہ بنا لیتی۔ ہاں یہ مخروطی انگلیاں تو بس تمہارے آرٹسٹ ہونے کی دلیل ہیں۔

پچھلے ہفتے عرشن نگار نے اسے کہا تھا۔ مگر تقدیر کی لوٹی ہوئی لکیر نے معاملہ خراب کیا ہے۔

اس نے ایک ہاتھ سے بلیڈ کا کونا پکڑا اور احتیاط سے دو ٹوٹی ہوئی لکیروں کو ایک دوسرے سے جوڑنے لگی — پھر لکیر کو اور گہرا کیا۔ درد کی شدت سے وہ تڑپ کر اچھل پڑی۔

اپنے خون سے اس کا ہاتھ رنگین ہو گیا۔

کیسا سرخ اور گاڑھا خون تھا۔ جو تیزی سے رگیں کٹ جانے کی وجہ سے بہنے لگا تھا۔ پہلے اس نے اس ظالم لمحے کو کوسا جب اس کے ذہن میں ٹوٹی ہوئی لکیروں کو جوڑنے کا جنوں انگیز خیال آیا۔ مگر اب تو رومال اس کے خون سے بھیگ چکا تو اس نے ڈوپٹے کا پلو بہتے خون پر رکھ دیا۔ اور ادھر ادھر سے زخم صاف کرنے کے لیے اینٹی سیپٹک ڈھونڈنے لگی۔ درد کی شدت سے اس کے منہ سے چیخ

نکل گئی۔ اتفاق سے نوکرانی کسی کام سے اس کے کمرے میں آئی تو اس کا خون میں گلزار ہاتھ دیکھ کر وہ مضطرب ہو گئی۔

"آہ کسی کو تو میرے دکھ کا احساس ہوا۔" رضو کے دل میں خوشی کی کرن چمکی۔ نوکرانی اسے کھینچ کر غسل خانے میں لے گئی اور ٹھنڈے پانی کی دھار کے نیچے اس کی ہتھیلی رکھ دی۔ کیسی جان لیوا مسرت کا احساس اس کے ذہن کے کسی گوشے میں پیدا ہوا۔

"مجھے پہلے دن اپنی رگیں کاٹ کر خون بہانے کی لذت ملی۔"

"بی بی آپ کا ہاتھ کیسے کٹ گیا۔ آپ تو پہلے ہی دبلی پتلی سی ہیں۔ اوپر سے اتنا خون بہہ گیا۔ میں اگر اپنا اتنا خون دیکھوں تو مارے غم کے بے ہوش ہو جاتی۔ مگر آپ کا تو بڑا صبر ہے۔"

رقیعہ بڑی ہمدردی سے بولی۔

"یہ سب حادثات ہیں اور جو کچھ ہونا ہے۔ اس میں آدمی اگر تبدیلی نہ لا سکے تو صبر کرنا پڑتا ہے۔ اگر صبر نہ کریں تو مر جائیں۔"

اس نے بڑے پتے کی بات کہی۔ "پر یہ تو بتائیے آپ کا ہاتھ کیسے کٹ گیا۔"

"ہاتھ کٹنا تھا کٹ گیا اب یہ کیسے کٹا اس ذکر سے کیا حاصل۔"

"ٹھیک کہتی ہو رضو بی بی۔ جو تکلیف قسمت میں لکھی ہو اسے آدمی کو بہرحال جھیلنا پڑتا ہے کوئی دوسرا ہمارے حصے کا دکھ نہیں بانٹ سکتا۔"

"ہاں رقیعہ۔" غم راہ نہیں کہ ساتھ دیجے۔
دکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجئے،

اتنے میں اس کی نظروں نے زخموں پر لگانے والی مرہم ٹیوب ڈھونڈ لی

اور بڑی احتیاط سے اس کے پورے ہاتھ پر پھیلی لمبی لکیر پہ لگادی۔

"کچھ سکون محسوس ہوا۔" رقیہ نے بڑی اپریت سے دوائی لگانے کے بعد استفہامیہ نظروں سے پوچھا۔

"یہ تو بتاؤ رفو کہ جو لکیر میں نے ہاتھ پہ بنائی تھی زخم بھرنے پہ مٹ جائے گی یا باقی رہے گی۔"

"میں نے دوائی تو ایسی لگائی ہے جو زخم کو جلد بھر دے۔"

"تو اتنی تکلیف کا کچھ حاصل نہ ہوا۔" وہ تاسف سے بولی۔

"تو آپ نے خود زخم بنایا ہے۔"

"سوچا شاید یوں تقدیر کی پھوڑی اپنا رخ موڑ لے۔"

"یہ تقدیریں تو روزِ اوّل سے پتھر کے قلم سے لکھی ہوتی ہیں۔ ہمیں چاہیں بھی تو انہیں نہیں بدل سکتے۔"

"شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔ بلندیوں کے خواہاں پستیوں میں رہتے ہیں۔ اور کہکشاں کی پگڈنڈی پر چلنے کے مشتاق اندھیروں میں بھٹکتے ہیں یہ بات بھی دیر سے سمجھ میں آئے گی۔"

شام کو ڈاکٹر آذر ہسپتال سے جلدی گھر آئے تو کھانے کی میز پہ رضو آئی تو اپنا ہاتھ چھپا لیا۔ کھانے کے دوران تو وہ کچھ نہ بولے مگر جب نوکرانی برتن سمیٹ کر کوفی لائی تو انہوں نے چھاپہ مار کر طرح سوال کا حملہ کیا۔

"اس ہاتھ پر کیا ہوا ——"

"کچھ نہیں یونہی معمولی سی چوٹ لگ گئی ہے میں نے دوائی لگالی ہے۔"

"چوٹ خود لگی ہے یا لگائی گئی ہے۔"

وہ پریشان سی ہو گئی — کہیں رفیعہ نے میری حماقت کا قصہ نہ کہہ دیا ہو۔ انہوں نے مزید کچھ نہ کہا تو اس نے دل ہی دل میں شکر کیا۔ بات یہیں گول ہو گئی۔

کوفی کا کپ رکھ کر انہوں نے چوتھا سگریٹ سلگایا تو وہ بولے بغیر نہ رہ سکی۔

"آپ اب زیادہ سگریٹ پینے لگے ہیں۔"

"تم نے مجھے کم ہی ہسپتال میں کام کاج کرتے دیکھا ہے۔ کام کی زیادتی اور تھکن کا کچھ مداوا ہو جاتا ہے خصوصاً نائٹ میں تو مجھے یاد نہیں رہتا کتنے سگریٹ پیتے ہیں۔"

"اس عادت کا آپ کی صحت پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ اور ہفتے بھر سے میں آپ کو کھانستے سن رہی ہوں۔"

"سگریٹ تو بہت پرانی عادت ہے۔"

"آپ دوسروں کا علاج کرتے نہیں تھکتے۔ کبھی اپنے بارے میں بھی سوچا ہے۔ کہ کسی کو آپ کی بھی ضرورت ہے۔"

"ہمارا غم کھانے والی ہماری بیٹی جو ہے اگر تم بھی بہت مصروف ہوئی۔ تو ہسپتال کی نرسیں تو تیمارداری کر لیں گی۔ کوئی تو ہمارا بھی غم کھائے گا۔"

"تو کیا آپ کا بیمار ہونے کا ارادہ ہے۔"

"بڑھاپے میں بیماریاں ہی تو دوست رہ جاتی ہے۔"

"آپ میرے امتحان تک اپنی بیماری کو ملتوی رکھئے۔"

"کہہ دیکھیں گے اگر مان گئی ہے تو ڈھیٹ مشکل سے ملتی گی بیماریاں

بغیر اطلاع کے آتی ہیں۔"

"آپ کس قسم کی بیماری کی بات کر رہے ہیں۔"

"بعض بیماریاں آدمی کے شوق اور کھانے پینے کے مشغلوں سے تعلق رکھتی ہیں بعض چیزوں کی تفصیل اور طوالت بے سود ہوتی ہے، وقت کئی باتیں خود سمجھا دیتا ہے۔ مگر تم فکر مند نہ ہونا۔"

"میرا غم آپ کھاتے ہیں اسلئے آپ بھی بیمار بن گئے ہیں۔"

"اگر میری جگہ تم ہوتی تو تم بھی یہی کرنے پر مجبور ہوتی۔"

"اور آپ میری جگہ ہوتے تو جانے کیا کر لیتے۔"

"یہی کہ دل مرنے کو چاہتا مگر میں جینے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ صرف اس لئے کہ اگر زندگی بنا رکچھ کئے گزر جاتی۔ تو پچھتاوے میرے ساتھ جاتے کچھ کر کے موت آئے۔ تو دل کو یہ اطمینان ہو گا۔ کہ اس دکھ تکلیف اور آلام سے بھری دنیا میں لوگوں کے مصائب کم کرنے اور دنیا کو بہتر جگہ بنانے میں میرا بھی ہاتھ ہے۔

"اگر میں بھی اس انداز سے سوچوں تو یہی کہنا پڑے گا کہ میں نے تو بیس سال یونہی گزار دیئے۔ کسی کے لئے تو کیا خود اپنے لئے کچھ نہیں کیا۔"

"خدا وہ وقت لائے کہ تم اپنے ساتھ دوسروں کے لئے کارآمد فرد بن سکو۔ کبھی کبھی تم میں تخریب پسندی کی جھلک نظر آتی ہے تو مجھے خیال آتا ہے کہیں تم سب کچھ توڑ پھوڑ نہ دو۔ پھر میں سوچتا ہوں تم ایک آرٹسٹ ہو اور آرٹسٹ ہمیشہ تعمیری انداز میں سوچتا اور عمل کرتا ہے وہ دنیا کی ترتیب و تناسب پر یقین رکھتا ہے۔"

"اس دنیا میں جو لوگ عمل کرتے ہیں، ان سب عوامل کا ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔"

"رضو مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ میں نے تمہاری بہت اچھی تربیت کی مجھ سے زیادہ وقت نے تمہیں کافی کچھ سکھا دیا ہے۔"

"ڈاکٹر چچا آپ کہنا کیا چاہتے ہیں صاف صاف کہیئے مجھے فکر ہے آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہہ نہیں سکتے۔"

"رضو تم مجھے ہمیشہ ایک خوش مزاج شخص کے روپ میں دیکھا ہے، یہی روپ پورے ہسپتال کے سامنے رہا ہے۔ میں نے کبھی اپنے ذاتی الام یا تکلیف کی باتیں کسی کو نہیں بتائیں۔ یہ تمہیں پتہ ہے۔ قدرت کا یہ نظام کوئی نہیں بدل سکتا۔ کہ بہار کے ہر ایک وقت پت جھڑ کا بھی آتا ہے۔ میں بھی ایک مدت تک خود کو مضبوط اور جواں ہمت آدمی سمجھتا رہا ہوں۔ مگر اب کئی دنوں سے میرے سینے میں شدت کا درد رہتا ہے۔ سارا جسم تھکا تھکا بے حس سا محسوس ہوتا ہے فرض کرو اگر میں تم سے بچھڑ جاؤں تو سمجھنا وہ میری زندگی تھی جو میں نے گزار لی، اب تمہاری باری ہے۔"

"ڈاکٹر چچا آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ کو کچھ نہیں ہو سکتا۔"

رضو چیخ پڑی۔

"میں نے شروع میں اس تکلیف کو معمولی بات سمجھا تھا کوشش کی میرے معمولات میں اس سے کوئی فرق نہ آئے۔ پر اب میری کشتی کے بادبان گرتے کو ہیں اور تمہیں سنبھلنے کی ضرورت ہے، میرے سینے کے ایکسرے نے میرے دل کے سارے راز ہسپتال کے سینئر سٹاف کے سامنے افشاں کر دیئے ہیں۔ اور وہ سب مل کر میرا علاج کرنا چاہتے ہیں۔ اور اب تو وہ کینسر کا مرض کافی ایڈوانس سٹیج پر مجھے نے چاہ چکا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ کل سے کرنل عزیز مجھے ہسپتال کے بستر پر لیٹنے کے لئے مجبور کریں اور سب سے بڑا ظلم

ہو گا۔ بہر کیف یہ بھی ہوتا تھا۔ بڑے حادثات کے لیے دل بھی بڑا ہوتا چاہیے۔"

"نہیں میرے کا جگر چاہیے۔"

رضو کو تسلی دے کر ڈاکٹر آذر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ مگر اب اسے یکدم احساس ہوا جیسے ہزاروں آتش بازیاں اس کے سامنے چھوٹ گئی ہوں۔ ذہن میں آتش فشاں کا لاوا ابل پڑا ہو۔

یہ عذاب ناک منزل بھی آئی تھی، غنیمت ہے وہ امتحانوں کی تیاری سے پہلے ہی کر چکی تھی، ڈاکٹر آذر ہسپتال میں تھے جب رضو امتحان دیتے جاتی۔ تھوڑا سا پڑھ کر وہ اکتا جاتی سا اٹھ کر ٹہلنے لگ جاتی یا پھول لے کر ڈاکٹر چچا سے ملنے چلی جاتی۔ ہسپتال کا تمام سینیئر اور جونیئر سٹاف ڈاکٹر آذر کے لیے فکر مند تھا مگر وہاں تو ہر گزرتے دن کے ساتھ کمزوری ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ پہلے والے اعتماد اور شگفتگی کی پالش بھی اتر چکی تھی۔ تندہی سے علاج تو ہو رہا تھا۔ مگر سگریٹ پینے کی سختی سے ممانعت تھی۔

ایک شام رضو کا دل بہت پریشان ہوا تو وہ ڈاکٹر چچا کا حال پوچھنے ہسپتال چلی گئی۔ ان کی روزمرہ کی کیفیت کا چارٹ پڑھ کر وہ فکر مند ہو گئی حالت اور بگڑ رہی ہے۔ چچا کے پرائیوٹ کمرے کے پاس وہ اتنی تیزی سے آئی تھی کہ اس کا سانس پھول گیا۔ ڈاکٹر چچا ہیں آ گئی۔ اس نے بستر پہ آہستہ سے جھک کر کہا۔

"آپ کے لیے گلاب کے پھول ۔۔۔" سرہانے کے قریب اس نے پھول رکھ دیے۔

انہوں نے آنکھیں کھولیں ۔۔ مجھے آپ کے بارے میں بہت فکر تھا ۔۔"

"سارے فکر دور ہو جائیں گے۔"

"پیارے چچا مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جا بیٹھے۔"

"میں کہاں جا رہا ہوں۔"

ڈاکٹر آذر نے کھویا ہوا اعتماد بحال کرنے کیلئے کہا اور رضو کے لبوں سے سسکی نکل گئی۔

کیسے سارا کچھ بکھر گیا ہے۔ پریشان ہو گیا ہے اور آنے والے دنوں کا تصور جانے کیوں میرے اعصاب پر کپکپی سی طاری کر دیتا ہے مگر یہ بات تو مرتے دم تک ڈاکٹر چچا کو نہ بتاؤں گی۔

"رضو تم گھر جا کر آرام کرو کام کرو تصویریں بناؤ خود کو مصروف رکھو۔ میں ٹھیک ہوتے ہی چلا آؤں گا۔"

"میں نہیں جاؤں گی آج سے میں آپ کی تیمارداری کروں گی۔"

"نہیں رضو۔ تم مجھے اپنی کمزوری نہ دکھاؤ اور مجھے موقع نہ دو کہ میں اپنی کمزوری نہ چھپا سکوں۔ یہاں کئی نرسیں بیٹیاں میری دیکھ بھال کریں گی۔

رضو کے دل پر چھری چل گئی۔ اب اور کچھ کہنے کی گنجائش کہاں رہی ہے۔"

"خدا حافظ چچا جان آپ کو میری بھی عمر لگے۔

" پُرنم نگاہوں سے وہ برآمدے سے گزری اور بوجھل قدموں سے گھر آگئی۔ دل پر نامعلوم بوجھ تھا۔ اپنی بے وقعتی کا ایک بار پھر اسے احساس دلا دیا گیا تھا۔ رکشہ گھر کے دروازے پر رکا تو وہ چونک پڑی پیسے دے کر وہ اندر آئی۔ آج اس بنگلے کے در و دیوار برآمدے کمرے سبھی کچھ بدلا ہوا تھا۔ یوں جیسے بادِ سموم چلی اور ہری بھری کھیتوں کو خاک سیاہ کرتی چلی گئی۔ کیسی گھمبیر تا کیسی اداسی تھی اور یہ تبدیلی جانے بیرونی ماحول کی ہے یا میرے اندر کی دنیا کی۔ اب کون جواب

دے گا اس سوال کا۔

رات کو بہت بھوک لگی تھی۔ نوکرانی نے کھانا لگایا۔ دو پلیٹیں دو چمچے دو گلاس شاید اس نے لاشعوری طور پر رضو کو مطمئن کرنے کے لئے ایسا کیا تھا۔

تمام رات وہ سلیقے سے سو بھی نہ سکی صبح سات بجے وہ کالج جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔ شب بیداری سے آنکھیں بھاری ہو رہی تھیں۔ سر چکرا رہا تھا۔ غسل خانے میں جا کر اس نے ٹھنڈے پانی کے چھپکے آنکھوں پر ملے اور تولیے سے منہ پونچھ کر اپنے کمرے میں آئی۔ کپڑے تبدیل کئے اور کنگھی کرتے ہوئے اس نے سوچا۔ آج کل تو کوئی پڑھائی بھی نہیں ہو رہی جب تک رزلٹ نہ نکلے، اگلی کلاس شروع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ساڑھے سات بجے وہ بالوں کو ربن سے باندھ کر آئی۔ برآمدے میں رضیہ نے اس کے لئے ناشتہ رکھ دیا تھا۔

چائے کی صرف ایک پیالی نوک کی طرح اس کے جگر میں چبھی۔ اس نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

رضو سمجھ گئی اور بولی۔

رضو بی بی ناشتہ آپ کو اکیلے ہی کرنا پڑے گا۔ اللہ میاں اپنے ڈاکٹر صاحب کو صحت دے تو ان کے لئے بھی پیالی سجاؤں۔ ان کے بیمار ہونے سے یوں لگتا ہے جیسے پورا بنگلہ اُجڑ گیا ہو۔"

"ہاں رضیہ اچھے انسانوں کے وجود سے یہ دنیا گلستان ہے اور بُرے انسانوں نے اس دنیا کو صحرا اور جہنم زار بنا رکھا ہے میں اب تک یہ نہیں سمجھ پائی کہ میں کن لوگوں میں شمار ہوتی ہوں۔

"آپ نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا ہمیں کبھی کسی بات پر نہیں جھڑکا۔"

"یہ تو ایسے ہی ہے جیسے سمندر میں ایک شبنم کا قطرہ ڈال دو، تو کوئی فرق نہیں پڑتا اور میرے یہاں ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"رضو بی بی اگر آپ یہاں نہ ہوتیں تو یہ بنگلہ کاٹ کھانے کو دوڑتا آپ کے آنے سے پہلے یہاں کسی عورت کے قدموں کی چاپ سنائی نہ دی تھی۔

تھوڑا سا ناشتہ کرنے کے بعد وہ کالج چلی گئی۔ بی اے کی لڑکیاں آزادی سے گھوم رہی تھیں، مستقبل کے پلان بنا رہی تھیں تبھی رضو نے کالج کے باغ کے ایک بنچ پر بیٹھے بیٹھے فیصلہ کر لیا۔ بی اے کے بعد میں ایم اے ضرور کروں گی اپنی چند ہم جماعتوں کے ساتھ کچھ باتیں کرنے کے بعد بارہ بجے وہ ہسپتال آ گئی، ٹیکسی گیٹ کے پاس پہنچی تو وہ دوڑ کر آگے بڑھی ہسپتال کے پکے فرش پر اسکے قدموں کی آہٹ بھی کوئی سن سکتا تھا، ایک نرس اسے غصے سے گھورتی ہوئی گذری مگر وہ اپنی دھن میں مگن چلی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر آذر کا کمرہ آیا تو دروازے میں رک کر وہ اپنا پھولا ہوا سانس درست کرنے لگی۔

"کہیں پولیس تو تمہارے پیچھے تو نہیں لگی ہوئی۔" اگر ڈاکٹر چچا صحت مند ہوتے تو اس کے الجھے بال پھولی سانس دیکھ کر ضرور کہتے۔ پر آج وہ کچھ بھی نہ کہہ سکیں گے۔

دوپہر کی ڈیوٹی والا ڈاکٹر آذر صاحب کی نبض دیکھ رہا تھا۔

"آداب"

کوئی جواب نہیں کیسی دل خراش خاموشی ہے۔ ان کا کمزور سفید چہرہ ہر قسم کے جذبات سے خالی تھا جیسے اب بھی زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں میرے چہرے پر خوشی دکھائی دے تو کرب بھی تمہیں دکھائی نہ دے گا، موت کی سرحد پر میری مستقل مزاجی تمہارے لئے ایک چیلنج ہے رضوانہ تم جوان ہو زندہ ہو صحت مند

ہو جینیس نہیں تو ذہین لڑکی ضرور ہو۔ میں نے کیسی شاندار زندگی گزاری۔ اب تم کیسے گزارو گی۔

ڈاکٹر بشیر انکا ٹمپریچر لے کر چارٹ پر رپورٹ لکھ کر جا چکے تھے۔ اور کمرے میں وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ زبان سے وہ کچھ نہ بولی، پر لگا ہے گا ہے ڈاکٹر چچا کی صورت دیکھ لیتی۔

رضو اب میں یہاں مریض ہوں اور سب میرے چارہ گر اور ہر وقت چوبیس گھنٹے کوئی میرے سینے پہ آری چلاتا ہے اب تمہیں تنہا رہنا ہے۔ میں نے جو کچھ کرنا تھا کر چکا۔ ہر شخص جان چکا ہے کہ میری زندگی کا راستہ چند قدم اور باقی ہے تو پھر چھوٹی سی خواہش دل میں حسرت بن کر دل میں ہے۔ اب جب تم آؤ میرے لئے ایک سگریٹ ضرور لانا۔"

رضو نے ایک لمحے کے لئے ادھر ادھر نازداری سے دیکھا۔ میں نے کئی دنوں سے آپ کے پسندیدہ برانڈ کے کچھ سگریٹ پرس میں رکھے ہوئے تھے، شاید آپ کا دل کرے۔"

اس نے احتیاط سے پرس کے خانے سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اور ڈاکٹر آنوس کے ہاتھ میں دیدیا۔

جب تک آپ سگریٹ ختم کریں میں دروازے میں کھڑی ہوتی ہوں — کوئی آنہ جائے۔"

"حال ہی میں ہسپتال کمیٹی کے بورڈ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ مجھے علاج کیلئے لندن بھیجیں گے اور میں نے انکار کر دیا۔ مگر اب میری مرضی کچھ نہیں جو ڈاکٹر فیصلہ کریں اس پر عمل ہوگا۔

آج مدتوں بعد کسی نے میرا دل خوش بہت خوش کیا ہے اگر میرے بس

میں ہوتا تو کیا میں ساری خدائی نہ تمہیں دے دیتا۔"

"میرے اچھے چچا ڈاکٹر ۔۔" رمشو نے بے اختیار وہ ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ وہ ہاتھ جو عمر بھر لوگوں کی تکلیفیں کم کرنے میں مصروف رہے کتنے کمزور مگر مقدس ہاتھ ہیں یہ۔"

زیادہ سوچ فکر سے کچھ فائدہ نہیں۔ کھلی فضا میں کچھ وقت گزارا کرو۔ وقت پر کھانا کھاؤ اگر ممکن ہو۔ زندگی میں تم کیا کرنا یا بننا چاہتی ہو۔ یہ بھی تمہیں خود ہی فیصلہ کرنا ہے۔

ہسپتال سے وہ گھر آئی تو اس کے آنسو ہی نہ تھمتے تھے تو ڈاکٹر چچا آپ بھی میرا ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ آپ کی جدائی کا ایک دکھ سب پر ظاہر ہے۔ مگر اس غم سے ہزاروں دکھ جاگ اٹھیں گے۔ میرے ہر بار لڑکھڑانے گرنے اور گرد ہونے پر آپ نے مجھے سنبھالا، اور تسلی دی۔ مگر آپ کے بعد کوئی دامن میرے آنسو جذب کرنے کے لئے نہ بڑھے گا۔

"کھانے کا وقت آ گیا۔ شام گہری ہو گئی تو رفیعہ اس کا انتظار کرتی رہی۔ مگر رضو ایک پلیٹ ایک گلاس اور ایک چمچ والی میز پہ نہ آئی۔

"رضو بی بی میاں نے آپ کے لئے ایک نئی ڈش بنائی ہے۔"

رفیعہ تم مجھے نئے کھانے پیش کرو اور میرے ڈاکٹر چچا موت کی طرف جا رہے ہیں۔"

مگر آپ کے بھوکے رہنے سے انہیں کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

"مجھے نصیحت کی گئی تھی، کہ میں کھانا وقت پر کھاؤں — لاؤ ایسے ہونا تھا تو یونہی سہی۔"

کھانا اس نے روز سے آدھا کھایا۔ برآمدے میں ٹہلتے ہوئے وہ بے چینی سے ہاتھ مل رہی تھی۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو کیا میں اپنی جان دے کر ڈاکٹر چچا کی اہم زندگی نہ بچا لیتی ۔۔۔ یہ ہستی جو کل تک ہزاروں لوگوں کے لئے سراپا پیار و محبت بنی ہوئی تھی، دانش کتنی بے بسی ہو گئی ہے آپ کے مقابلے میں میری زندگی کتنی بے وقعت اور غیر اہم ہو گئی ہے۔ میں نے اپنی زندگی دوسروں کے لئے اہم بنانے کے لئے کچھ بھی تو نہیں کیا۔

اس کے ذہن میں چچا آذر کی برسوں پہلے کی آواز آئی۔ جو نقش بن کر جیسے کھو گئی ہو۔

مجھے فخر ہے میں خوش ہوں، اس عمر میں اگر میں مر بھی جاؤں تو مجھے رنج نہ ہو گا۔ چونکہ میں نے اس دنیا کو دکھی اور ضرورت مند لوگوں کو جو کچھ دینے کی تمنا کی تھی۔ وہ میں دے رہا ہوں۔ جہاں زخم ہے وہاں مرہم جہاں دکھ ہے وہاں تسلی جہاں کسی کو میرے کچھ دینے سے ذرا بھی فائدہ ملتا ہے مجھے دینے میں تامل نہیں ہوا۔

ہاں جب وقت آیا جب میں کچھ کرنے کے قابل نہ رہا اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں اب دوسروں پر تکیہ کرنے لگا ہوں۔ میں اپاہج اور مجبور ہو گیا ہوں تھک کر نڈھال ہو گیا ہوں۔ ایک قدم بھی چلنے کا یارا نہیں رہا۔ اس دن مر جانے کا تہیہ کر لوں گا۔ تم اسے میری خوش نصیبی سمجھنا کہ میں کام کرتے کرتے راہی عدم کا سفر اختیار کر لوں۔ میری موت پر تم آنسو نہ بہانا۔ ہاں جب کبھی اس راستے گزرو جہاں میری قبر راستے میں آئے تو مجھے مردہ نہ سمجھنا۔ میں ان تمام لوگوں کے ذہنوں میں ان کے دلوں میں ہوں جن کی ضرورت پڑنے پر میں نے مدد کی۔ الفاظ سے پیسے سے علاج کر کے۔

اور آج اس شہر میں کتنے انسان ڈاکٹر آفریدی کی کوششوں سے ہنستے بولتے اور زندہ ہیں، رہیں ڈاکٹر چچا آپ کی خطرناک بیماری پر رنجیدہ افسردہ اور رونے والی اس لئے نہیں کہ وہ اب تھوڑے عرصے کے مہمان ہیں بلکہ میں اس لیے روتی ہوں کہ ڈاکٹر چچا کے جانے سے بے شمار لاپرواہ ڈاکٹروں کی غفلت سے کتنے ہی بچے مرجائیں گے، کتنی عورتیں بیوہ ہو جائیں گی۔ کتنی ماؤں کی گود خالی ہو جائے گی۔ جنہیں برقرار رکھنے کے لیے ڈاکٹر چچا نے شب و روز محبت کی ۔ کام کیا ۔ خدمت کی، اور اب کام کی زیادتی نے انہیں تھکا دیا ہے۔ انہیں آرام کی ضرورت ہے۔

ایک اور رات اضطراب میں گزری۔

صبح ڈرائیور اسے ہسپتال لے جانے کے لئے آگیا۔

گاڑی ہسپتال آئی تو وہ ڈرائیور کا شکریہ ادا کیے بغیر بے تابی سے چچا کے کمرے کی طرف بھاگی۔ ہمیشہ ہی وہ ایسے کرتی بھاگ کر اپنے ڈاکٹر چچا کو دیکھ کر اطمینان کر لینا چاہتی تھی، کہیں اس کے دیر سے پہنچنے پر وہ اسے چھوڑ کر نہ چل دیں۔

چاروں طرف موت کا سا سکوت طاری تھا۔ رضو کا جی چاہا کوئی شور ہو ہنگامہ ہو، تاکہ یہ دل کو سہا دینے والا سناٹا ختم ہو اور اس کا دل جو پنجرے میں قیدی چڑیا کی طرح سہا ہوا ہے کچھ اطمینان محسوس کر سکے اور وہ ان کی کھلی فضا میں لمبا سا سانس لے سکے۔

کمرے میں ملی جلی دوائیوں کی بو تھی۔ مگر گلاب کے سرخ پھول اس نے ڈاکٹر چچا کے مرجھائے چہرے کے روبرو رکھ دیے۔ ان کے بازو میں گلوکوز قطرہ قطرہ بن کر جا رہا تھا اور یہ لمبی سی سوئی۔

ہائے چچا آپ کو کتنی تکلیف ہو گی۔ اس سوئی کے مسلسل بازو میں چھپے رہنے

کی اذیت۔

تکلیف کے احساس سے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پر وہاں چہرے پر کوئی خوشی غم ملال اور پشیمانی کا تاثر نہ تھا۔ وہ کچھ دیر چپکی کھڑی رہی۔

رضو یہ تم ہو۔۔" ڈاکٹر چچا کی آواز اسے صدیوں کے فاصلے سے سنائی دی۔

" ڈاکٹر چچا یہ میں ہوں ۔۔ " وہ دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔

" تمہارا کیا حال ہے ۔۔ " کمزور نحیف آواز اب بھی اسے سنبھالا دے رہی ہے ۔۔ رضو نے خود ہی سوچا۔

" لو سنو میرے بعد تمہیں ہمت و حوصلے سے کام لینا پڑے گا۔ یہ زندگی ہر لحظہ بدلتے رہنے والی چیز ہے اور ہمیں زندہ رہنے کے لیے مفاہمت کی ضرورت ہے۔ اگر تم میں یہ بات پیدا ہو گئی تو میں سمجھوں گا کہ تم پر میری محنت کام آئی۔

تمہیں یاد ہو گا۔ میں نے ایک دفعہ تمہیں کہا تھا۔ جب تک میں دوسروں کے کام آتا ہوں میں جینا چاہتا ہوں۔ جب مجبور اور اپاہج بن کر بستر پہ پڑ گیا تو موت میری سب سے بڑی خوشی ہو گی۔

میں نے بے شمار کینسر کے مریضوں کو جلد یا بدیر مرتے دیکھا ہے۔ صرف وہی لوگ بچ سکے ہیں، جن کی بیماری ابتدائی سٹیج میں ہی تشخیص کر لی گئی۔ اور میرے جیسے مریض کی بیماری تو بہت ایڈوانس سٹیج پہ پہنچ چکی ہے۔ اپریشن کر کے دوائیاں دے کر ہم مریض کی تکلیف وہ زندگی میں اضافہ کرتے ہیں کمی نہیں۔ دنیا کے سبھی ترقی یافتہ ملکوں میں اس بیماری پہ ریسرچ ہو رہی ہے۔ مگر ایڈوانس سٹیج کے مرض کا علاج ممکن نہیں۔

" ڈاکٹر چچا آپ زیادہ نہ بولیں۔ اس دم آپ کو کھانسی شروع ہو گئی تھی۔

دشمنو نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بے وقوف جو آج سن سکتی ہو، کل نہ سن پاؤ گی۔ اس دنیا میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں ایک بہت اچھے اور پیارے انسان جنہیں میں پھول کہتا ہوں، دوسرے وہ جو خود غرض بے حس سب کچھ سمیٹنے کے مشتاق کچھ دینے کے معاملے میں تنگ نظر اور کنجوس انہیں میں گندگی کہتا ہوں۔

"مگر چچا جان آپ کون سی قسم میں شمار ہوتے ہیں۔"

"ہم نہ پھول نہ گندگی ہم تو چٹائیں ہیں جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے وہ دیکھتے اور سنتے ہیں ہم کسی سے نہیں کہتے کہ ہم محسوس کرتا اور روتے ہیں۔ اسی لئے ہسپتال کی کمیٹی نے اجلاس کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ اگلے ہفتے تک مجھے غیر ملک بھیجا جائے گا۔"

"ڈاکٹر چچا آپ چلے جائیں گے۔"

"مریضوں کی اپنی مرضی کوئی نہیں ہوتی۔ میری دوری سے تم میں شاید زیادہ حوصلہ اور اعتماد زندگی خالی برتن کی طرح ہے اس میں جو کچھ تم ڈالو گے۔ وہی کچھ تمہیں واپس مل جائے گا، التفات اور ادائیں تو کھوکھلی تتلیاں اور دل بہلاوے ہیں۔ ان پر زندگی کی اساس نہ رکھنا۔

شادی کو مجبوری سمجھ کر کرنا۔ اس شخص سے کرنا جس سے تمہارے خیال میل کھاتے ہوں، اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنانا جسے تمہارا دل پکارے جو تمہاری قدر کرے، اس وقت جذبات سے زیادہ حقائق کو پیش نظر رکھنا۔ اس فیصلے میں بھی تم تنہا ہو گی۔

چاہو تو ان باتوں کو پچھلی صدی کے آدمی کے خیالات سمجھ کر بالائے طاق رکھ دینا چاہو تو انہیں اندھیرے میں روشنی کی لکیر سمجھو۔"

میرا خیال ہے اتنا ہی کافی ہے اب تمہیں جانا چاہیئے میں بھی تھک گیا ہوں بڑھاپے میں تھکن عجیب بات نہیں۔ مگر اس کے ساتھ بیماری بھی شامل ہو تو اور بات بن جاتی ہے۔"

سگریٹ کا بچا ہوا ٹکڑا رضو نے احتیاط سے اپنے پرس کے گوشے میں رکھ لیا کہیں کوئی اس بات کو نہ جان لے کہ جس دھوئیں کے زہر نے ڈاکٹر آزر کو اس منزل پہ پہنچایا ہے۔ وہی زہر رضو نے ڈاکٹر کی نظر بچا کر پھر انہیں دیدیا تھا۔

یہ سگریٹ پی کر کیسی تھکن انگیز مسرت کا احساس جاگا تھا۔ جگمگاتا ہوا ممنونیت کا جذبہ۔ رضو جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی،

میرے اچھے اور پیارے ڈاکٹر چچا خدا آپ کو سکون اور اطمینان دے،

جاتے جاتے اس نے مخنتی ہاتھ چوم لیا۔

رضوانہ اسی لمحے سے ڈرتی تھی۔ وہ لمحہ آ پہنچا۔ صبح ہی صبح ڈاکٹر یوسف نے ٹیلی فون پر اطلاع دی۔ ۔ ۔ آج شام آذر صاحب کو بیرون ملک بھیجا جا رہا ہے۔ بہتر ہوگا، آپ ائر پورٹ پر آجائیں سارا انتظام ہم لوگوں نے کر لیا ہے۔ "وہ ضرور آؤں گی ۔۔" کہنے کو رضو نے کہہ دیا۔ یہی خبر تھی جس کے تصور سے وہ کئی دنوں سے خوفزدہ سہمی سہمی سی تھی۔ اور آج وہ بات سچ بن کر سامنے آ جاتی گی۔ ڈاکٹر چچا کے جانے کی خبر۔

شام تک اس نے سینکڑوں مرتبہ اپنا چہرہ آنسوؤں سے دھویا، پھر غسلخانے میں جا کر منہ دھو آتی۔ آخر وہ وقت آ گیا۔

گیٹ پر ڈاکٹر یوسف اخلاقاً اسے ائر پورٹ تک لے جانے آ گئے۔ پھر جانے کس دل سے گھر کے سبھی نوکر مالی وغیرہ چوکیدار بھی اپنے عظیم ڈاکٹر کو خدا حافظ کہنے آئے تھے۔ رضو آج پھر ان کے لئے سرخ گلاب لائی تھی۔

ڈاکٹر آذر اسے ائر پورٹ پہ بتا رہے تھے۔ یہ کوٹھی کا فرنیچر نوکر سبھی کچھ

ہسپتال کی طرف سے انہیں ملا ہوا تحفہ۔

ہسپتال کے میڈیکل ایڈمنسٹریٹر نے ازراہ شفقت رضو کو ایم اے کرنے تک وہاں رہنے کی اجازت دی ہے۔ بینک میں اپنے تمام اکاؤنٹ کے کاغذات رضو کے نام کر دیئے گئے ہیں۔ آنسو چھپانے کی سعی میں وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبائے رہی۔ حتیٰ کہ جہاز کے چلنے کا اعلان ہوا۔

مسافر روانگی والے دروازے سے جانے لگے اور ڈاکٹر آفریدی اتنی کمزوری کے باوجود وہیل چیئر پر بیٹھے ان کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ مگر وہ دیکھتی رہی۔ ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ وہ لوہے کی ائیرپورٹ پر لوہے کو پھلانگ کر ایک بچی کی طرح ان سے جا لپٹے، اور کہے۔

میرے اچھے ڈاکٹر چچا مجھے چھوڑ کر نہ جائیے، میری پیدائش پر میرے والدین نے جب مجھے اکیلا چھوڑا تو مجھے سنبھالنے والے چھ ہاتھ تھے جنہوں نے مجھے پالا پروان چڑھایا۔ مگر وقت کے ساتھ چار ہاتھ موت کی نذر ہو چکے اور باقی دو ہاتھ وہاں جا رہے ہیں، جہاں میرے آنسو اور سسکیاں بھی نہ پہنچ پائیں گی، چچا جان آپ نے دل میں کافی کچھ سوچا ہو گا آپ مجھ سے دور جانا چاہتے ہیں اس حالت میں کہ آپ چلتے پھرتے ہیں اور دیار غیر میں اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو اس کی خبر مجھے نہ ہو۔ پر مجھے معلوم ہے یہ ہزاروں میل اور کئی سمندروں کے فاصلوں کا راستہ کسی ان دیکھی سرحد پر ختم ہوتا ہے۔

ایرپورٹ سے وہ خالی ہاتھ آئی، جیسے زندگی سے ہر دلچسپی نکل چکی ہو۔ مگر ڈاکٹر جی کی آواز کی بازگشت تو یہیں کہیں بہت قریب تھی۔ میں تمہیں کامیاب انسان بنانا چاہتا ہوں اور تم باوقار عورت کی طرح زندہ رہو۔ مگر اب تو چاروں طرف سے اداسیاں اور سناٹے امنڈ آئے ہیں۔ یہ گھٹا دل پر کیسے تک چھائی اور

برستی رہے گی جانے کب تک۔

ہائے یہ کیسے عذاب ہیں جو سانسوں کی طرح زندگی سے چمٹے ہیں۔ ان سے رہائی کب ہوگی۔

ڈاکٹر آذر کے جانے کے بعد ڈاکٹر یوسف اور کرنل وسیم نے اپنی ہر قسم کی اعانت کی پیش کش کی، ہم تمہارے ڈاکٹر چچا کی جگہ ہیں۔ جب کبھی تمہیں کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو بلا تکلف کہو۔"

"اس نوازش کے لئے بہت شکریہ۔ کبھی ضرورت پڑی تو ضرور کہوں گی۔"

تبھی اس کے کانوں میں اپنے ڈاکٹر چچا کی آواز گونجی۔

"میں تمہیں کسی لحاظ سے بھی بھیک مانگنے والی ہستی نہیں بنانا چاہتا۔ اپنی خودداری کی نگہبانی کرنا۔"

یہ الفاظ اور باتیں تھیں، جن کے سہارے ہفتے بھر کے بعد اس کا مزاج اعتدال پہ آیا۔ ڈاکٹر آذر کے ساتھ مالی، نوکر، چوکیدار اور ڈرائیور بھی زندگی سے نکل گئے۔ ہاں رقیہ نے ہسپتال کی نوکری سے استعفیٰ دیدیا۔

"میں تمہیں اکیلا نہ چھوڑوں گی۔ بھاڑ میں جائے ہسپتال والوں کی تنخواہ۔ بس میں روکھا سوکھا کھا کر یہیں پڑی رہوں گی۔

اماں آپ کتنی اچھی ہیں آپ کو پتہ ہے میں آپ کی کچھ خدمت نہ کر سکوں گی۔"

اب خدمتوں کا حساب کتاب چھوڑو تم نے مجھ اماں کہا، اور میں تمہیں بیٹی کہہ کر پکاروں گی۔

بی اے کا نتیجہ نکلا تو وہ اخباروں میں ضرورت ہے کا اشتہار دیکھتی مگر پڑھنے کی خواہش غالب آگئی۔ اس نے ایم اے میں داخلہ تو لے لیا، مگر وہاں دنیا ہی مختلف تھی۔ اس کی کلاس میں صرف ۲۵ طلبا تھے۔ کتابیں، پروفیسر، لائبریریاں اور مختلف

ایکٹیویٹی۔

گھر میں اکثر اسے پینٹنگ کرتے دیکھ کر اماں نے یاد دلایا۔

"بیٹی پڑھوگی نہیں تو پاس کیسے ہوگی۔"

بالکل یہی بات بچپن میں ڈاکٹر چچا بھی کیا کرتے تھے۔ اب بھی جیسے وہ سامنے بیٹھے کہہ رہے ہوں۔ "میں پڑھوں گی محنت کروں گی۔ رضو نے تہیہ کرلیا۔

صرف سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ ہی ایسا تھا جہاں طلبا اور اساتذہ میں کافی مفاہمت کی فضا تھی۔ یوں بھی سائیکالوجی کے طلبا بچپن سے ہی خود کو جانچنے پرکھنے اور سمجھنے کی خوش فہمی کا شکار ہوتے ہیں دس لڑکے اور پندرہ لڑکیوں کی کلاس میں جلد ہی مفاہمت ہوگی۔ کتابوں اور لیکچر کا تبادلہ عام سی بات تھی اپنی کلاس میں اس کی سہیلیاں بن گئیں۔ مہینے میں ایک آدھ دفعہ وہ ان کے یہاں چلی جاتی اور ایسے ہی کسی کتاب یا نوٹس کے سلسلے میں کوئی سہیلی گھر آجاتی۔ کبھی کبھار سنیچر کا پروگرام بھی بن جاتا۔

اماں نے اسے کبھی کسی بات کے لئے اصرار نہ کیا تھا۔ نہ رات کو دیر سے کھانا کھانے پہ نہ منہ اندھیرے کوٹھی کے چمن میں تنہا پھرنے پر۔

ایم اے کے پہلے تین مہینوں میں ہی اس کے ڈیپارٹمنٹ میں سب کو پتہ چل گیا۔ "تم اتنی اچھی آرٹسٹ ہو۔ ہمیں کیا خبر تھی۔" اس کے ہم جماعت اعجاز اور سلمان نے کہا۔

آرٹ کونسل کی سالانہ نمائش میں اس نے دو ایک نئی تصویریں مقابلے کے لئے بھیجیں۔ . . نئی آرٹسٹ ہونے کی وجہ سے اسے انعام کی کوئی توقع نہ تھی۔ یوں بھی وہاں ملک کے مشہور آرٹسٹوں کے شاہکار مقابلے میں شامل تھے۔

ایک ہفتے بعد ہی رضو کی کلاس فیلو کنول نے مژدہ سنایا۔ نمائش سے تم تو

چلی آئی مگر چار بجے تقسیم انعامات کی تقریب بڑی دلچسپ رہی۔ تمہاری تصویر آدمی اور درخت کو دوسرا انعام ملا۔ وہ تو ریہرسل تھی۔ اصل تقریب تو کل منعقد ہوگی۔ انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل میں چلو گی نا —"

"دیکھوں گی اگر فرصت مل سکی۔"

"اللہ رے بے نیازی —"

اگلے دن کنول اسے ڈیپارٹمنٹ سے ہی ہمراہ لے گی۔

کئی طلبا نے اپنی اٹوگراف بک بڑھادی۔ رضو کو گزری ہوئی ایک تلخ شام کی یاد آگئی۔

جب کالج کے کچھ طلبا نے اس کا مذاق اڑایا تھا۔

بڑی مشکل سے اس نے روشنیوں سے جگمگاتے ہوئے سٹیج پر جا کر انعام اور سرٹیفکیٹ وصول کیا ایر کنڈیشنڈ ہوٹل میں اپریل کے مہینے میں بھی وہ پسینے میں نہا گئی۔

کنول چند دوسرے ڈیپارٹمنٹ کے طلبا کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ اور تنہا رضو سے آ لپٹی۔ مگر وہ چائے پینے کے بعد گھر آنے کا سوچ رہی تھی کہ ایک اجنبی نوجوان اس کی طرف آگیا۔

انعام ملنے پر مبارکباد قبول کیجیے۔ آپ کے شاہکار میں دیکھتا رہتا ہوں۔ اگر بدھ کی شام آپ ہمارے یہاں پارٹی پر آئیں تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"مبارک باد کے لئے شکریہ — میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے شاید نہ آسکوں —"

دیکھیے انکار نہ کیجیے۔ یہ رہا میرا تعارفی کارڈ۔ میری بہن روحی آپ سے ملنے کی بڑی مشتاق ہے۔"

کارڈ تھما کر وہ چلا گیا۔

گھر واپس آتے ہوئے رضو کا جی چاہا۔ وہ تعارفی کارڈ پھاڑ کر راستے میں کہیں پھینک دے مگر اس کی نگاہوں میں اس خوبرو اجنبی نوجوان کی شکل آ گئی۔ یوں جیسے اس کی نگاہ میں التجا جھلک آئی ہو۔ "ضرور آیئے۔"

رات کو وہ فزیکل سائیکالوجی کی کتاب پر جھکی ہوئی تھی کہ معاً اس اجنبی کا خیال آ گیا۔ پرس سے کارڈ نکال کر اس نے دیکھا۔

محسن رضا۔

ڈائریکٹر

اپالو میڈیکیشن کمپنی لاہور

اتوار آنے میں دو دن تھے۔ جب اپنے ڈیپارٹمنٹ میں اس نے سوچ لیا۔ محسن رضا صاحب تمہاری دعوت میں کتنا خلوص کیوں نہ ہو مجھے پارٹیوں سے کوئی دلچسپی نہیں جس میں لوگ مجھے چیف گیسٹ بنا کر میری عزت افزائی کریں۔ مجھے اس میں قطعی سطحی پن لگتا ہے۔

اے کاش ڈاکٹر چچا آپ یہاں ہوتے تو میں آپ سے کچھ مشورہ کرتی۔ کون جانے یہ راستہ کدھر اور کتنی دور جاتا ہے۔ ان انجانے راستوں کی خبر کون دے تو کوئی سمجھی نہیں رہا۔

اور یہ اجنبی شخص جو شکل وصورت سے اتنا اچھا لگتا ہے مجھ میں کیوں اتنی دلچسپی لے رہا ہے۔ شاید وہ مجھے ایک مشہور آرٹسٹ سمجھ کر ملنا چاہتا ہے۔

ہفتے کی دوپہر جب وہ کئی گھنٹے ایک طویل پریکٹیکل میں مصروف رہی۔ اور واپس گھر آ رہی تھی کہ چپراسی نے آ کر اطلاع دی۔

"کوئی آپ کو ملنے آیا ہے۔"

اس شہر خرابات میں شاید کئی اس آرٹسٹ کو جانتے ہوں مگر نوشش لب کو کوئی نہیں جانتا۔ ڈاکٹر چچا کے بعد اب میرا کون عزیز رہا ہے۔

"نادر تم چلو میں آ رہی ہوں۔"

ملاقاتی کمرے کے دروازے میں قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹھک کر رہ گیا محسن کرسی پر بیٹھا سگریٹ کا دھواں اڑا رہا تھا۔ نوشے کو دیکھ کر وہ بڑے من موجی انداز سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ یہاں۔۔۔؟"

"آداب۔۔۔ تسلیم۔" وہ اخلاقاً مسکرائی۔

"سوچا کہیں آپ بھول نہ جائیں، میں آپ کو یاد دلاتا چلوں، اگر کہیں تو کل چار بجے آپ کو لے جاؤں۔"

"دوجی کہ آپ کے آنے کی بہت خوشی ہے۔"

"آپ زحمت نہ کیجئے میں کل خود آجاؤں گی۔"

"وعدہ کیجئے آپ آئیں گی۔ بھول نہ جایئے۔ بس یہی یاد دہانی کرانی تھی، اچھا خدا حافظ۔"

محسن چلا گیا۔ دروازہ خود بخود بند ہوا تو وہ چونکی۔

بھلا یہ شخص خود کو کیا سمجھتا ہے جیسے میں انکار نہیں کر سکتی مگر اسے کیوں اتنا اعتماد ہے کہ میں بہر کیف کل جاؤں گی۔ مگر تھوڑی دیر کے لئے میں اسے بتا دوں گی۔

"محسن صاحب آپ کو پتہ ہونا چاہیئے۔ میں عزلت پسند لڑکی ہوں لوگوں سے ملنا جلنا مجھے پسند نہیں۔"

چار بجے وہ جانے کے لئے تیاری کر رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

رضوانہ آپ آرہی ہیں کہ مجھے لینے کے لئے آنا پڑے گا۔"

"جان نہ کھاؤ۔ بابا آرہی ہوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ زیادہ دیر نہیں رکوں گی۔ اگلے ماہ میرے امتحان ہونے والے ہیں۔"

"آپ تشریف تو لائیے جب جی چاہے چلی جائیں۔"

خود سارٹھی میں اسے احساس ہوا۔ وہ بڑی اچھی لگ رہی ہے۔ کانوں میں اویزے اور گلے میں نکلس پہن کر وہ آئینے کے سامنے آئی۔ ایک صورت نے اس کا منہ چڑا دیا۔ اس کا جی چاہا۔ پیپر ویٹ اٹھا کر شیشے پر دے مارے گھر میں آئینہ نہ ہوگا تو اسے کبھی یہ احساس نہ ہوتا کہ وہ اچھی لگتی ہے یا بری۔ حسین ہے یا بدصورت ۔۔۔ یہ آئینہ جو میرے دل کی خوشی اور ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ نوچ لیتا ہے۔

اس کی ٹیکسی نئی وضع کی خوب صورت کوٹھی کے گیٹ کے سامنے ٹھہر گئی گیٹ کھلا تھا۔ ابھی وہ چھ آٹھ قدم ہی بڑھی تھی کہ سیاہ سوٹ میں ملبوس محسن ایک لڑکی کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔

"ارے آپ۔ رضوانہ ان سے ملو۔ میری چھوٹی بہن روحی انجم اور روحی سے آپ کا غائبانہ تعارف پہلے ہی ہے۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" روحی نے گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ تینوں ڈرائینگ روم میں آئے۔ محسن نے اپنے چند اور مہمانوں سے اس کا تعارف کرایا۔ ان سے ملیے میرے بہت اچھے دوست اور ہمارے میڈیسن کمپنی کے فیلڈ منیجر شکیب جلال حال ہی میں کراچی سے آئے ہیں اور یہ شہر کی مشہور آرٹسٹ رضوانہ سائیکالوجی میں ایم اے کر رہی ہیں۔"

سارے یا تو تعلیم یافتہ ذہنی طور پر احساسِ کمتری میں مبتلا لوگ کتنے یا اپنے

اپنے ماحول کی تربیت کا اثر تھا ان دس بارہ لوگوں میں سے کسی نے ذرا سا تعجب کا اظہار نہ کیا۔

"ارے آپ ایسی ہیں۔ ہم نے تو آپ کو کچھ اور سمجھا تھا، یہاں تک کہ پی کام میں پڑھنے والی انیس سالہ روحی نے بھی رتی بھر حیرت کا اظہار نہ کیا۔ اور یہاں آکر رضو کو احساس ہوا، ایک جگہ ایسی بھی ہے جہاں لوگ ایک دوسرے کو صورت سے نہیں اس کے شوق اور کام کے رشتے سے پہچانتے ہیں ان سب لوگوں میں ایک شخص جو آنکھوں سے بڑا ذہین لگتا تھا اس کا جب رضوانہ سے تعارف ہوا تو وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔

"میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔"

"خوابوں میں دیکھا ہو گا۔" محسن نے مذاق کیا۔

شاید ایسا ہی ہو مجھے یاد نہیں پڑتا۔"

تھوڑی دیر کے بعد اور کئی عزیز رشتہ دار آگئے۔ کوفی اور چائے کے بے شمار لوازمات تھے، نمکین اور میٹھی سبھی چیزیں تھیں، پارٹی کے دوران روحی نہ وقت رضو سے باتوں میں مصروف رہی کامرس کے فیلڈ میں عورتوں کی کس قدر ضرورت ہے۔

"آپ بہت ہمت والی خاتون ہیں جو اکیلی رہتی ہیں مجھے تو ایک دن تنہا رہنا پڑے تو جانے مجھے کیا ہو جائے۔"

"میں نے بھی ایک دن یہی سوچا تھا۔ جب میرے ڈاکٹر چچا دور دیس سدھارے اور مجھے خیال آیا۔ دنیا میں مر جانا سب سے آسان ہے، اس لئے میں نے جینے کے بارے میں سوچا۔

کیا پتہ آپ کے چچا جان ٹھیک ہو کر آجائیں وہ غیر ملک، علاج کے لئے

گئے ہیں۔

"مایوسی گناہ سہی پر چچا جان کی حالت بڑی نازک تھی۔ وہ اپنی قوتِ ارادی کے بل پر زندہ تھے۔ میں نے ہمیشہ ان کے چہرے پہ تازگی اور مسکراہٹ دیکھی تھی مگر اس دن مرجھاتے ہوئے تھے جیسے زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں۔ نوشے — میں نے بہت کام کیا ہے۔ اب میں تھک گیا ہوں۔ مجھے نیند آرہی ہے تم میری واپسی کی امید نہ رکھو۔"

انہوں نے جاتے ہوئے ہاتھ ملا کر کہا تھا۔

یہ کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ محسن نے دونوں لڑکیوں کے پاس آکر کہا۔

"آپ اپنے دوستوں کے ساتھ جائیے — ہمیں اپنے مطلب کی باتیں کرنے دیں۔"

"بہت خوب پہلی ملاقات میں ہی ایسی دوستی —"

"ایسے بھی ہوتے ہیں۔" روحی شرارت سے بولی۔

آٹھ بجے ہوں گے جب نوشے نے چلنے کی تیاری کی۔

روحی اسے کہہ رہی تھی کہ آپ سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ پھر کبھی ضرور آئیے —

"کوشش کروں گی روحی بہت مصروف رہتی ہوں۔"

"بھیا آپ کیوں نہیں رضوانہ کو گھر چھوڑ آتے —"

"نہیں صاحب میرے ساتھ سکوٹر پہ بیٹھنا تو یہ گناہ سمجھتی ہیں۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں —"

"تو اب دوسری بات نہ کیجئے چلئے یہ چند میل کا تو فاصلہ ہے۔"

محسن کے ساتھ وہ باہر آئی۔ اس نے سکوٹر سٹارٹ کیا تو وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی۔

باہر اندھیرا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی راستے میں وہ بولا۔

"میرا خیال ہے آپ یہاں آکر پچھتائی تو نہ ہوں گی۔"

"نہیں بہت اچھا وقت گزرا۔ رعنا اور میں کافی دیر تک عورتوں کے کیریئر پر باتیں کرتے رہے۔"

بنگلے کے دروازے پر محسن نے اسے ڈراپ کیا۔ مگر گھر میں داخل ہوتے ہی تنہائی اور اداسی کا جیسے ایک باب کھل گیا۔

میرے گھر میں اور محسن کے گھر میں کتنا فرق ہے۔

اس شام اسے کئی باتوں کا خیال آتا رہا۔ اس شب وہ دو بجے تک نہ سو سکی۔ دو تین دن بعد اسے خیال بھی نہ رہا، کہ وہ کبھی ایک شاندار پارٹی میں مدعو تھی۔ اسے شدت سے ڈاکٹر چچا کی طرف سے کسی اطلاع کا انتظار تھا۔ مگر اس گھر میں تو شاذ و نادر ہی کوئی خط یا ٹیلی گرام آتی تھی۔ پہلے اس گھر سے باہر کوئی نہ تھا اور اب جب کہ ڈاکٹر چچا باہر ہیں مگر مہینے گزر گئے۔ انہوں نے کوئی خبر نہیں بھیجی۔ اب کوئی تار خط آیا بھی تو اس میں کوئی اچھی خبر نہیں ہوگی۔ یہ میرا دل کہتا ہے اس لئے جب کبھی دروازے پہ کوئی دستک ہوتی تو اس کے دل کی دھڑکن غیر معمولی طور پہ بڑھ جاتی اور وہ خوف زدہ سی ہو جاتی۔

کتنے ہی بے کیف اداس دن گزر گئے۔ صبح ڈیپارٹمنٹ جانا اور دوپہر کے بعد لمبوں میں دھکے کھا کر لوٹ آنا۔ گویا زندگی کی ساری جد و جہد کالج پہنچنے اور واپس آنے تک محدود ہے۔

ایک مہینہ گزر گیا تو وہ چلا پڑی۔

اس اجڑے سید خانے میں نہیں کوئی نہیں آئے گا، بھلا میرا کون ہے، جس کے آنے کی مجھے امید ہو۔

اور محسن کو کون جانے اسے میرے گھر کا پتہ بھی یاد ہے یا نہیں۔ اور اس دن کی پارٹی کے بعد وہ پھر کبھی دکھائی نہیں دیا، شائد بہت مصروف ہو۔

اُس دن لیبارٹری میں دوپہر پریکٹیکل کے بعد جب وہ ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکلی تو چار بج چکے تھے۔ آج سر مظہر نے دو پریکٹیکل کرائے تھے ہر پریکٹیکل ڈھائی گھنٹے کا تھا۔ کسی سٹوڈنٹ کی جرات نہ تھی کہ وہ کوئی عذر معذرت کرتا۔ پہلے پریکٹیکل کے بعد لڑکیاں کچھ کھانے پینے کینٹین میں چلی گئیں۔

"رضو چلو اور کچھ نہیں تو چائے اور سموسے ہی کھا آئیں۔"

"دوسرا پریکٹیکل چار بجے سے پہلے ختم نہیں ہوگا۔" کنول نے کہا۔

"کوئی بات نہیں مجھے بھوک نہیں تم چلی جاؤ۔" رضوانہ نے جواب دیا۔ کنول عرشی کے ساتھ چلی گئی۔

پھر سبھی طلبا لیبارٹری میں آ گئے اور آپس میں پریکٹیکل کی باتیں کرنے لگے اور کچھ طلبا کے گروپ بن گئے۔ اس طرح لڑکوں اور لڑکیوں نے ہدایات لکھنے کے بعد پریکٹیکل شروع کیا۔ سر مظہر کرسی پر بیٹھے نفسیات کی ایک کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ مگر گاہے گاہے وہ دیکھ لیتے کہ طلبا ٹھیک کام کر

رہے ہیں یا نہیں۔"

پھر سب نے اپنی اپنی پریکٹیکل کی رپورٹ مکمل طور پر لکھ کر دکھائی۔ تو انہوں نے طلبا کو جانے کی اجازت دی۔

لبنیٰ اپنی بہن فریدہ ۔ ہم جماعت سعیدہ کے ساتھ چلی گئی۔ رضو آخری لڑکی تھی جو اپنے ڈیپارٹمنٹ سے سب سے بعد میں نکلی اور سڑک کے کنارے بس سٹاپ پر آ کھڑی ہوئی۔

بھوک کے ساتھ تھکن کا بھی احساس تھا۔ آج بھی گھر میں کوئی نہ پوچھے گا۔ کیا حال ہے کیسی پڑھائی ہو رہی ہے۔ اور ہماری رفیعہ اماں وہ تو اب کانوں سے بھی کم سنتی ہیں۔

وہ آج گھر بس کی بجائے رکشے میں جانے کا سوچ رہی تھی کہ ایک فیروزی کار بالکل اس کے نزدیک آ کر رکی۔ اور وہ غصے سے دوسری طرف منہ کر کے کھڑی ہو گئی۔ مگر وہاں تو ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ لئے شکیب، سٹیرنگ پر جھکا ہوا تھا۔ اس نے جوں ہی ادھر منہ پھیرا اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

پہلے تو رضو کا جی چاہا۔ صاف انکار کر دے مگر ایسے شائستہ مودب اور نفیس لباس والے شخص کو انکار کرنا کچھ مناسب نہیں۔

"میں چلی جاؤں گی آپ زحمت نہ کیجئے۔"

"یہ تو مجھے بھی پتہ ہے۔ جلدی سے بیٹھ جائیے ورنہ تمہارے کسی ہم جماعت نے دیکھ لیا تو کیا سوچے گا؟"

سیاہ پتلون اور دودھ شفاف قمیض میں اس کا چہرہ دھلا ہوا تھا۔ وہ بیٹھی تو شکیب نے کار سٹارٹ کر دی۔

"ہاں میرا آپ سے کیا رشتہ ہے۔"

"بھوک لگی ہو تو آدمی کو غصہ بھی زیادہ آتا ہے۔"

"یہ کوئی ضروری نہیں۔"

"اس دن کی پارٹی کے بعد میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔"

"مجھ میں سرخاب کے پر تو نہیں لگے ہوئے۔"

"میں تو سمجھتا ہوں اور اس دن مجھے اس کا احساس ہوا تھا۔

"مجھے بے وقوف بناتے ہیں۔"

"نہیں میرے دل میں آپ کا بڑا احترام ہے گو میں خود آرٹسٹ نہیں ہوں مگر میں نے آپ کی تصویروں میں حقیقی رنگ اور انداز کی جھلک دیکھی ہے۔ چیختی چلاتی دوحروں والا تجریدی آرٹ کا کم از کم میں قدردان نہیں"

کار انٹر کانٹی نینٹل کے پورچ میں آئی تو وہ چونک پڑی۔

"مجھے تو گھر پہنچنے کی جلدی تھی آگے ہی ڈیپارٹمنٹ سے چار بجے فراغت ملی تھی۔"

"آدمی جب زیادہ تھک جائے تو ایک کپ چائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کے چہرے سے تو یہی لگتا ہے۔"

"آپ سے بڑا شرارتی شخص بھی بھلا اس شہر میں کہاں ہے۔"

اگرچہ نوشبے کا جی نہیں چاہتا تھا کہ چائے پیئے مگر اب انکار کی گنجائش کہاں تھی۔

شکیب نے ایک میز منتخب کر لی اور چائے کے ساتھ سینڈوچز کا آرڈر دے دیا۔

رضوانہ نے چائے بنائی، شکیب باتیں کرتا رہا، اور وہ سنتی رہی۔ میں

نہیں چاہتا کہ تم محسن سے دوبارہ ملو۔"

وہ ایک دم چونک گئی۔

"میں آپ کے بھی کے حکم کی پابند نہیں۔ میرا جہاں جی چاہے گا جاؤں گی جس سے چاہوں ملوں گی۔"

"رضوانہ میں تمہاری بھلائی چاہتا ہوں محسن جتنا سمارٹ اور شوخ ہے اتنا ہی فلرٹ بھی ہے اس کی پہلے بھی چھ سات لڑکیاں دوست ہیں اگر اس کی صرف تم سے دوستی ہوتی تو میں یہ بات تم سے کبھی نہ کہتا۔"

"اگر محسن یہی بات آپ کے بارے میں کہے تو۔"

"میری تو صرف ایک ہی لڑکی سے دوستی ہے۔"

"کون ہے وہ ۔۔۔" رضو دل ہی دل میں سلگ کر رہ گئی۔

"تم ۔۔"

"اوہ میں نے سمجھا کوئی اور ہوگی۔" وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"اچھا آپ چلتے ہیں اگر آج میری وجہ سے دیر ہو گئی اور تمہاری امی نے ڈانٹ پلائی تو پھر تم مجھ پر الزام دھر دو گی اور دوبارہ ملنے سے انکار کر دو گی۔"

رضو خاموشی سے کار میں آ بیٹھی تو شکیب پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"میری بات کا تم نے جواب نہیں دیا میری کوئی بات تمہیں بری لگی ہے تو میں معذرت چاہوں گا۔"

"شکیب صاحب آپ اتنی تھوڑی سی مدت میں آپ سے اتنے بے شمار سوال کر ڈالے ہیں کہ میرے لئے مشکل ہو گئی ہے کہ میں کس بات کا جواب پہلے دوں اور کس بات کا بعد میں۔"

"زندگی کو اگر مسئلہ بنا لیں تو یہ دھاگے کی ڈوری کی طرح الجھ جاتی ہے تم

مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو۔ اور اگر میں تمہارے کسی مسئلے کو حل کرنے میں تمہاری مدد کر سکوں تو مجھے خوشی ہو گی۔"

"شکیب صاحب میرے گھر میں کوئی نہیں جو میرا انتظار کرے یا مجھے کسی بات پر ڈانٹے۔"

"کتنا بڑا المیہ ہے کہ تم اکیلی ہو۔"

"یہ زندگی المیوں سے بھری پڑی ہے اور مجھے پھر ڈیوں سے نفرت ہے۔"

"میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں۔"

"نوازش ہے آپ کی۔"

اس وقت چھ بجے ہوں گے جب رضو گھر آئی۔

"بہت بہت شکریہ۔"

"مجھے تمہارا خیال رہے گا۔" "پھر کب ملو گی؟"

"ہفتے کو بارہ بجے کے بعد آپ ہمارے ڈیپارٹمنٹ آجایئے۔"

"خدا حافظ کہہ کر وہ اندر آئی تو گھر اتنا اجڑا ہوا نہ لگتا تھا۔

شکیب سے اچانک ملاقات۔

کتنا اچھا انسان ہے اونچا لمبا باوقار با ذوق میرا اسے کتنا خیال ہے۔

سات بجے اماں نے کھانا لگایا تو وہ چپ بغیر نہ رہ سکی۔

"اللہ خوش رکھے میری بیٹی ضرور کوئی بات ہے۔ بہت خوش نظر آتی ہو۔"

"ہاں آپ کو کیا بتاؤں کبھی کبھی آدمی کو کسی خیال سے خوشی ملتی ہے ضروری نہیں کہ کچھ پایا جائے۔"

"مجھے بہت خوشی ہوئی ہے تمہیں خوش دیکھ کر کتنا اچھا ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب

تمہارے فرض سے بھی سبکدوش ہو جاتے۔"

" آپ کا مطلب میری شادی سے ہے اتنی جلدی کیا ہے ابھی تو میں پڑھ رہی ہوں۔"

شکیب کے خیال سے ہی اس کے دل میں مسرت کی کرنیں لہرانے لگیں کھانا کھانے کے بعد پڑھنے کی بجائے وہ ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھ کر دیوان پر لیٹ گئی، اسے ساحر کا ایک شعر یاد آنے لگا۔

میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھی ہوں
یہ تبسم یہ تکلم تیری عادت ہی نہ ہو
یہ حقیقت بھی حقیقت میں اک فسانہ ہی نہ ہو

شکیب آپ سمجھتے ہیں میری امی دیر سے گھر آنے پر مجھے ڈانٹیں گی آپ کو کیا آخری شمع جو اس اجڑے دیار کی باقی تھی وہ بھی نہیں رہی چچا آذر کے بعد یہاں کون ہے جو میرا خیال رکھے۔ آپ مجھے پسند کرتے ہیں بھلا آپ کو مجھ میں کیا خوبی نظر آئی ہے میں آپ کے بارے میں سوچ سکتی ہوں آپ ہر لڑکی کے خیال کا مرکز بن سکتے ہیں آپ شاندار شخصیت کے مالک ہیں اور میں نہ کتنی مسرور ہوں آج جیسے مجھے کچھ مل گیا ہو،

شکیب آپ نے میری شہرت کا بام دیکھا ہے مگر میری اذیت ناک تنہائی کا غار نہیں دیکھا، جہاں چڑھتی صبحوں اور ڈھلتی شاموں کو تاریکیاں برستی ہیں۔ جہاں ویرانی منہ چھپا کر روتی ہے۔ یہاں میرے گھر کے در و دیوار سے ایک کہانی لپٹی ہے میری اپنی کہانی۔ میں جو اپنے دولت مند اور حسین والدین کی پہلی بچی تھی، میرا وجود ان کے محل کی خوبصورت دیواریں برداشت نہ کر سکیں، پہلے دن سے ہی میرے پاؤں میں جلا وطنی کا ایک چکر پڑ گیا ہے اس کبھی نہ ختم ہونے والے چکر

ڈاکٹر چچا بھی بچھڑ گئے۔ مجھے کچھ بتانے کے لئے انہوں نے بہت کچھ دیا۔ میں برسوں سے اس دنیا میں ہونے والی بے انصافی زیادتی اور کالے گورے کی تقسیم سے لڑ رہی ہوں اس جنگ میں وقت نے مجھے بہت بڑی تھپیڑوں کی چٹان بنا دیا ہے۔ اب کوئی جانی پہچانی شناسا صورت میرے گرد نہیں رہی، اسی لئے میں کبھی کبھی اپنے سائے سے بھی خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔ اپنے دل سے اٹھتی آوازوں سے ڈرتی ہوں، سہمتی ہوں۔

مجھے ان پارٹیوں اور مختلف تقریبات سے کوئی دلچسپی نہیں مگر میں وہاں جاتی ہوں۔ خود کو ان خوش باش اور زندہ دل لوگوں میں جذب کرنے کی کوشش کرتی ہوں، پر ریت اور چینی کی طرح میں ختم ہر گز نہیں ہوتی اور میرا وجود ایک ٹوٹے ہوئے دم دار تارے کی طرح سب سے الگ نظر آتا ہے۔

میرے اچھے ڈاکٹر چچا نے عمر بھر مجھے یہی سمجھایا کہ میں گزرے دنوں کا خیال نہ کروں پرانی باتوں کو بھول جاؤں۔ کون ظالم ہے کون مظلوم اس پیمانے سے کسی کو نہ پرکھوں مگر ان باتوں کو میں کیسے ذہن سے کھرچ دوں، اپنی روح پہ منڈلاتے سوچ کی ہڈی پہ عقاب کی طرح چونچیں مارتے شور و غل سے دم بھر کے لئے نجات پا لوں۔ میں جینا چاہتی ہوں۔ کسی ارفع مقصد کی خاطر ایک اہم انسانی بن کر۔

میں برسوں سے کسی ان دیکھی خوشی ایک انجانے احساس کی تلاش میں پھر رہی ہوں، یہ احساس یہ خوشی شاید مجھے آپ سے آپ کی ذات میں کہیں چھپی ہوئی مل جائے، شکیب آپ سے باتیں کر کے کیسی عافیت اور سکون کا احساس ہوتا ہے۔ آپ کو کراچی سے آئے ہوئے تھوڑا عرصہ ہی تو ہوا ہے گو میڈیکل فیلڈ سے تعلق رکھتے ہیں، مگر ادب آرٹ اور موسیقی کے بارے میں آپ کی

معلومات حیرت انگیز ہیں اس تھوڑے سے وقت میں جانے کیسے آپ میرے اتنے قریب آ گئے ہیں۔ جی چاہتا ہے آپ اپنا بازو بڑھا دیں اور میں اس پر سر رکھ کر سو جاؤں۔"

اس رات وہ کئی سالوں کے بعد پُرسکون نیند سوئی۔ صبح وہ جاگی تو چڑیاں آم کی ٹہنیوں پر اچھل رہی تھیں۔ بلبلیں رات کی رانی کے گھنیرے پودے پر شوخیاں کر رہی تھیں اور موتیا کی کلیوں پر ٹھہرے ہوئے شبنم کے قطرے کیسے بھلے لگتے ہیں۔ اس کا جی چاہا فضاؤں میں رقص کرتی پھرے صحن گلشن میں کھلے موتیا کی کلیوں کو چوم لے اور اپنے سارے بال کھول کر کندھوں پر گرائے اور اپنے گھر کی دہلیز پر بیٹھ کر اس انجانے مسافر کا انتظار کرے جسے اس کے دل نے پکارا تھا۔

دو دنوں کی چھٹیوں کے بعد وہ آج پھر کالج گئی۔ آسمان کا نیل کتنا گہرا ہے وہ جانے کیوں مسکرائے جا رہی تھی۔

کنول پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"بہت خوش لگتی ہو۔ کیا مل گیا ہے۔"

"بس یونہی جی چاہتا ہے پھولوں کو دامن میں بھر لوں اور ڈھیر ساری موتیے کی کلیاں تم پر اچھال دوں۔"

"پھولوں پودوں اور بہاروں پر پیار تبھی آتا ہے جب کوئی دل میں بس جائے ہے نا یہی بات ہمیں نہیں بتاؤ گی۔"

"ہے ایک شخص بہت پیارا اس دنیا کا انوکھا انسان ہے، جس نے میرا دل جیت لیا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے آنکھیں بند کر کے بس اسی کے خواب دیکھوں۔ اسی کی صورت تکتی جاؤں۔"

"میری سہیلی تم اس دنیا میں رہنے والی تنہا لڑکی ہو تمہیں بہاروں کی جو منزل ملی ہے۔ خدا کرے یہ راستہ تمہیں راس آئے۔ تم اپنی گزری ہوئی زندگی کے الام بھول جاؤ۔ اور وہ شخص تمہارا قدر دان ہو۔"

کنول نے دل ہی دل میں اپنی پیاری سہیلی کے مستقبل کے لئے دعا مانگی۔

"کیا کہا۔" رضو نے چونک کہا۔

"اللہ کرے امتحان کے بعد جھٹ پٹ تمہاری شادی ہو جائے اور تم گھر والی بن جاؤ۔"

"اور تم عمر بھر یونہی بیٹھی رہو۔"

"میں بھی گھر بسالوں گی۔"

اگلے دن کلاس ختم ہونے کے بعد وہ اکیلی گھر جا رہی تھی کالج کے آہنی گیٹ کے باہر کسی نے بہت قریب ہو کر آداب کہا تو وہ چونک پڑی۔ ہفتے میں تو ابھی دو دن باقی ہیں۔

"ارے آپ۔"

"آدھا گھنٹہ ہو گیا انتظار کرتے۔" شکیب نے کار کا اگلا دروازہ کھولا وہ بیٹھی۔ تو کار اسٹارٹ ہوئی۔ مال پر آئے تو شکیب نے زبان کھولی۔ "تمہیں میرے ساتھ کہیں جاتے ہوئے ڈر نہیں لگتا۔"

"آپ آدم خور تو نہیں جو مجھے کھا جائیں گے۔"

"کیا پتہ۔" شکیب شوخی سے بولے۔

"وہ صورتیں اور ہوتی ہیں۔" رضوانہ نے ناز سے کہا۔

صورتوں سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے۔ دراصل انسان وہ ہے جو اندر اور باہر سے ایک جیسا ہو۔" "میں بھی اس بات پر یقین رکھتی ہوں۔"

نہر کے کنارے پل کے ایک طرف اس نے کار روکی۔ بچے بے تکلفی سے نہر کے ٹھنڈے پانی میں نہاتے ہوئے شوخیاں کر رہے تھے۔

شکیب نے شرارت سے کہا،

"تمہیں تیرنا آتا ہے"

"مجھے تو ڈوبنا آتا ہے۔"

"اگر کسی دن نہر یا دریا میں گر پڑی تو ۔۔۔ ؟"

"پھر اپنی حفاظت اور زندگی کی خاطر تیرنے کی کوشش کروں گی۔"

دونوں نہر کے کنارے پیدل چل رہے تھے۔ دو رنگ یوکلپٹس کے درختوں کی قطاروں میں سے سورج کی روشنی چھن چھن کر رضو کے چہرے پہ پڑ رہی تھی۔

"اس خوبصورت اور قیمتی سوٹ میں تم بہت اچھی لگتی رہی ہو۔"

"مجھے ادبی محفل والوں کی طرف سے دعوت ملی ہے۔ افسانہ پڑھنے کے لئے جاؤں۔"

"بے کار ادب سے نابلد لوگوں کی محفل میں کئی غیر شائستہ لوگ آتے ہیں چند ایک ادبی خواتین کو بلا کر انہیں سنتے اور بے وقوف بناتے ہیں۔"

"تو نہ جاؤں۔"

"شہرت اور عزت حاصل کرنے کے اور بھی ذریعے ہیں۔ آوارہ لوگوں کی محفل میں جانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

نہر کے کنارے بنے چھوٹے سے کیفے میں بیٹھ کر دونوں نے بھاپ اٹھتی کوفی پی۔

تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے تو اچانک رضو کو احساس ہوا۔ دونوں نے محسوسات کے کتنے فاصلے طے کر لئے ہیں۔ جیسے

شکیب نے اس کی زندگی میں اہم جگہ پالی ہو اور اس کے بغیر زندگی میں کتنا ادھورا پن رہ جائے گا اگر وہ نہ ملا۔

پھر ملنے کا وعدہ کر کے وہ گھر آگئی۔ اگلے دن انتخاب اخرب کے یہاں سے اپنے کورس کی ایک کتاب لے کر باہر نکلی تو چیرنگ کراس پر محسن نے اسے روک لیا۔

"کیا حال ہے رضوانہ۔ پھر آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ آیئے میں آپ کو سکوٹر پہ چھوڑ آؤں جہاں جانا ہے۔"

"جی نہیں شکریہ۔ مجھے آپ کے ساتھ کہیں نہیں جانا۔"

اس کے لہجے کی بے رخی محسن نے دیکھ لی۔

"اب اپنے پاس شکیب صاحب جیسی نئے ماڈل کی ڈاٹسن تو ہے نہیں کہ شکریے کے ساتھ آپ لفٹ قبول کر لیں کیا مجھے نظر نہیں آتا۔؟"

"بات کار کی نہیں یہ تو انسان کے انفرادی سلوک کی بات ہے۔"

شکیب میرا دوست ہے۔

"آپ کی جاگیر ہے تو اپنے پاس حفاظت سے رکھیں۔"

"میں انسانوں کو قید میں رکھنے کا قائل نہیں یہ تو اپنی خوشی کا سودا ہے کہ آپ کس کو پسند کرتی ہیں۔"

"پھر آپ چلے جائیں مجھے بار بار راستوں میں پریشان نہ کریں۔"

"میں تو چلا جاؤں گا مگر وعدہ کرو پھر مجھ سے ملو گی۔"

"میرے پاس آپ سے ملنے کے لئے بالکل وقت نہیں۔"

آپ تو ناراض لگتی ہیں۔ اب ایسی بھی کیا بے رخی۔

"میں کسی سے خفا نہیں آپ اپنے راستے پہ جائیے مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"کسی دن روحی سے ملنے آجاؤ۔ وہ تمہیں یاد کرتی ہے۔"
"کبھی فرصت ملی تو آؤں گی۔"
"اچھا خدا حافظ۔"

وہ چلا گیا تو سڑک پر چلتے چلتے جانے کیوں اسے محسن پر بے حد غصہ آگیا۔ شکل سے کتنا معصوم بنتا ہے جیسے کچھ پتہ نہیں۔ مکار، عیار کہیں کا فلرٹ دھوکے باز۔ میں نے کیا سمجھا تھا۔ ایک دو نہیں پوری آٹھ دوستیں اور شکیب کے سامنے تو محسن رضا تم کچھ بھی نہیں ہو۔

ایسی ہی باتیں سوچتی وہ گھر آگئی۔

چند دن بعد شکیب اسے ملا، تو وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"تم اب بھی اس کمینے سے ملتی ہو۔ میں نے تمہیں مال پر اس سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ میں نے سوچا بلاکر کیوں دونوں کو پریشان کروں۔ محسن نے کہا ہے کہ تم نے اس سے ملنے کا وعدہ کیا ہے۔"

"ضروری نہیں جو وہ بات آپ سے کہے درست بھی ہو۔" رضو قطعی سنجیدہ ہو گئی۔

"کیا باتیں ہوئی تھیں۔"

"اسی باجی سے پوچھیے۔"

"تم سے کیوں نہ پوچھوں۔"

"جو شخص مجھ پر اعتبار نہ کرے اس سے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"معلوم ہوتا ہے محسن نے میرے بارے میں تم سے کچھ کہا ہے۔"

"تم لوگوں کی ناک موم کی کیوں بنی ہوتی ہے ہاتھ لگاؤ تو جھڑ گئی۔"

"معاف کرنا، رضو میں محبت میں شرکت کا قائل نہیں۔"

"میں بھی حصے داریاں پسند نہیں کرتی۔ مجھے اس شخص سے ملنے کی کوئی خواہش نہیں۔ ہاں سر راہے کوئی راستہ روک کر کھڑا ہو جائے تو کیا کر سکتی ہوں۔"

شبیز ان ریسٹوران میں داخل ہونے کے بعد وہ بولا۔

"چلو غصہ تھوک دو اب بتاؤ۔ آئس کریم یا چائے۔"

"آئس کریم آپ نے بہت جلایا ہے مجھے۔"

ویٹر ونیلا آئس کریم لایا تو چھپا پہ مار کی طرح شکیب نے سوال دے مارا۔

"ان ادبی محفلوں اور مشاعروں والی پارٹی میں تم کیوں جاتی ہو۔"

"مجھے شرکت کی دعوت ملتی ہے۔ اگرچہ میں باقاعدہ طور پر ادیب نہیں۔ مگر اس حلقے کے لوگ مجھے جانتے ہیں میں اپنی دلچسپی کے لئے وہاں جاتی ہوں بلکہ وہاں جانا میرے لئے فرار کی راہ ہے۔ مجھے اپنے اکیلے پن سے وقتی طور پر نجات مل جاتی ہے۔

میں نہیں چاہتا کہ تم ان فضول جگہوں پہ جاؤ۔ جہاں بے ہودگی پروان چڑھتی ہے سکینڈل جنم لیتے ہیں کوئی لڑکی بات کرے تو اسے رومانس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔"

"میں آئندہ نہیں جاؤں گی اب تو آپ خوش ہیں۔"

"بہت۔" شکیب نے انجانے میں اس کا ہاتھ تھام لیا "تمہارے ہاتھ بہت خوبصورت ہیں۔"

"شکریہ۔"

آئس کریم ختم ہوئی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "آج مجھے بہت پڑھنا ہے نہ پڑھا

تو کل کلاس میں شرمندگی ہو گی۔"

"چلو۔"

شکیب بھی اٹھ کر باہر آ گیا۔

گھر آنے پہ اس نے میز پہ لفٹ بک رکھی اور ذہن میں آئے ہوئے کئی سوالوں کا جواب پانے کے لیئے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

آئینے نے ایک سیدھی سچی تصویر کھینچی تو وہ جھنجلا گئی۔ یہ میں ہوں۔ میں اندر سے تو ایسی نہیں ہوں۔ میرے ان ہاتھوں کی آج شکیب نے تعریف کی تھی۔ اسے حسن میرے ہاتھوں میں نظر آیا ہے۔ میں جو اندر سے اتنی خوبصورت ہے اور حسین خیال رکھتی ہوں میں اتنی نفیس ذوق کی ہوں۔ پھر میری جلد کیوں سرخ و سفید نہیں۔ اس بائیس سال کی عمر میں میرے چہرے پر خوشی اور شوخی کی بجائے سوچ اور فکر کی لکیر کیوں ہے اور شکیب صاحب آپ جو اتنی شاندار شخصیت کے مالک ہیں، آپ نے مجھ میں کیا پایا ہے۔ مجھ میں کیا خوبی آپ کو نظر آئی ہے جو مجھے پسند کرنے لگے ہیں۔"

"رضو کل شام مجھے تمہاری یاد آئی۔ تمہارے ہاتھ مجھے بہت پسند ہیں۔ رضو اگر تم چپ رہو تو بھی اچھی لگتی ہو۔ بات کرو تو بھی پسند ہو۔"

اس کا دل چاہا عمر بھر یہی دو جملے سنتی رہے۔

"مگر آئینے میں یہ عکس کیوں چلا تا ہے۔"

رضو تم اس کے قابل نہیں ہو شکیب ہر لحاظ سے تمہاری دسترس سے دور ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اسے پانے کے لئے بلندی کی طرف جاؤ اور چوٹی سے گر پڑو۔ اور تمہارا دل اور ذہن پاش پاش ہو جائے اور باقی عمر ان بکھرے ذرے چننے میں لگ جائے۔ تم میں اور شکیب میں بہت فرق ہے وہ "تاریخ

پھر نہ دہرائے۔ جب تمہارے اور دوسروں کے درمیان کالے گورے کی تفریق کردی گئی تھی۔

ایسی ناپسندیدہ بچی کو اپنی بیٹی کہتے جہانگیر قدر کو شرم آتی تھی۔ اسی لئے انہوں نے اسے ختم کرنے میں عافیت سمجھی۔ پہلے یہ شرم ان کا حصہ تھی مگر باقی عمر کے لئے یہ شرم آہنی پردے کی طرح میرے اعصاب پہ تان دی گئی۔ اور گزرتے دن کے ساتھ یہ ایک احساس بن کر مجھے کھلتی ہے خنجر کی انی بنکر میرے سینے میں آجاتی ہے۔ اور کہتی ہے تجھے کوئی حق نہیں کہ اتنے اچھے انسان کی آرزو کرے۔

پھولوں سے رضوانہ کو ہمیشہ سے عشق تھا۔ گھر میں مختصر سا صحن تھا مگر اس میں بھی اس نے قسم قسم کے موسمی پھولوں کے پودے لگا رکھے تھے۔ کریسنتھیم، ڈہلیا، نیلوفر، بینیزی، یاسمین اور جانے کیا کیا۔ گاہے گاہے وہ پھولوں کے بارے میں کتابیں بھی منگواتی رہتی۔۔۔ تاکہ موسم کے مطابق پھول لگائے جائیں۔ اسے ایک قسم کا فخر تھا کہ اور لوگ پھولوں کے بارے میں کچھ جانتے ہوں یا نہ۔ مگر اسے ڈھیروں معلومات حاصل ہیں۔ وہ جب بھی صحن چمن میں پھولوں کی آبیاری کرتی بے اختیار ڈاکٹر چھاپا کا جملہ ذہن میں میں گونجتا۔

دنیا میں دو قسم کے لوگ رہتے ہیں۔ ایک پھول کی طرح دوسرے گندگی کی مانند۔ وہ جہاں سے گزریں فضا میں گندگی اور ناگواری ہو جاتی ہے۔ اور اپنے آپ کو چٹان سے تعبیر کرتے جو ہزاروں آنکھوں سے سب کچھ دیکھنے کے باوجود صدیوں سے چپ ہوں۔

"اوہ چچا جان آپ کو کون پتھر سمجھتا ہے۔ آپ بھی پھولوں کی فہرست میں

شمار ہوتے ہیں جہاں سے گزرے فضا معطر ہو گئی۔ مجھے چراغ جل اٹھے جاں بلب لوگ آپ کی جاں فشانی سے جی اٹھے، آپ کیا جانیں، آپ کے جانے کے بعد میں نے کیسے کیسے آپ کی کمی محسوس نہیں کی۔ کاش آپ تھوڑی سی اپنی ہمت اور حوصلہ مجھے دے جاتے۔ کلاس میں اس کی ہم جماعت لڑکیوں نے پھولوں کی نمائش میں جانے کا پروگرام بنایا۔

'کیوں گوشہ نشین چلنا ہے پھولوں کی نمائش میں۔'

کنول نے شوخی سے کہا۔

'ضرور جاؤں گی۔ گھر جا کر دیکھوں گی کس وقت جانے کا موڈ بنتا ہے۔'

'جیسے تمہاری مرضی ہم تو ابھی جا رہی ہیں۔'

پیریڈ ختم ہونے کے بعد کنول نے ڈیپارٹمنٹ کے گیٹ پر اسے خدا حافظ کہا، گھر آنے کے بعد وہ پھولوں کی کیاریوں اور گملوں کی صفائی کرتی رہی۔ چار بجے ہوں گے۔ جب اسے پھولوں کی نمائش کا خیال آیا۔

ساڑھے چار بجے جب وہ نمائش میں آئی تو بہت تھوڑے لوگ تھے۔ کیسے بدذوق ہیں اس شہر کے لوگ پھولوں سے کوئی لگاؤ نہیں اپنی چھوٹی سی نوٹ بک میں اس نے کئی نئے پھولوں کا نام اور تعریف لکھی۔ پھولوں کی تزئین و آرائش بہت خوب تھی۔ ہزار ہا طریقوں سے مختلف پھول سجے تھے۔ سچ تو یہ ہے پھولوں کی نمائش پر انتظامیہ نے بہت محنت کی تھی۔

کبھی دفعہ آزاد پرندے کی طرح تنہا گھومنے پھرتے میں کتنا لطف آتا ہے آج جب کہ پھولوں پر بہار ہے فضا معطر ہے اور میرا دل جانے کیوں اتنا خموش ہے۔ شکیب اگر آج آپ یہاں آتے تو کتنا اچھا ہوتا۔"

وہ جھک کر ڈیلیا کے پھولوں کی پتیاں گن رہی تھی۔

"آداب —" وہ اس لفظ سے چونک پڑی۔

دائیں ہاتھ پر محسن مسکرا رہا تھا۔

تسلیم — وہ اخلاقاً مسکرائی۔ شاید وہ آج خوش تھی یا پھولوں کے سامنے وہ کوئی بڑی بات نہیں کہنا چاہتی تھی۔ چند قدم وہ ساتھ چلا۔ تو رضو ایک جگہ رک گئی۔

"آپ جائیں —"

"میں اس قدر برا تو نہیں جتنا لوگ کہتے ہیں —"

"مجھے دوسروں کی اچھائی، برائی سے کوئی دلچسپی نہیں میں اپنی رائے اہم سمجھتی ہوں —"

"تمہیں پتہ ہے، شکیب کا میرے دل میں بڑا احترام ہے —"

"کیا یہ مجھ پہ احسان ہے —"

"رضو میں تمہیں بہت اچھا سمجھتا ہوں —"

"میں بھی آپ کو برا نہیں کہتی —"

"کہنے اور سمجھنے میں فرق ہے —"

"اتنی باریکیوں میں نہیں جانا چاہیے —"

دور سے اس نے شکیب کو آتے دیکھ لیا تو خدا حافظ کہہ کر آگے چلا گیا۔

جب وہ قریب آیا تو رضو خوشی سے کھل اٹھی۔

"ارے آپ مجھے تو امید نہیں تھی کہ یہاں آ جائیں گے —"

"محسن کے علاوہ اور لوگوں کو بھی پھولوں سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔"

"اب میں کسی کو نمائش میں آنے سے تو نہیں روک سکتی۔"

"اگر کوئی یہاں آئے تو ضروری نہیں کہ تم سے باتیں بھی کرے۔"

"میں کوئی سیاسی شخصیت نہیں کہ دوسروں کا منہ بند کر دوں۔" مجھے اس سے ملنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"میں نہیں چاہتا وہ تم سے ملے۔"

"بابا کون ملتا ہے پھر میں کوئی بے جان چیز تو نہیں کہ کوئی جیب میں ڈال کر لے جائے۔"

"اگر ایسا ہو گیا تو۔"

"ہر آدمی کی ایک حد ہوتی ہے اس سے آگے وہ نہیں سوچ سکتا مگر مجھ پہ کوئی اپنی مرضی مسلط نہیں کر سکتا۔"

کہنے کو رضو نے یہ سب کچھ کہہ دیا مگر اس کے ذہن میں جیسے کوئی چلایا تیرا کوئی ارادہ کوئی مرضی نہیں۔ تیرا اپنا علیحدہ کوئی وجود نہیں تو ایک کاغذی کشتی کی طرح ہے، جسے لہریں جدھر چاہیں بہا کر لے جائیں۔ تیری اپنی مرضی اور خوشی تو اسی دن مضطرب ہو گئی جس دن تو نے اس دنیا کے ادب و گی میں زندگی میں پہلا قدم رکھا۔ تیری بدقسمتی کہ تو اپنے باپ کی توقع کے مطابق حسین نہ تھی، یہی نہیں اسے شک تھا، کہیں یہ بھی کسی اور کی نہ ہو۔ اس لئے اس نے تیرے اور اپنے درمیان ایک دیوار کھینچ لی ماں کی ایک اور بچی پیدا ہونے پر تیرے وجود کی تلافی ہو گئی۔ اور تجھے نئے ماں باپ اور ڈاکٹر چچا کی شفقت مل گئی۔

لوگ سینکڑوں قسم کی خوشیوں سے آشنا ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی میں کئی نشیب و فراز آتے ہیں، مگر میرے اس اجڑے دیار میں خوشی کی کون بھولے

سے بھی نہیں جگمگاتی۔ اور اب اتنے سالوں کی تلاش کے بعد شکیب صاحب آپ مجھے ملے ہیں۔

آپ نے جیسے یہ دیوانی کی زبانی کہہ دیا ہو۔" رضوانہ میں تمہارا ساتھ دوں گا تم کا ہے اداس ہوتی ہو تمہیں کس کا انتظار ہے میری طرف دیکھو یہ میں ہوں، تم جب ملنا چاہو تو میری بانہیں تمہیں تھام لیں گی۔ تمہیں گرنے نہ دیں گی۔ تم مجھ پر اعتماد کرو۔"

کچھ دنوں بعد ایک کام کے سلسلے میں شکیب کو پشاور جانا پڑا۔ تو وہ اداس سی ہو گئی جیسے وہ نامعلوم مدتوں کے لئے اس شہر سے چلا گیا ہو۔

شام کو تجرباتی نفسیات کی کتاب کی تلاش میں اس نے مال روڈ کے سبھی بک سٹال چھان مارے، ایک آخری دوکان رہ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی، اگر کتاب نہ ملی تو پڑھائی کا تو ہرج ہوگا ہی مگر سر منظر بھی ڈانٹیں گے۔ ایم اے میں آکر کبھی وہ طلبا کی ذاتی کتاب دیکھنا پسند کرتے تھے۔ ایک آدھ دن کی بات ہوتی تو وہ گزارہ کر لیتی یا کسی ہم جماعت سے مستعار لے لیتی۔

مال کی اس آخری دوکان پر کتاب دیکھ کر جہاں اسے خوشی ہوئی۔ وہاں کتاب کی ڈبل قیمت سن کر اسے ذرا مایوسی ہوئی۔

"میری ضرورت اہم ہے خریدنی ہی پڑے گی۔ کتاب بغل میں اس نے یوں دبائی جیسے قیمتی متاع ہاتھ آئی ہو۔ ریگل کے چوک پر سڑک پار کی کسی نے چونکا دیا۔

"ہیلو۔۔۔"

اس نے مڑ کر دیکھا۔ سیاہ پتلون اور کریم کلر کی قمیض اور سرخ ٹائی میں محسن مسکرا رہا تھا۔

"فرمایئے مجھ سے کیا کام ہے آپ کو۔" اس نے کتاب کی مہنگائی کا غصہ اس پر اتارنا چاہا۔

"ارے بہت غصے میں ہو۔ کہیں سینڈل نہ اتار لینا۔"

"جب میں تم سے نہیں ملنا چاہتی تم کیوں پریشان کرتے ہو۔"

"تم راہ میں نظر آئی۔ تو جی نہ چاہا کہ بغیر بلائے رہوں۔"

"خاموشی ضرورت نہیں تھی۔"

"ایمان سے میں تو تمہاری خیریت دریافت کرنے کے لئے ٹھہرا تھا۔ تم پہلے سے کمزور لگتی ہو۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور کہو۔"

"دیلیپ کمار کا شکریہ لیکن ابھی میں دوسروں سے مدد لینے کی عادی نہیں ہوں۔"

"میں باذوق آدمی نہیں۔ مگر تمہیں دیکھ کر غالب کا ایک شعر یاد آ گیا۔

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے راہنما کرے کوئی"

"یہ تم اپنے بارے میں کہہ رہے ہو۔"

"اپنا تو پتہ بھی کٹ چکا میں تو آپ کے عظیم دوست ثکیب کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔"

"شکیب کا تم ذکر نہ کرو۔ وہ تم سے بلند انسان ہے۔"

"شاید اس نے میری اور دس دوستوں کا قصہ سنایا ہوگا۔"

"بہر حال تم اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش نہ کرو۔ نہ مجھے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔"

"رضو اپنی اچھائی یا برائی کے سلسلے میں کوئی تائید یا تردید نہیں کروں گا تمہارے بلند کردار شکیب صاحب کے بارے میں ضرور انکشاف کروں گا۔ تمہیں دکھ

دینے کے لیے نہیں تم پر حقیقت کھولنے کے لئے انکشاف سے تمہاری کیا مراد ہے ۔"

"میرے دوست کو شکایت ہے کہ میں نے مختلف ذوق و شوق کی کئی دوستنیں اکٹھی کر رکھی ہیں ۔

"مگر یہ بھی کوئی شرافت ہے کہ ایک حسین بیوی کے ہوتے ہوئے آدمی ایک معصوم لڑکی کو بے وقوف بنائے ۔"

"محسن تم بکواس کرتے ہو ۔"

"کل شکیب لنڈن سے واپس آ رہا ہے ۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں بیگم شکیب سے ملا دوں بار بار فریب کھانا بے وقوفی ہی تو ہے ۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے ۔ اگر میری بات کا یقین نہیں تو مجھے فون کر لینا ایک دو دن میں ۔ او کے ۔"

اچھا خدا حافظ ۔"

ہاتھ میں اس کا تعارفی کارڈ لئے وہ حیران پریشان فٹ پاتھ پہ کھڑی دیکھتی رہ گئی ۔ اور محسن بیچارہ چار صفوں کے خرمن حیات پہ جیسے وہ بجلی گرا گیا ہو ۔ فٹ پاتھ پہ چلتے چلتے اس کا دماغ جیسے چکرا سا گیا ۔ اس کا جی چاہا اسی راہ گزر پہ بیٹھ کر رونے لگ جائے جب لوگ پوچھیں تو وہ بتائے لوگ سیلابوں، طوفانوں، زلزلوں اور جنگ کی وجہ سے بے گھر ہوتے ہیں میں پہلے دن سے بے گھر بے وطن ہوں ، میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ۔

جانے کیسی کیفیت تھی جب وہ گھر آئی ۔ قدم کہیں رکھتی تھی پڑتا کہیں تھا ، غنیمت ہوا ۔ وہ صحیح سلامت گھر پہنچ گئی ۔

کیا سمجھا تھا تم بھی لٹیرے ڈاکو نکلے ، دوسرے لوگ تو قیمتی سامان زیور اور

روپے چراتے ہیں، مگر تم نے شرافت کے بھیس میں میرا خلوص ایمان اور سکون لوٹا ہے، نہیں تو میں نے ایسا نہ سمجھا تھا۔ ان چند گھنٹوں میں کیسی آندھی چلی ہے کہ سارا کچھ تباہ و برباد اور ویران ہو گیا ہے۔ تم نے مجھ سے کس جنم کا بدلا لینا تھا

شکیب مجھے جواب دو۔

دو دن وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں سوچی سوجی آنکھوں کے ساتھ منہ چھپاتی پھری۔ یہاں تک کہ ماہرِ نفسیات مس مظہر نے چپڑاسی کے ہاتھ اسے بلا بھیجا۔

"آج کل آپ کچھ پریشانی لگتی ہیں۔ میں نے خصوصاً نوٹ کیا ہے۔ اس ڈیپارٹمنٹ میں میرا خیال ہے، ہم لوگوں میں ذہنی مفاہمت کی فضا ہے اور آپ لڑکیاں اگر مناسب سمجھیں تو اپنے اساتذہ سے کچھ مشورہ بھی لے سکتی ہیں کسی قسم کی مدد درکار ہو۔ تو جو میرے امکان میں ہوا کر دوں گا۔

اور سر آپ کو ہم کیا بتائیں۔ آپ بڑے مہربان اور عظیم الشان ہیں جب کبھی آپ کی مدد کی ضرورت ہوئی ضرور کہوں گی۔ اچھا سر میں جاؤں۔

"ضرور جو سبق اور حوصلہ آپ کو یہاں حاصل ہے وہ یاد رکھئے۔"

"شام کو پانچ بجے محسن نے اسے گھر پر ٹیلی فون کیا۔

"ہاں میں بول رہی ہوں۔ آج صنعتی نمائش میں چاہو تو تمہاری ان سے ملاقات کرا دوں۔"

"میں نہیں ملوں گی۔"

اس سے فائدہ کیا کہ تمہارے دل میں یہ شک پروان چڑھے کہ میں نے شاید جھوٹ بولا ہو۔ ساڑھے پانچ بجے میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ تیار رہنا۔"

ہو جاؤں گی۔"

فون اس نے کریڈل پر رکھ دیا اور غسل خانے میں جاکر منہ ہاتھ دھونے لگی۔

ایک ہم اندر سے جلتے ہیں اور اس شہر کی گرمی ہمیں باہر سے بھی جلاتی ہے۔ یہ کیسا شہر ہے اس تاریخی شہر میں دکھ زیادہ ہیں۔

کتنے پرانے دکھوں کے ساتھ اور نئے دکھوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔

ٹھنڈے پانی نے کچھ فرحت اور تازگی بخشی۔ رہ رہ کر دل میں شعلے سے بھڑک اٹھتے اب اس سے حاصل ہی کیا جو بات ہم بدل نہیں سکتے تو اسے اسی حالت میں قبول کرنا ہوگا۔ روتے دھونے چیخنے چلانے کا کیا حاصل۔

ساڑھے پانچ بجے رحمن نے دروازے پہ دستک دی۔

"یہ آخری موقعہ ہے کہ ہم ایک جگہ کہیں جا رہے ہیں آج کے بعد میں تمہیں نہیں بلاؤں گا۔ راستوں میں بھی نہیں تم مطمئن رہو۔"

پاکستانی مصنوعات کی یہ نمائش کوئی ایسی عظیم نمائش نہ تھی۔ کھانے پینے کے سٹالوں پر خوب رونق تھی اور بچے جھولے کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ سبز سرخ نیلی پیلی تاریخی ہر قسم کی روشنیاں مختلف سٹالوں سے اندر پڑتی تھیں۔

محسن نے دو ٹکٹ خریدے اور وہ نمائش گاہ میں داخل ہوئے۔ جھولے پر بیٹھنا ہے یا غبارہ لینا ہے۔

وہ اسے جان بوجھ کر ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "نہیں بے" یہ غصے کا نہیں اپنی شکست خوردگی کا احساس تھا۔

ٹیگیر کہتا ہے۔ یہ دنیا دیکھنے والوں کے لئے جنت اور محسوس کرنے والوں

کے لئے دوزخ ہے تم دنیا کو دیکھنے نہیں محسوس کرنے لگی ہو صرف دیکھنے پر اکتفا کیا ہوتا تو اچھا تھا۔

اب بھی کوئی جواب نہ تھا۔

سامنے سے روشنیوں کے جلوس میں سبز دھانی ساڑھی میں ملبوس ایک حسین مہ جبیں ڈھائی تین سال بچے کا ہاتھ پکڑے چلی آرہی تھی۔ اور اس کے ساتھ شکیب بھی تھا۔ دونوں بڑے آرام سے کسی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ سبز ساڑھی والی خاتون کا چہرہ یوں لگتا تھا مکھن اور گلابوں میں نہایا ہو۔

"ہیلو مسز شکیب ان سے ملو۔"

"مس رضوانہ۔ مشہور آرٹسٹ۔ رائٹر۔"

"اور رضو یہ بیگم شبینہ شکیب۔"

یہ تعارف ایک جملے کی طرح تھا۔ اس بات اور موقع کے لئے دو دن سے رضو خود کو تیار کر سکی تھی۔

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر مجھے تو آپ سے ملنے کا یوں بھی اشتیاق تھا۔"

"شبینہ شبینہ۔ رضو کے کانوں میں جیسے آندھیاں چلنے لگیں۔ اعصاب پر آگ سی برسی۔ اس نے گرمجوشی سے رضو کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اور کہہ رہی تھی۔

"شکیب وہ تصویر جو چھ ماہ ہوئے آپ نے خریدی تھی وہ انہی کی بنائی ہوئی تھی۔

"ہاں مجھے یاد ہے۔" شکیب نے کہا۔

مگر آج جو کچھ ہوا اس کے بارے میں تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کی بیوی کا یوں رضو سے سامنا ہو جائے گا۔ مگر یہ بات چھپتی کب تک۔ یہ اتفاق

ہے یاسمن نے جان بوجھکر یہ موقع پیدا کیا۔ شکیب سوچنے لگا۔

"اگلے ہفتے ہمارے منے یاسر کی سالگرہ میں آپ کو بھی دعوت ہے آئیں گی نا۔"

چینی کے باوے جیسا گڈّا کبھی اپنی ماں کی طرف دیکھتا کبھی رضوانہ کی شکل دیکھتا۔

ثبیتہ کے والد کراچی کے مشہور بزنس ایڈمنسٹریٹر ہیں جہانگیر قدرے۔ محسن نے اضافہ کیا۔

"یہ نام تو پہلے بھی کہیں سنا ہے۔" رضو کو جیسے یاد آیا۔

میرے ابو کو کافی لوگ جانتے ہیں۔"

ثبیتہ ہنس کی طرح گردن اٹھا کر ناز سے بولی۔

"آپ کے والد کیا کرتے ہیں۔" ثبیتہ نے تجسس سے کہا۔

"وہ تو کبھی کے فوت ہو چکے ہیں۔"

"اور کوئی بہن بھائی تو ہو گا۔"

"نہیں اب کوئی دنیا میں نہیں رہا۔"

سارا وقت ثبیتہ رضو سے باتیں کرتی رہی۔ شکیب کو کچھ کہنے کا موقع نہ مل سکا۔

"اچھا اب اجازت دیجیے۔"

رضوانہ نے کہا "دیکھیے ہمارے بیٹے کی پارٹی پر آنا نہ بھولیے مجھے انتظار رہے گا۔"

"خدا حافظ۔" محسن کو رضوانہ نے نمائش کے گیٹ پر الوداع کہا اور اکیلی گھر چلی آئی۔

یہ گھر میرا ہے میری یہاں کیا چیز ہے۔"

اپنی شکست اور بے وقعتی کا احساس تھا یا کوئی اور بات کہ اس نے اپنی ایک ایک پینٹنگ جس پر کئی کئی ہفتوں کی محنت صرف ہوئی تھی اس نے دیواروں سے نوچ کر پھاڑ دی۔ جلا دی۔ اندر گرمی تھی اور باہر آگ کے شعلوں کی حرارت

اور کچھ دیر دل کی بستی سے دھواں اٹھے گا
اور کچھ دیر ہواؤں سے لہو برسے گا

جب سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا تو وہ سر سے لیکر پاؤں تک پسینے میں نہا چکی تھی۔ راکھ جب سرد ہو گئی تو اس نے اپنی ہتھیلی پر ایک چٹکی راکھ ڈالی۔ یہ بڑی قیمتی راکھ ہے۔ شیبنہ مگر تو کتنی پاگل ہے۔ تو نے مجھے نہیں پہنچانا۔ مگر میں نے تجھے پہچان لیا ہے۔

کافی دنوں تک رضوانہ کے دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت رہی وہ کرتی کچھ تھی یوں جیسے ذہن بھی باغی ہو گیا ہو۔ صنعتی نمائش میں جس ڈرامائی انداز سے محسن نے بیگم شبینہ شکیب سے ملاقات کرائی تھی وہ ایک بھیانک خواب سا لگتا تھا۔ مگر محسن جیسے بہت قریب آ کر سرگوشی کرتا۔

"رضوانہ تم نے پہلے ہی بڑے فریب کھائے ہیں اب چمکتی چیزوں کے فریب میں نہ آنا میری توجہ سات دوست ہیں مگر تمہارے شکیب صاحب ایک عدد حسین مہ جبین بیوی رکھتے ہوئے ایک معصوم لڑکی کو بے وقوف بنا رہے ہیں کیا یہ زیادتی نہیں۔"

اس شام ذہن میں اٹھتی ہوئی آوازوں کے مسلسل شور سے تھک کر وہ چلا پڑی۔ بس اور کچھ نہ کہا جائے، بیل پھلتی ہے تو کانٹوں کو چھپا لیتی ہے۔ مگر زندگی پریشان ہو تو وہ پریشان ہی کیوں رہتی ہے۔ خوشی کی ایک رنگ رنگیلی تتلی میں نے اپنے ہاتھوں میں قید کی تھی۔ مگر اس کے پروں کے رنگ بکھر چکے ہیں اور تتلی فضا کے گھاٹ اتر گئی۔ اب چاروں

طرف، جانے کب تک تاریکی کی باہیں دراز رہیں گی، کیا اب کوئی کرن
ان تاریکیوں کے دامن سے نہ پھوٹے گی۔

مایوسی گناہ ہے مگر امید کس کافر کو ہے، یہ تو خیال کے گلشن تھے
جہاں چند لمحے گھوم لیا۔ ورنہ باقی عمر تو صحراؤں کی جلتی چھاؤں میں جلنا
ہے۔ بھلا مجھے کسی سے کیا گلہ ہو سکتا ہے جلدی میں شاید میں نے زندگی
کا نقشہ غلط بنا لیا۔ خرابی کہیں تو ہے۔

ایک ہفتہ شدید ذہنی کرب میں گزرا۔ جیسے نجات کا ہر دروازہ بند
ہو چکا ہو یہ شام کیسے گزرے گی۔ رضوانہ کو سوچنا پڑا۔ اور وہاں شبینہ
ندر، تمہاری زندگی کتنی پرسکون اور آسودہ ہے مگر تم سے مل کر جو عذاب
مجھے ملا ہے خدا تمہیں اس سے محفوظ رکھے تم سکھی رہو مسکراؤ۔ حادثے
اور المیے میری زندگی کا آغاز بھی تھے اور انجام بھی ہوں شاید ــــ تم
شیشے کے گھر سے نکل کر سنگ مرمر کے شوکیس میں آگئی ہو۔ مگر میں
جہاں ہوں۔ وہاں پر فقط طوفان اور زلزلے آتے بجلیاں گرتی اور شہاب
ثاقب کا شور برپا رہتا ہے یہاں پہلے بھی اضطراب تھا۔ اب بھی
سکون نہیں۔

اگلے دن شام کو وہ ماہانہ ٹسٹ کے لئے تیاری کر رہی تھی کہ دروازے
پر دستک ہوئی۔

اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ مگر پیچھے کو ہٹ گئی۔

"قیمتی لباس اور خوشبوؤں کا احساس لئے وہاں تو بیگم شکیب تھی۔

"آپ یہاں ــــ"

مجھے دیکھ کر آپ کو ضرور حیرت ہوگی، مگر ڈھونڈ ہی لیتے ہیں ڈھونڈنے

والے وہ شوخی سے ہنسی۔

"اندر آجائیے۔" رضوانہ نے اس کے لئے دروازہ کھول دیا۔
اس نے کوشش کی ہونٹوں پر کھلی کلیوں کا جواب مسکرا کر دے مگر آنسو جیسے حلق میں گلیشئر بن کر پھنس گئے۔ اس کے اندر والی نے چلا کر کہا۔
شبینہ شکیب آپ کو گلاب کھلی مل گئے۔ اور تارے بھی آپ نے جھکتا گلشن پایا ہے۔ مگر میں صدیوں سے ویران صحراؤں اور جنگلوں میں ایک آوارہ روح کی طرح بھٹکتی پھر رہی ہوں۔ میں نے برسوں کی صحرا نوردی کے بعد ایک ہیرا دیکھا تھا۔ مگر وہ چمکتا شیشہ نکلا شیشے کی چمک نے میری آنکھیں چندھیا دیں۔ مگر میرے ہاتھ زخمی کر دیئے۔ میں رستے لہو اور زخمی ہاتھوں کا مداوا کس سے مانگوں تم جو کسی الم سے آشنا نہیں ہو۔ مگر نہیں ہم دونوں دو مختلف دنیا میں رہتی ہیں۔ ہمارے راستے اور منزلیں جدا ہیں۔ ہم دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ للہ آپ چلی جائیں۔ آپ کے یہاں ٹھہرنے سے میرے گھر کی ویرانی اور بڑھ جائے گی۔ میری وحشت میں اور اضافہ ہو جائے گا۔"
"آپ چائے لیں گی یا کوئی ٹھنڈی چیز۔" رضو نے بڑی آہستگی سے کہا۔ یوں جیسے اپنے باغی دل کو سمجھا رہی ہو۔
"نہیں آپ کوئی تکلف نہ کیجئے میں تو اپنے منے کی سالگرہ پارٹی میں آپ کو لینے آئی ہوں۔ جلدی سے تیار ہو جائیں۔" میں یہاں بیٹھی ہوں۔
"شبینہ میں نہیں جا سکوں گی۔ کل میرے دو ٹسٹ ہیں ان کی تیاری کرنی ہے۔ مجبور ہوں مجبور۔"
آپ کہہ دیں ساری زندگی زندگی ایک مجبوری ہے میں تسلیم کر لوں گی۔

مگر آج ساتھ لے کر جاؤں گی میرے یہاں آنے کا تو آپ کو کچھ تو خیال کرنا پڑے گا، چھیئے میں آپ کی پسند کے کپڑے نکالتی ہوں۔"

نہیں میرے پاس زیادہ انتخاب نہیں مجھے معلوم ہے میں کیا پہنوں گی

شبیتہ ایک رسالے کی ورق گردانی کرتی رہی اور دوسرے کمرے میں رضو کپڑے تبدیل کر رہی تھی۔ میٹل پیس پر ڈاکٹر جیا کی مسکراتی ہوئی تصویر رکھی تھی، اس کی پلکوں پہ اشک جھل رہے تھے، آج پھر کسی نے تمہیں مجبور کر دیا۔

بھلا تمہارا شبیتہ شکیب یا یاسر سے کیا تعلق — وہ تمہارے کیا لگتے ہیں۔ تمہارا ان سے کوئی رشتہ نہیں اور یہ جو بیگم شکیب تمہیں ساتھ لینے آئی ہے۔ اس لئے نہیں — اس کے دل میں تمہارے لئے محبت جاگ اٹھی ہے۔ یہ اس لئے آئی ہے۔ تاکہ اپنے بیٹے کی سالگرہ پارٹی میں آنے والے مہمانوں سے فخریہ تعارف کرا کر بتائے کہ رضوانہ جہاں ایک آرٹسٹ ہے ہماری مہمان ہے۔

وہ تیار ہو کر باہر آئی۔ تو شبیتہ بولی۔

"اپنا گھر نہیں دکھائیں گی مجھے —؟"

"ضرور —"

"پانچ منٹ میں ہی پورے گھر کی سیاحت ہو گئی۔

اماں برآمدے کے ایک کونے میں اونگھ رہی تھیں۔

"آپ یہاں اکیلی گھبراتی نہیں۔"

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں مجھے فرصت کم ہی ملتی ہے دن میں کالج شام کو کچھ گھر کا کام باغبانی شب کو کچھ لکھنے پڑھنے کا کام اکیلے پن

کا کچھ زیادہ احساس نہیں ہوتا۔"

"میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔ شکیب کار میں ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ یوں بھی ہم عورتوں پر دیر سے تیار ہونے کا الزام ہے۔"

بنگلے کے گیٹ سے کچھ دور فیروزی کار میں شکیب ان کا منتظر تھا۔

"آداب۔" ہمیشہ کی طرح آج بھی بڑے نفیس کپڑوں میں ملبوس تھا۔

دونوں خواتین پچھلی سیٹ پر بیٹھیں تو اس نے کار سٹارٹ کی۔

"لیجیے شرط آپ ہار گئے۔ آپ کہتے تھے رضوانہ نہیں آئے گی اور میں انہیں لے آئی ہوں۔"

"بڑی ہمت ہے آپ کی۔" شکیب نے اپنی بیوی کو داد دی۔ پر رضو کے لبوں پر نیلم کے پتوں کی کڑواہٹ گھلی تھی۔ کتنی بزدل ہے چپ چاپ بے جان گڑیا کی طرح چلی آئی۔ اور یہ شخص جو کار ڈرائیو کر رہا ہے، اس نے کتنے عرصے تک اسے بیوقوف بنایا۔ کچھ نہ بنایا۔ آفرین ہے رضو تم ثابت قدم رہی ہو۔ کوئی اور ہوتا تو جانے کیا ہو جاتا۔ مگر حادثوں نے تمہارے دل و ذہن کی صلاحیتوں کو جلا بخشی ہے۔ تم میں حادثے اور صدمے برداشت کرنے کی قوت پیدا ہو گئی ہے آپ کو کونسا حادثہ نہیں دکھ دے گا۔"

"چلیے صاحب۔"

شکیب نے کار سے اتر کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔

پہلے ثمینہ اور پھر رضوانہ باہر نکلی۔ "شکریہ۔" وہ بغیر نگاہیں اٹھائے بولی۔

پوری کوٹھی پھولوں اور روشنیوں سے سجی ہوئی تھی جیسے کوئی بہت بڑی تقریب ہو۔

رضوانہ یوں چل رہی تھی جیسے خوابوں میں چل رہی ہو۔ اس کا اب بھی جی چاہتا تھا واپس لوٹ جائے پھر شبینہ کے بے شمار مہمانوں سے ملنا پڑے گا۔

ڈرائینگ روم تک پہنچے۔ تو شبینہ دفعتاً گر ایک بھاری بھرکم ساڑھی میں ملبوس خاتون کے گلے لگ گئی۔

"امی کب آئیں۔" خاتون کے چہرے پر بڑی زندہ دلی کی مسکراہٹ تھی پچاس پچپن سال کی اس عمر میں بھی وہ بڑی حسین عورت تھی۔

"میں چار بجے کی فلائٹ سے آئی تھی، ہوٹل میں سامان رکھنے کے بعد پانچ بجے یہاں آئی تو پتہ چلا تم اپنی سہیلی کو لینے گئی ہو۔"

"اسے ہاں امی آپ کو رضوانہ سے ملا دوں۔"

وہ دروازے سے داخل ہوئی تو تعارف کا سلسلہ چل نکلا۔

"یہ بہت اچھی آرٹسٹ اور رائٹر بھی ہیں۔ ایم اے کر رہی ہیں۔"

"بہت خوشی ہوئی رضوانہ تم سے مل کر۔"

امی کے بعد دوسری خواتین سے شبینہ نے انکا تعارف کرایا۔

چھ بجے شکیب کے دو تین دوستوں اور شبینہ کی چند سہیلیوں اور ان کے بچوں کی موجودگی میں کیک کاٹا گیا۔ بچوں نے تالیاں بجائیں۔ سالگرہ مبارک کا روایتی گیت گایا۔

چائے کے ساتھ بے شمار مٹھائیاں اور نمکین چیزیں تھیں۔ شبینہ ہر ایک کو چائے اور کھانے کی چیزیں پیش کر رہی تھی۔ شکیب نے اپنے اکلوتے بیٹے کی سالگرہ میں دل کھول کر پیسہ خرچ کیا تھا۔

سالگرہ پارٹی میں آنے کا رضو کا کوئی ارادہ نہ تھا مگر اب شبینہ اسے

بکڑ ہی لائی تھی تو اس نے ایک لفافے میں کچھ نوٹ ڈال کر اسے یاسر کو تھما دیا۔

"جلدی میں تمہارے لئے تحفہ نہیں لا سکی، تم اپنی پسند کا کھلونا لے لینا ٹھیک ہے شاباش۔"

یاسر نے تو لفافہ لے لیا، مگر ثبینہ نے کہا۔

"نہیں بھئی یہ زیادتی ہے۔"

"تمہیں تو نہیں دے رہی یاسر کے تحفے کے لئے ہے۔"

"اچھا بڑی ضدی لگتی ہو۔" ثبینہ نے بات ٹالی۔

بیگم جہانگیر فذر جو اپنے نواسے کی سالگرہ میں شرکت کے لئے خصوصاً کراچی سے آئی، اور انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں ٹھہری تھیں جب ان کے تحفے دینے کی باری آئی تو بولیں۔

"بیٹی میں بھی جلدی میں آگئی تھی یہ نیلا اٹہ مجھے عین وقت پر ملی تھی، اس لئے تحفے تو کراچی سے میں کوئی نہیں لائی۔ یہ کہہ کر انہوں نے ہزار روپے کے نوٹ ثبینہ کو تھما دیئے۔

"نہیں امی یہ زیادتی ہے میں اتنے پیسے نہیں لوں گی، یاسر چھوٹا سا بچہ ہے۔"

تھوڑی سی بحث کے بعد ثبینہ کو وہ پیسے رکھنے پڑے۔

پارٹی کے بعد سب تھوڑی دیر کے لئے بیٹھے تو بیگم جہانگیر فذر اس کے قریب آگئیں۔

"کیا بات ہے تم سب سے الگ بیٹھی ہو۔"

"ایسی کوئی خاص بات تو نہیں آپ کیسے بیٹھے۔" وہ صوفے پر تھوڑی

کسی کھٹک کر بولی۔

"رضوانہ تمہارے والد کیا کرتے ہیں۔"

"ان کی وفات کو تو پندرہ سولہ سال ہو چکے ہیں۔ یوں بھی وہ کسی اونچے عہدے پر فائز نہ تھے کسی فیکٹری میں مزدور تھے مگر بہت اچھے انسان تھے۔"

"تمہاری امی تو زندہ ہوں گی۔"

"نہیں انہیں فوت ہوئے بھی تقریباً دس سال ہو چکے ہیں، مگر وہ ایک محبت کرنے والی مثالی ماں تھی۔"

"اب تم کس کے پاس رہتی ہو۔"

"امی کی موت کے بعد ڈاکٹر آذر سول ہسپتال کے ڈاکٹر نے مجھے اپنی منہ بولی بیٹی بنا رکھا تھا۔ پچھلے کئی ماہ ہوئے انہیں پھیپھڑوں کی کینسر کے علاج کے سلسلے میں ہسپتال والوں نے لندن بھیج دیا ہے، وہاں سے نواب تک کوئی اطلاع نہیں آئی۔

اب میں اکیلی رہتی ہوں۔"

"تم تنہائی سے گھبراتی نہیں۔"

"شروع میں ہر بات سے دل گھبراتا ہے بعد میں عادت ہو جاتی ہے یوں بھی باغبانی اور پینٹنگ میرے پسندیدہ مشغلے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ شادی سے پہلے مجھے بھی پینٹنگ کا شوق تھا مگر میرا شوق اپنے گھر اور ڈرائنگ روم کی دیواروں تک محدود رہا، کئی پورٹریٹ میں نے بنائے۔"

کبھی موقع ملا تو میں آپ کی پینٹنگ ضرور دیکھوں گی۔"

"ایک تو شبینہ کے بیڈروم میں اب بھی موجود ہے میری دو تصویریں ہیں اس نے زبردستی اپنے جہیز میں شامل کر لیں۔ شبینہ نے الیف ایس سی پاس کیا تو ہم نے اس کی شادی کر دی۔ تمہیں شاید شکیب سے ملنے کا موقع نہیں ملا۔ بہت مودب اور ذہین شخص ہے۔ مجھے خوشی ہے۔ دونوں اپنی گھریلو زندگی میں خوش اور مطمئن ہیں۔ والدین کی یہی دلی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے خوش رہیں اور اب جب کہ میری زندگی کی بہت سی خواہشوں کی تکمیل ہو چکی ہے خوش ہوں۔

شبینہ کو پتہ نہیں مگر پچھلے ایک سال سے مجھے دل کی تکلیف ہو گئی ہے۔ صرف میرے شوہر کو اس خبر ہے۔ میں اپنی بیٹی کو خبر سنا کر کیوں اداس کروں۔ ابھی تو اس کی عمر اکیس ۲۱ سال کی ہے۔ کراچی آئی ہے تو بچوں کی طرح ضد اور شوخیاں کرتی ہے۔ مگر جب اپنے شوہر کے ساتھ ہو تو بڑی ذمہ دار خاتون بن جاتی ہے میں دیکھتی ہوں اس نے یا سر کی بہت اچھی تربیت کی ہے۔"

"کیا آپ کی صرف ایک ہی بیٹی ہے۔"

زرنور نے جانتے بوجھتے سوال کیا۔

زندگی میں بہت کچھ مل جاتا ہے مگر پھر بھی کسی نہ کسی چیز کی کمی عمر بھر ایک خلش بن کر دل میں رہتی ہے۔ میری طرح جہانگیر کو بھی شوق تھا کہ ہمارے یہاں کوئی بیٹا ہوتا۔ مگر شبینہ عمر بھر اکیلی رہی۔

کیا تم بھی اپنے والدین کی تنہا اولاد تھی۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ میری ماں کے یہاں شادی کے پندرہ سال بعد ایک مردہ بچہ ہوا اور اس کے بعد مزید کسی بچے کی پیدائش کا امکان نہ تھا۔

مجھے انہوں نے اس وقت گود لیا۔ جب میں صرف ایک دن کی تھی بعد میں مجھے پتہ چلا کہ میرے والدین بہت مشہور اور دولت مند لوگ تھے ۔"

"کیا یہ سچ ہے؟" بیگم جہانگیر حیرت سے بولیں۔

"ہو سکتا ہے مگر میں اسے جادو پریوں کی کہانیوں کا حصہ سمجھتی ہوں اگر یہ سچ تھا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے اب تو تیس سال ہو چکے اس بات کو۔"

"کوئی صورت تو ہوگی کہ تم اپنے والدین کو پہچان لو۔"

"میں جان جاؤں گی مگر پہچانوں گی نہیں۔"

"یہ بڑی بات عجیب بتائی ہے تم نے رضوانہ۔ مجھے تمہاری زندگی سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔"

بیگم نے تجسس سے کہا۔

"بات یہ تھی میرا باپ حسن کے بارے میں خاص نظریہ رکھتا تھا وہ اپنے گردو نواح بدصورتی برداشت نہیں کر سکتا تھا اس کی بیوی بھی بے انتہا حسین تھی، بدقسمتی سے جب اس کی بیوی کے یہاں ایک صحت مند مگر بدصورت بچی نے جنم لیا تو اس نے بچی کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ کہ یہ بچی میری بیوی کے کردار کے لئے چیلنج ہے۔ اگرچہ اس آدمی کو اعتماد تھا کہ اس کی بیوی پارسا ہے مگر یہ ڈھونگ اس نے اپنے ذوق جمال کی حسن کی تسکین کے لئے رچایا۔"

"پھر کیا ہوا۔"

"آپ چاہیں تو اسے میرے ہی کسی افسانے کا کردار سمجھ لیں مگر کئی دفعہ حقیقت افسانے سے زیادہ دلچسپ اور رنگین ہوتی ہے۔ فرض کیجئے بیگم جہانگیر اگر آپ کے یہاں کوئی بچی پیدا ہوتی ہے جو آپ کی یا آپ کے شوہر کی صورت کے متضاد ہے تو کیا آپ اسے پھینک دیں گے۔"

"ہرگز نہ کھینکتی وہ میری بچی ہوتی میری اپنی چاہے اس کی صورت کیسی ہوتی۔ آپ عورت ہو کر ایسا نہ کرتیں۔ مگر میرے باپ نے ایسا کیا، اسلئے کہ وہ مرد تھا۔ یہ رشتہ اس کے ذوق جمال کے سامنے ہیچ تھا۔"

معلوم ہوتا ہے بڑی دلچسپ گفتگو ہو رہی ہے۔"

ثمینہ ایک صوفے پر بیٹھ کر بولی۔

"دس بج رہے ہیں میں اب اجازت چاہوں گی۔"

رضوانہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"شکیب تو اپنے دوستوں میں مصروف ہو گئے ہیں پتہ کرتی ہوں ڈرائیور، اگر مل جائے۔"

دو منٹ بعد ثمینہ واپس آگئی۔

"تمہاری خوش قسمتی ڈرائیور مل گیا۔"

"اچھا بیگم جہانگیر میں اجازت چاہوں گی مجھے امید ہے ہماری گفتگو خاصی دلچسپ رہی۔"

"میں تو چاہتی تھی یہ سلسلہ کچھ اور دراز ہوتا مگر خیر کبھی کراچی آنے کا موقع ملا تو میرے یہاں ٹھہرنا۔ ثمینہ سے میرا پتہ لے لینا۔"

"ضرور کوشش کروں گی۔"

رضوانہ نے الوداعی سلام کیا اور باہر آگئی۔

ڈرائیور نے اسے گھر چھوڑا۔ مگر اب اپنے کمرے میں آئی تو چاروں طرف ویرانیاں بکھری تھیں۔

"وہاں بڑھاپے میں بھی چہرے پر شادابیاں اور طبیعت میں زندہ دلی ہے اور یہاں اس عمر میں بھی ویرانیاں ہیں۔"

گو اب چاروں طرف تاریکیوں کی بانہیں دراز ہیں کوئی ہمدم کوئی دوست نہیں رہا۔ مگر میں پھر بھی زندہ رہوں گی۔ کسی ایسے شخص کے لیے جسے میری مدد کی ضرورت ہو جو اپاہج ہو، ناکارہ ہو۔ معاشرے کا ٹھکرایا ہو۔ اب تک میں سہارا ڈھونڈتی رہی اور ناکام رہی۔ مگر یہ ناکامی کہاں ہے۔ یہ تو ایک سیکھنے کا جاری و ساری عمل ہے اور میں نے کچھ سیکھا۔ مگر اب میں سہارا بنوں گی، شاید اس طرح میں اپنے وجود کے ادھورے پن کی تکمیل کر سکوں

اب میرا راستہ پچھلے راستوں سے قطعی مختلف ہوگا۔

کلینیکل سائیکالوجی کے پروفیسر عرفان نے ایم اے کے پہلے سال کے امتحان کے بعد فائنل ایئر کے طلبا کو کلینیکل ورک کے سلسلے میں ہفتے بھر کی چھٹیاں دے دیں۔ کوئی کلاس نہیں ہوگی۔ تمام طلبا ٹسٹوں کے بعد اپنی اپنی نوٹ بک مکمل کرلیں۔

اپنے ڈیپارٹمنٹ کے دوسرے طلبا کے ساتھ وہ بھی نوٹ لکھنے کے لئے اور پریکٹیکل مکمل کرنے کے لئے مینٹل ہسپتال گئی۔ ہر طالب علم کو ایک ایک ذہنی مریض کی ضرورت تھی۔

نفسیاتی ٹسٹ چھ مختلف ٹسٹوں پر مشتمل تھا۔ ہر طالب علم اپنے مریض کے ساتھ کام کررہا تھا۔ لائبریری یا باغ یا بڑے درخت کے نیچے جہاں جہاں کسی کو آسانی تھی۔ وہ وہیں بیٹھ گئے۔ پہلے دن اپنے مریض کی گفتگو نوٹ کرنے کے بعد اگلے دن وہ اپنے مریض شاہد کو ڈھونڈ رہی تھی کہ اس کے گائیڈ نے انکشاف کیا۔ اسے تو آج یہاں سے چھٹی دے دی گئی ہے وہ تو سیدھا اپنے بستر پر لیٹا ہوگا یا باغ کے کسی گوشے میں پڑا ہوگا۔ بہتر ہے آج آپ

کوئی اور مریض لے لیں۔

"تمہیں پتہ ہے سارے ٹسٹ صرف ایک ہی مریض پر استعمال کرنے کی ہدایت ہے۔"

"چلیئے آپ شروع سے نئے مریض پر ٹسٹ کریں۔"

وارڈن ایک نوجوان کو پکڑ لایا۔ لائبریری کے ایک بینچ پر وہ دونوں بیٹھ گئے۔

کیس ہسٹری میں اس نے اس نوجوان کی عمر گھر پتہ تعلیم وغیرہ کے بارے میں لکھا۔ رشید شیخو پورے کا رہنے والا زمیندار لڑکا تھا۔ الف اے تک اس کی تعلیم تھی۔ وہاں وہ ایک سکول میں پڑھاتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کے ساتھ وحشت سی تھی۔

رضو نے سوال نمبر ۲۵ پوچھا۔ اپنی زندگی کا کوئی خوفناک تجربہ بتاؤ۔

"اس پاگل خانہ میں آنا پہلا واقعہ مگر یہاں آکر بجلی کا جھٹکہ میری زندگی کا خوفناک ترین تجربہ ہے۔ اے محترمہ تمہیں یہ بجلی کا جھٹکہ ہر تیسرے دن لگے تو تم اچھی خاصی سے مکمل دیوانی ہو جاؤ گی۔"

کبھی کبھی وہ الٹی سیدھی باتیں کرتا۔ مگر اکثر وہ تعاون کرنے پر آمادہ نظر آتا۔ ذہنی مریض کی توجہ کی وسعت کی کمی کی وجہ سے اس سے آدھ گھنٹہ تک کام کرانا ہی معرکے سے کم نہ تھا۔ اسی لئے دو لسٹ تو اس نے دو دن میں مکمل کیئے۔ وہ خوش تھی کام جلدی ختم ہو جائے گا۔ مگر تیسرے دن رشید نے دس بجے ہسپتال کی لائبریری میں ملنے کے لئے کہا تھا۔

مگر سوا دس تک اس کا کچھ پتہ نہ تھا۔

وارڈن سے رضوانہ نے استفسار کیا۔

"جی آج تو اس مریض کو بجلی کا جھٹکہ دیا گیا ہے وہ آپ کے ساتھ کام کرنے کے قابل نہیں ہوگا۔"

رضو کی کلاس فیلو لڑکیاں اور لڑکے اپنے اپنے مریضوں کے ساتھ ٹسٹ مکمل کر رہے تھے رضو لائبریری سے باہر نکلی تو برآمدے میں ہی اس نے رشید کو پہچان لیا، مگر وہ بے نیازی سے گزر گیا۔ اسے بلانا تو خطرے سے خالی نہ تھا، اسکے بدن کے کپڑے تار تار آنکھیں لال انگارہ۔ بال مٹی میں لتھڑے ہوئے وہ گرمی دھوپ میں ننگے پاؤں گراؤنڈ میں دوڑ رہا تھا۔

رضوانہ نے مجبوراً پھر وارڈن کی طرف رجوع کیا۔

"خدا کے لئے مجھے ایسا مریض دیجئے جس کا علاج بجلی کے جھٹکے سے نہ کیا جاتا ہو۔"

"اجی یہاں تو سارے مریضوں کو ہفتے میں ایک دو دفعہ بجلی کے جھٹکے دیئے جاتے ہیں، مرتی ہوئی روٹی اور دال دی جاتی ہے۔ بھلا یوں بھی کبھی مریض ٹھیک ہوتے ہیں، ہاں آپ ایسے کریں کہ یورپین وارڈ میں چلی جائیں وہاں کے مریضوں کا نہ تو بجلی سے علاج کیا جاتا ہے۔ نہ ہی وہ ایسے شدید قسم کے کیس ہوتے ہیں، کافی پڑھے لکھے مریض آپ کو مل جائیں گے جو آپ کا انگریزی میں لکھا سوالنامہ خود ہی پڑھ لیں گے۔"

عظمیٰ جو دیر سے وارڈن اور رضو کی گفتگو سن رہی تھی۔ قریب آکر بولی۔

"میرا بھی تمہارے جیسا مسئلہ ہے کیوں نہ ہم دونوں یورپین سیکشن کے مریض بنالیں۔" اپنی ہم جماعت کے ساتھ وہ یورپین وارڈ میں آئی۔ یہاں کا وارڈن سمجھدار آدمی لگتا تھا۔

وارڈن کے سامنے اس نے دستِ سوال پھیلا یا۔ "ہمیں دو مریض چاہئیں۔"

عظمیٰ تو چپ رہی مگر رضو یہ کہتے ہوئے یوں شرمندہ سی ہنسی جیسے دکاندار سے سبزی کا بھاؤ کر رہی ہو۔"

"مریض بہت آ بیٹے؟" وارڈن انہیں لے چلا۔

دونوں لڑکیوں نے قدم بڑھایا۔

اوائل جولائی کے دنوں میں یہاں آموں کے پیڑوں پر ڈھیروں آم لگے ہوئے تھے، شاخوں پر بلبلوں اور طوطوں کا شور تھا، دوزنگ گھاس کا سبزہ قالین بچھا ہوا نکھار گیا۔ یوں بین تلے گلاب کھلے ہوئے تھے خنک سی ہوا نے رضوانہ کی پیشانی کا پسینہ خشک کر دیا۔

"کیسی پُر فضا جگہ ہے۔" عظمیٰ نے مذاق کیا۔

"تم فضا کے بارے میں سوچو اور مجھے فکر ہے اگر یہ مریض بھی ہوش و خرد سے بیگانہ ہوا تو کلینیکل ٹسٹ کی لوزٹ بک ادھوری رہ جائے گی۔ اور پریکٹیکل کے ساتھ (زبانی ٹسٹ) میں فیل سمجھو۔"

"اللہ کرے آپ کا جو مریض ملے وہ اتنا ہوش میں ہو کہ ہمارا کام کر سکے۔ ہمیں اور کچھ نہیں چاہیئے۔"

عظمیٰ نے خلوص دل سے دعا مانگی۔

رضوانہ کے لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "کیا زندگی میں اتنا ہی کافی ہے کہ ایک ہوشمند دیوانہ مل جائے جو ہمارے گنے چنے سوالوں کا جواب دے سکے۔ اور ان جوابوں کی روشنی میں ہم یہ فیصلہ کر سکیں کہ مریض فلاں فلاں مرض کا شکار ہے۔"

"بڑی مسکرا رہی ہو۔" عظمیٰ نے استفسار کیا۔

"یونہی کبھی کبھی ہنسی آ جاتی ہے۔"

"تمہیں سمجھنا کوئی آسان کام ہے تمہیں تو بڑی بڑی باتیں متاثر نہیں کرسکیں"
"عظمی یہ اپنے اپنے ماحول کی بات ہے آدمی جب بڑے بڑے حادثوں سے دو چار ہو لیتا ہے تو اس کی پیشانی پر کبھی نہ مٹنے والی لکیریں پڑ جاتی ہیں، تب چھوٹے چھوٹے حادثے اور دکھ کوئی تکلیف نہیں دیتے۔ شاید یہ بھی بے حسی کی کوئی منزل ہو۔ مگر دنیا میں ایسے ہی ہوتا ہے۔"
"تمہیں تو فلاسفی میں داخلہ لینا چاہیے تھا۔"
وارڈن برآمدے میں جھکی ہوئی جنگلی گلاب کی بیلوں کے پاس کھڑا آواز دے رہا تھا،
"شریف۔ او شریف۔"
"کیا آپ ہر لڑکی کو بلا رہے ہیں۔" عظمی تجسس سے بولی۔
"نہیں جی یہ نوڈ ہیر کا لڑکا ہے۔"
میلے کچیلے کپڑوں میں چالیس سال کا آدمی کمرے سے باہر نکلا۔ اس کے ساتھ ہی ایک نوجوان کمرے سے باہر آیا۔
بے حد خوبصورت نقوش گورے چٹے رنگ کا فراخ پیشانی مسورع میں ڈوبی آنکھوں والے اٹھائیس انتیس سال کے اس نوجوان نے سفید قمیص اور سیاہ پتلون پہن رکھی تھی۔ اس نے کوئی سوال نہ کیا، کچھ نہ پوچھا۔
وارڈن آگے بڑھا "زبیر یہ دو لڑکیاں تم سے کچھ سوال پوچھنا چاہتی ہیں"
اس نے سوالیہ نظروں سے رضوانہ اور مسز عظمی کی طرف دیکھا۔
رضوانہ کا جی چاہا، اپنی ہتھیلی بھاری فائل اور پلسٹوں والے کاغذوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے اپنے دھلے ہوئے شفاف لباس پر سیاہی کے دھبے

لگالے اور اس خوبصورت آنکھوں والے دیوانے سے کہے۔

وقت نے تمہارے ساتھ جانے کیسی کیسی زیادتیاں کر کے تمہیں یہاں تک پہنچایا ہے، ہم اپنے تعلیمی کورس کی تکمیل کے لئے یہاں بھی تمہیں پریشان کرنے کے لئے آ گئے ہیں تم ایک دیوانے ہو تمہیں حق ہے کہ ہمیں ڈانٹ دو گالیاں دو۔ چاہو تو ہمیں پتھر دے مارو۔ مگر اس نے کچھ نہ کہا۔

" ہم آپ کو زحمت دے رہے ہیں اگر آپ ہمیں یہ چند ٹسٹ کرنے میں مدد دے دیں تو ایک مسئلہ حل ہو جائے گا، لڑکیوں کو براہِ راست گفتگو کرتے دیکھ کر وارڈن کے ساتھ شریف بھی غائب ہو گیا۔

برآمدے میں بچھی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زبیر بولا۔

" آپ بیٹھ جائیں "

ابھی چند باتیں ہی ہو پائی تھیں کہ شریف دو کوکا کولا کی بوتلیں لے آیا۔ دونوں لڑکیاں حیران رہ گئیں۔

" یہ کس کے لئے ہے؟"

" زبیر نے آپ کے لئے منگوائی ہیں " شکریہ کے ساتھ دونوں لڑکیوں نے کوک کی ٹھنڈی بوتلیں ختم کیں۔

رضوانہ نے زبیر کو اپنا امتحانی مریض بنا لیا اور عظمیٰ کو وارڈن نے پورے سیکشن کے آصف سے واقف کرا دیا۔ زبیر نے ہر قسم کی مدد کا وعدہ کر لیا۔ رضوانہ نے پہلے کیس ہسٹری مکمل کی۔ اور دوسرے دن آنے کا کہہ کر عظمیٰ کے ساتھ واپس آ گئی۔

گھر آ کر اس کے دل و دماغ پر زبیر کا تصور چھایا رہا۔ اتنا سادہ اور

چپ چاپ کسی شہزادے کی طرح جو جنگل میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر راستہ بھول گیا ہو۔ اس ویرانے میں اپنے ایک نوکر کے ہمراہ ۔ وہ کیوں گزشتہ چار سال سے یہاں ہے۔ پہلی بار ہی اس نے بتا دیا تھا۔ کہ اس کے ڈیڈی مختلف ممالک میں سفیر رہے ہیں۔ زبیر کو دنیا کے سبھی مغربی ممالک کی سیاحت کیساتھ تعلیم بھی حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ میرے ڈیڈی بہت بڑے جاگیردار ہیں ان کی کئی سو مربع زمین ہے۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی شہزاد سی ایس پی ہے۔

سات سال ہوئے ڈیڈی نے امریکہ میں سیاحت کے دوران ایک امریکن خاتون سے شادی کر لی۔ اب وہ پاکستان میں ہی رہتی ہے عادل چھ سال کا ہے اور نوشیرواں چار سال کا ہے وہ شہر کے سب سے مہنگے اسلامی بیکن ہاؤس کے سکول امریکن سکول میں پڑھتے ہیں۔ جہاں ایک بچے کی فیس ایک ہزار ماہانہ ہے۔

میرے ڈیڈی کی بڑی خوبصورت محل نما کوٹھی ہے "الزبیر" وہ اب ڈیڈی ممی کے ساتھ رہتے ہیں ممی کو پتہ نہیں کہ میں ڈیڈی سے ملوں ۔

گھر آ جانے پر بھی اس کے ذہن میں زبیر کی کہی ہوئی ایک ایک بات گونج رہی تھی۔ ہسپتال میں سائیکاٹرسٹ کی رپورٹ میں لکھا تھا کہ وہ شیزو فرینیا کا مریض ہے اس پر اکثر شیزو فرینیا کے بڑے شدید دورے پڑتے ہیں۔ پہلی بار اس پر دیوانگی کا حملہ اس وقت ہوا جب اس نے اپنی بیوی کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ گھر میں اس کے خطرناک رویئے کی وجہ سے اسے دماغی ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ پچھلے چار سالوں سے وہ یہاں رہتا ہے۔ ہفتے پندرہ دن کے بعد وہ ڈیڈی کو ملنے جاتا ہے مگر اپنی شدید مصروفیت

کی وجہ سے مہینے میں ایک آدھ دفعہ اس کی ڈیڈی کا سے بات چیت ہوتی مگر میری امی ہسپتال میں مجھ سے ملنے آتی ہیں۔ میری امی بہت اچھی ہیں۔ ہر عید شب رات پر وہ میرے لئے نئے کپڑے مٹھائی اور پھول لاتی ہیں اور دس پانچ روپے شریف کو بھی انعام دے جاتی ہیں۔"

اگلے دن عظمیٰ نے ہسپتال جانے سے معذرت کر دی مگر ٹسٹوں کو مکمل کرنے کے لئے وہ اکیلی مینٹل ہسپتال آ گئی۔ برآمدے میں تنہا اسے آتے دیکھ کر وہ بولا۔

"آپ کی سہیلی نہیں آئی آج۔"

"اسے کوئی کام پڑ گیا تھا۔" شریف کرسی بڑھا کر بازار سے کچھ سودا لینے چلا گیا۔

"آپ کو مجھ سے ڈر نہیں لگتا۔"

"بھلا میں کیوں ڈروں۔"

"لوگ کہتے ہیں کہ جو شخص پاگل ہو اس سے ڈرنا چاہیئے۔"

قبل اس کے رضوانہ اپنی نوٹ بک سے ٹسٹ نکالتی وہ بولا۔

"میں آپ کو اپنی شادی کی تصویر دکھاؤں۔"

"ضرور دکھایئے۔" رضوانہ نے اشتیاق ظاہر کیا تو وہ چھلانگ مار کر کمرے میں چلا گیا۔ اور بڑے شوق و التزام سے الماری سے غیر فریم شدہ مٹی میں لتھڑی شادی کی گروپ فوٹو لے آیا۔ اس نے اپنی شادی کے موقع پر بے شمار ہار پہنے رکھے تھے ساس کی بیوی دولہن بنی بیٹھی تھی۔ ٹسٹ پہ ۱۹۶۴ء کی تاریخ لکھی تھی۔

"کیا ہوا تمہاری بیوی کو۔" رضوانہ نے سوال کیا۔

"شہلا میرے ماموں کی لڑکی تھی۔ بہت خوب صورت اور ماڈرن شادی کے کچھ مہینوں کے بعد ہی مجھے پتہ چل گیا کہ وہ دوسرے مردوں کے ساتھ پھرتی ہے مجھے اس سے محبت تھی۔ اس کی بے وفائی کے باوجود میں اس سے پیار کرتا رہا۔ میں نے اسے اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے سے منع کیا۔ مگر وہ باز نہ آئی۔"

زبیر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا ہے جیسے بنتی ہوئی تلخ یادوں کی کوئی کڑی کمزوری کی وجہ سے ٹوٹ گئی ہو۔ پھر جیسے اس نے چند منٹوں میں ہی کئی منزلیں اور وقت کے کئی فاصلے طے کر لئے ہوں۔ اب اس کی آواز ایسے آئی جیسے وہ دور کسی ویرانے سے بول رہا ہو۔

"میں اسے طلاق نہیں دینا چاہتا تھا۔ مگر میرے ماموں اور ڈیڈی نے زبردستی مجھ سے دستخط کرا لئے اور میری بیوی چھین لی۔ میں لاہور میں رہتا ہوں شہلا کراچی میں ہے بہت دور گئی ہے ہم دونوں میں۔"

ایسے ہی گھر اور خاندان کی باتوں کے دوران ہفتے میں اس نے پانچ ٹسٹ مکمل کر لئے۔ پانچواں ٹسٹ دو دن میں مکمل ہوا۔ زبیر کی توجہ کی وسعت بہت تھوڑی تھی۔ کئی دفعہ مختلف موضوع سے گھیر کر دوبارہ ٹسٹ کے موضوع پہ لانا آسان کام نہ تھا۔

"زبیر تم خود کو مریض سمجھتے ہو؟"

"اس ہسپتال میں مریض ہی تو رہتے ہیں۔"

"تمہیں پتہ ہے۔ تمہیں کیا مرض ہے؟"

"شیزوفرینیا کا مریض ہوں۔ میری کیس ہسٹری میں یہی لکھا ہے۔"

"تمہارا دل نہیں چاہتا کہ باہر کے صحت مند اچھے ماحول میں رہو؟"

میں یہاں ٹھیک ہوں۔ میرے لئے باہر کہیں جگہ نہیں۔ الزبیر میں میرے ڈیڈی سوزانہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ میری بڑی بہن کی شادی کرنل حسن سے ہو چکی ہے۔ شہزاد ماڈل ٹاؤن میں اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ رہتا ہے۔ میری امی اس کے پاس رہتی ہیں میری طرح میری ماں کا بھی اب کوئی گھر نہیں رہا۔ کبھی یہاں کبھی کہاں۔

ہر مہینے شریف ڈیڈی کے سیکرٹری سے رقم لے آتا ہے۔

سیکرٹری کراچی کا شیخ ہے مجھ سے ایک ایک پیسے کا حساب لیتا ہے، کئی دفعہ خرچ کیے ہوئے پیسے یاد نہیں رہتے کبھی بھول جاتا ہے۔ چوبیس گھنٹے پپو زبیر کا تمام کا خیال رکھتا ہوں۔ کوئی اور ہوتا تو کبھی کا بھاگ جاتا۔ مگر مجھے پپو کی امی کا خیال آتا ہے۔ بیچاری مظلوم عورت ہیں۔ اس کی چھ سال خدمت کی ہے ادھر احسن صاحب نے دوسری شادی کی۔ ادھر پپو ہسپتال منتقل ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ پپو کو امریکہ لندن جرمنی، روس پیرس سبھی جگہ علاج کے لیے لے کر گئے۔ ماہرین نفسیات کو بھاری فیسیں دیں۔ مگر پپو ٹھیک نہ ہو سکا۔ بیگم احسن نے کہا تھا،

"شریف تجھ پر مجھے بہت اعتماد ہے ہم خوش ہیں اپنا گزارہ کر لیں گے۔ مگر زبیر کو تیری ضرورت ہے۔ تب سے میں اس عہد نامے کی لاج نبھانے کے لیے اپنی زمین بیوی بچے چھوڑ کر یہاں سنیاسی بنا بیٹھا ہوں۔ مجھے دکھ ہوتا ہے جب ۔۔۔ پپو ڈیڈی سے ملنے الزبیر جاتا ہے بیر برآمدے میں بیٹھا انتظار کرتا رہتا ہے۔ مگر ڈیڈی کہلا بھیجتے ہیں۔ میں آج نہیں مل سکوں گا۔"

کئی دفعہ عادل اور نوشیرواں اسے بتیوں کی طرح برآمدے میں بیٹھا دیکھ کر مذاق کرتے ہیں۔

"پھوپھا جان آپ تو مینٹل کیس ہیں اسی لیے ڈیڈی نے آپ کو مینٹل ہاسپٹل میں داخل کرا رکھا ہے۔"

شریف دھنو کو ہمدرد سمجھ کر بتا رہا تھا ہر بات تفصیل کے ساتھ۔

اس نے کبھی شکوہ نہیں کیا کہ شریف یہ سب کیا ڈھونگ اور بہروپ ہے۔ کل تک میں سب سے بڑا بیٹا تھا۔ موروثی جائیداد کا وارث تھا۔ مگر آج میری حیثیت راہ کے پتھر جیسی ہو گئی ہے کبھی تو اسے کوئی ٹھوکر بھی نہیں مارتا۔ میں کیوں اتنا غیر ضروری فرد بن کر رہ گیا ہوں۔

شریف تم نے برسوں ہمارے جیسے جاگیرداروں، امیروں کے یہاں کام کیا ہے۔ تم تو دولت مند لوگوں کی ذہنی کیفیتوں کو سمجھتے ہو گے۔ ان کی پالیسیوں کو جانتے ہو گے۔ تم مجھے بتا سکتے ہو کہ میں نے کیا قصور کیا کہ ہر آسائش مجھ سے چھین لی گئی۔ اور میں جنگلی گلابوں کے نوکیلے کانٹوں میں گھر گیا ہوں۔ حالانکہ آج بھی میرے چہرے پر وہی خاندانی وقار اور میرے ادب و اخلاق میں بلندی پائی جاتی ہے۔ اس چار سال کی جلا وطنی میں اس کمرے میں، برآمدے اور جنگلی گلابوں کی بیلوں تک مختلف کالج اور یونیورسٹی کی طالبات دماغی مریضوں پر ریسرچ کے ماحول میں بنے ہوئے ٹیسٹ استعمال کرنے آتی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کئی وعدے کیے، مگر ٹیسٹ مکمل ہوئے اور پردہ لڑکیاں چلی جاتی ہیں اور بھولے سے بھی ہسپتال کے اس بیمار ماحول میں نہیں آتیں۔ جہاں میری آنکھوں میں ان کے انتظار کے دیئے جلتے ہیں۔ وہ کیسے موسمی پرندے تھے۔ جو بہار کے بعد پھر کبھی ادھر سے نہ گزرے۔

یہ لڑکیاں کیسی تتلیاں ہیں جو اڑتی اڑتی اس گلشن کے ویرانے میں آتی ہیں، ہنستی ہیں مسکراتی ہیں، وعدے کرتی ہیں، اور پھر چلی جاتی ہیں۔"

رضوانہ بڑے غور سے شیلف میں رکھی... بے شمار اچھی ادبی انگریزی ادب کی کتابوں کی فہرست دیکھ رہی تھی۔ کمرے کے کونے میں ایک ہارمونیم بھی رکھا تھا۔ کبھی موڈ ہو تو ببلو بہت اچھا ہارمونیم بجاتا ہے۔ اس نے چیف کالج سے بی اے کیا لندن کے انجینئرنگ کالج میں آخری سال کے طالب علم تھے جب انہیں وہاں ایک برطانوی لڑکی سے محبت ہو گئی مگر اس نے کسی اور سے شادی کر لی۔ ببلو شکست کھا گیا۔"

"ہائے بیچارہ۔ ببلو زبیر۔" رضوانہ کے دل میں اس کے لئے ڈھیر ساری ہمدردی امنڈ آئی۔

دوسرے دن ببلو نے خبر سنائی۔

"کل شام میری امی میرے لئے پھول لے کر آئی تو میں نے انہیں بتایا۔ رضوانہ میری بہت اچھی دوست ہے اور میری امی تم سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"وہ بھلا کس لئے۔" "کل شام وہ آئیں گی تم ان سے پوچھ لینا۔"

اگلے دن ڈیپارٹمنٹ میں کلاس اسٹینڈ کرنے کے بعد وہ مینٹل ہسپتال چلی گئی۔ شریف اس کے لئے چائے اور بسکٹ لایا۔ تو اتنے میں زبیر کی امی بیگم احسن آگئیں۔ پچاس سال کی باوقار ادھیڑ عمر کی عورت سے ببلو نے تعارف کرایا "یہ میری امی اور امی یہ میری دوست رضوانہ۔"

"بڑی خوشی ہوئی بیٹی تم سے مل کر۔" بیگم عارفہ احسن شائستگی سے بولی۔ "ببلو نے تمہاری بہت تعریف کی تو مجھے تم سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا

تم نے اس پر کئی ٹسٹ کیے ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتی ہوں سوچ بھی ٹھیک ہوگا۔ یا نہیں۔ میں تو اب اپنے بیٹے کے لئے زندہ ہوں، اس کے ڈیڈی نے پچپن سال کی عمر میں دوسری شادی کرلی ہے۔ اب وہ اپنے عیش میں لگے ہیں جوان بیٹے کو پاگل خانے میں ڈال رکھا ہے یہ باپ تو تیمر ہو چکا ہے۔ بیٹے کے لئے کوئی احساس کوئی جذبہ باقی نہیں رہا۔ اور میں الٹے ماہرین نفسیات اور سائیکاٹرس سے مایوس ہونے کے بعد مزاروں پیروں فقیروں کے در پہ پھرتی ہوں، شاید کسی کے ہاتھ میں شفا ہو۔ میرا دل کتنا جلتا ہے۔ چار سال کے عرصے میں یہ باپ ایک دفعہ بھی ہسپتال میں میرے بچے کا حال پوچھنے نہیں آیا۔ اور سوزانہ کے بچوں کو ساری گرمیاں نتھیا گلی مری سوات میں لئے پھرتا ہے، کیا میرے بچے کو ۱۱۵ درجہ حرارت میں گرمی نہیں لگتی، خاوند اس عمر میں غیر کا ہو چکا اور بیٹا جوانی میں ہوش گنوا بیٹھا۔ کونسی عورت یہ دن دیکھنے کے لئے زندہ رہے گی۔ میرا جگر نوں چھنیر کا بن گیا ہے۔

رضو تمہیں اپنے ٹسٹ کے نتیجے سے کیا لگتا ہے کیا اس کے مرض کا کوئی علاج ہے۔"

"بیگم احسن میں تو اس فیلڈ میں ابھی طالب علم ہوں، مگر میں یہ سمجھ سکی ہوں۔ کہ بیچو کوئی خطرناک کیس نہیں اس کا علاج ہسپتال سے باہر صحت مند ماحول میں ہو سکتا ہے، باہر کی فضا اس کی ذہنی اور جسمانی صحت پہ اچھا اثر ڈال سکتی ہے۔ اس ہسپتال میں تو اچھے بھلے لوگ خود کو بیمار محسوس کرتے ہیں۔"

"رضو مجھے تمہارے خیال سے قطعی اتفاق ہے میرے اختیار میں اب کچھ

بھی نہیں رہا، تم پپو کی بھلائی کی خاطر اسس کے ڈیڈی سے بات کرو ۔۔۔ میں تمہیں ان کی کوٹھی کا پتہ لکھ دیتی ہوں ۔"

"بیگم احسن میرے کچھ کرنے سے اگر پپو ٹھیک ہو سکتا ہے تو میں ضرور کوشش کروں گی۔ آپ فکر نہ کیجیے۔"

رضوانہ نے بیگم عارفہ احسن سے وعدہ کر لیا۔ وہ ضرور اس کے ڈیڈی سے ملے گی۔

ایم ایم پی آئی کا ٹسٹ شروع کر کے رضوانہ بڑی خوش تھی ۔ یہ آخری مگر طویل ٹسٹ تھا ۔ اس کے بعد کلینیکل کی نوٹ بک مکمل ہو جائے گی ۔ خوش ہونے کے ساتھ وہ ڈرتی بھی تھی ۔ یہ کئی گھنٹے کا ٹسٹ تھا ۔ اس میں زیادہ وقت درکار تھا ۔ اور زبیر تھوڑا سا کام کر کے ہی اکتا جاتا ۔ اسے یا نیند آنے لگتی یا ادھر ادھر کی لاحاصل باتیں کرنے لگ جاتا ۔

ٹسٹ شروع کرنے سے پہلے رضو نے دل ہی دل میں دعا مانگی ۔ " اللہ آج زبیر یہ ٹسٹ مکمل کر دے ۔ تو میں تیرے نام پر کچھ دوں گی ۔ اب تو پڑھائی کے دن ضائع ہو رہے ہیں ۔ سوموار سے سر مظہر اور عرفان صاحب نے کلاسیں شروع کر دی تھیں ۔ اگر آج اور کل میں ٹسٹ مکمل ہو گیا ۔ تو جمعرات سے باقاعدہ کلاس میں جاؤں گی اور زبیر کی زندگی سنوارنے کے پروگرام کا کیا ہوا تم ایسی غیر مستقل مزاج تو نہیں ہو رضوانہ ۔ ہاں زبیر ۔ تمہارے لئے ضرور کچھ کروں گی ۔ اور ہر کچھ کرنا قربانی مانگتا ہے مجھے اب تک دوسرے اپنی قربان گاہوں پر چڑھاتے رہے

ہیں۔ ان کے وقار پر حرف نہ آئے۔ ان کی تابناک زندگی کی روشنی دھندلی نہ پڑے جائے۔ اسی لئے مجھے اندھیروں کی راہ دکھائی گئی۔

مگر اب کے تم نے تاریکی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو عمر بھر روشنی کی کرن کو ترسو گی۔ مگر اس مرتبہ میں جو فیصلہ کروں گا۔ اس میں کسی دوسرے کا دخل نہ ہوگا۔ میں اپنے عقل و شعور کی روشنی میں فیصلہ کروں گی۔ اس بستی کے ہوش مند انسانوں نے مجھے دیا ہی کیا ہے۔ مجھے بیوہ کی دیوانگی عزیز ہے میں اس کی زندگی کے لئے کچھ کروں گی۔“

ٹسٹ شروع کرنے سے پہلے رضو نے اسے ہدایتیں دیں، یہ مختلف قسم کی رپورٹیں دینے والے کارڈ ہیں جس کارڈ کی عبارت سے آپ متفق ہوں اسے ایک طرف اور اختلاف رائے والے کارڈ دوسری طرف رکھ دیں۔ آپ سمجھ گئے۔“

”جی ہاں بالکل۔“ زبیر نے تسلی سے کہا۔

کمرے میں پیڈسٹل پنکھا تیزی سے گھوم رہا تھا۔ زبیر نے کام شروع کیا ایک ماہر نفسیات اور ڈاکٹر کی حیثیت سے اس کی حرکات نوٹ کر رہی تھی۔ ہدایات کے بعد وہ ایک کتاب پڑھنے لگی۔ مگر پانچ منٹ کے بعد اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ بڑی محویت سے رضوانہ کی صورت دیکھے جا رہا تھا۔

”آپ بہت اچھی لگتی ہیں۔“ وہ کسی بغیر ہچکچاہٹ کے کہہ گیا۔

کام کرو بہت وقت ہم نے ضائع کر لیا ہے۔“ — ”اچھا“ وہ کچھ جھینپ سا گیا۔ مگر برابر مسکرا رہا تھا۔ کارڈ پر لکھی عبارت پڑھ کر وہ علیحدہ کرتا جا رہا تھا۔ مگر دس بارہ کارڈ کے بعد اس کی انگلیاں ایک کارڈ کو مسل رہی تھیں۔

رضوانہ نے چشمِ تصور سے اس کے ماضی میں جھانکا۔ دلکش خدوخال والا یہ نوجوان چین کالج میں بہترین گھوڑ سوار کے علاوہ گالف کا شاندار کھلاڑی بھی تھا۔ خوش مزاج ہنسنے بولنے والا زبیر اپنے ابو کے ساتھ دلچسپ دلچسپ کی سیاحت کر کے آیا تھا۔ اس کا خاندان کئی پشتوں سے بڑے جاگیر دار وں کا گھرانہ تھا۔

"گویا آپ پیدائشی آرسٹو کریٹ ہیں" رضوانہ نے اس سے جیسے سوال کیا۔

"جی ہاں۔"

لاہور میں اس محل نما کوٹھی الذبیر کے سارے کمرے ائیر کنڈیشنڈ تھے ہر سال نئے ماڈل کی تین کاریں خریدی جاتیں۔ ڈیڈی کو جہاز جیتنی امپالا پسند تھی۔ اور زبیر کو ہلکی پھلکی ٹائمفٹ سے عشق تھا۔ دولت پیسہ کھانا پینا۔ دعوتیں پارٹیاں ہر ماہ اس محل میں منعقد ہوتیں۔ ڈیڈی کے دوست ان کی سہیلیاں زبیر کے ہم جماعت اور کئی آرسٹو کریٹ فیمیلیوں کے لوگ مدعو ہوتے اور اپنے جیسے لوگوں سے مل کر خوش ہوتے۔ گویا غربت بیماری آبادی کی بڑھتی ہوئی رفتار پہ یہ سب لوگ فکر مند ہوتے اور آدھی رات کے بعد نشے میں لڑکھڑاتے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔

انیس سال کی عمر میں زبیر نے بی اے کیا تھا پھر سیاحت کے لئے ڈیڈی کے ہمراہ وہ لندن فرانس، جرمنی، چلا گیا ایک سال امریکہ میں قیام کے دوران اس نے ایک ایک ریاست دیکھ لی امریکہ میں قیام کے دوران زبیر کو وہاں کی کوئی لڑکی نہ بھائی۔ مگر ڈیڈی کو بیس سال سوزانہ کی نیلی آنکھوں میں جانے کیا جادو نظر آیا۔ کہ انہوں نے وہیں پر اس سے شادی کر لی۔ ڈیڈی نے

شادی کے عشائیے میں زبیر کو بھی بلایا گیا تھا۔ مگر وہ آدھی رات تک شراب پیتا رہا۔ اور صبح تک مدہوش پڑا رہا۔

شادی کے کچھ ماہ بعد ڈیڈی نے واپسی کا پروگرام بنایا۔ پاکستان میں آ کر گھر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ عارفہ احسن کو ڈیڈی نے صاف کہہ دیا، کہ وہ گلبرگ میں کرائے پر کوٹھی لے کر رہے الزبیر میں سوزانہ رہے گی۔

امی نے کچھ احتجاج نہ کیا۔ الزبیر میں دنیا بھر کے نوادرات مہاگنی کی سیاہ لکڑی کا خاندانی فرنیچر۔ جانے کتنی نسلوں سے یہ نفیس کام کیا ہوا۔ فرنیچر اور کئی سو سال پرانے شمعدان اور برتن یہاں سجے تھے۔

جلد ہی ڈیڈی نے بڑی بیٹی کی شادی کرنل حسن سے کر دی پھر زبیر کی شادی کا سوال تھا۔ امی کی بڑی خواہش تھی کہ وہ اپنے جج بھائی کی بیٹی سے زبیر کی شادی کریں۔ ڈیڈی اپنی نئی بیگم کی ناز برداریوں میں مصروف تھے۔ مگر امی نے اپنی بھتیجی سے زبیر کی شادی طے کر دی۔ نغمی حسین ماڈرن اور شوخ لڑکی تھی۔ اس نے کنیرڈ کالج سے بی اے کیا تھا۔ اس کے کئی مداح اور پرستار بھی تھے۔

ڈیڈی نے اگرچہ شادی ایک امریکن خاتون سے کر لی تھی مگر ان کے اعصاب پر مشرقیت غالب تھی۔ زبیر کو موٹر انجینئرنگ کمپنی میں اسسٹنٹ منیجر کی جگہ مل گئی۔ تو دھوم دھام سے نغمی سے اس کی شادی ہو گئی۔ شادی کے کچھ ماہ بعد زبیر کو کمپنی نے لندن انجینئرنگ کی مزید تربیت کے لئے بھیجا۔ مگر وہاں ایک آئرش لڑکی سے اسے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ مگر اس نے جلد ہی ایک پروفیسر سے شادی کر کے گھر بسا لیا۔ زبیر دل پر دھکا لئے واپس وطن آ کر کچھ سا گیا۔ واپس پر نغمی نہ پہلے کی طرح آزاد ڈانس کلب دوست

شراب کی رسیا ہو چکی تھی۔ زبیر کی غیر موجودگی میں وہ اور بھی شیر ہو گئی تھی۔

چھوٹے بھائی شہزاد نے کمیشن کا امتحان دیا اور وہ پی سی ایس ہو گیا نغمی کے دوست زبیر کی خاموشی دیکھ کر اب گھر آنے شروع ہو گئے۔ ڈیڈی کو اس گھر میں ہونے والی سبھی خبریں باقاعدگی سے خانساماں پہنچا دیتا تھا۔ ان کی آمرانہ خطرت نے گھر میں ہوتا ڈرامہ برداشت نہ کیا۔

ایک اتوار کو وہ گلبرگ کی کوٹھی میں آ گئے۔ زبیر نے نغمی سے درخواست کی "میرے ساتھ فلم دیکھنے چلو۔"

"ہزار بار کہا ہے ڈیٹ فکس کر چکی ہوں، پھر کسی دن سہی۔" نغمی نے بے نیازی سے کہا "جیسے وہ بھی کوئی دوست ہو۔"

وہ دل برداشتہ ہو کر ہار مرتیم لے بیٹھا مگر ڈیڈی میاں بیوی کے درمیان ہونے والے مکالمے سن چکے تھے۔

"میں دیکھ رہا ہوں نغمانہ دن بدن بدچلن ہوتی جا رہی ہے۔ تم سے یا اس گھر سے اسے ذرا بھر دلچسپی نہیں۔ اگر ایک ہفتے میں اس نے اپنی روش نہ بدلی تو اس کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔"

"ڈیڈی نغمی میری بیوی ہے یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" وہ پہلی بار باپ کے مقابلے میں بولا۔

"اچھا تو یہی سبق تو نے سیکھا ہے۔" وہ دانت پیس کر رہ گئے۔

مگر آنے والے کسی خطرے کے پیش نظر اس نے نغمی کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ بھڑک اٹھی۔

"میں بچی نہیں۔ خوب سمجھتی ہوں اپنے برے بھلے کو۔ میرے ذاتی معاملہ میں دخل نہ دیا کرو۔"

ڈیڈی نے اسے جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دے دی۔ اب تو انہوں نے نغمی کے دوستوں کی قطار بھی ڈرائنگ روم میں براجمان بیٹھی دیکھ لی تھی۔ اور وہ سب ماڈرن انگلش میوزک سننے کے دوران جدید فیشن پر گفتگو کر رہے تھے۔ اور شادی کو ایک دقیانوسی قرار دے رہے تھے۔

کئی ماہ گزر گئے۔ شہزاد بھائی کی شادی ایک آرسٹو کریسٹ فیملی میں ہو گئی۔ اور وہ ماڈل ٹاؤن منتقل ہو گیا۔ ڈیڈی کچھ اور ماہ کے لیئے رسی ڈھیلی چھوڑ دی۔ بیگم سوزانہ کے اب دو بچے عامل اور نوشیرواں ہو گئے زبیر کی شادی کو تیرواں سال تھا۔

نغمی بے راہ روی کی منزل پر دور نکلی۔

"زبیر بد چلنی میرے خاندان کا شعار نہیں۔" ڈیڈی نے اسے آرام سے سمجھایا۔

"میں اس گھر سے چلا جاؤں گا۔"

"پاجی میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔ ہفتہ بھر تک بخار میں جلتے رہے ہو اس خبیث کی بچی نے ایک روز بھی تمہارا حال نہ پوچھا۔ اب انتہا ہو چکی، تمہیں طلاق لکھنی ہو گی۔"

ڈیڈی کا تو وہ کچھ نہ بگاڑ سکتا تھا۔ مگر نغمی کے پیچھے وہ چھری کو لے کر لپکا تو وہ فلک شگاف چیخ مار کر اپنے کمرے میں جا چھپی، وہ تو غنیمت ہوا کہ امی سامنے سے آگئیں، ورنہ تو لال خوفناک آنکھیں لیئے چھری گھماتا ہوا وہ دروازے کے باہر نغمی کے باہر نکلنے کا بے تابی سے انتظار کر رہا ہوتا۔

اسی وقت نغمی نے اپنے پاپا کو فون کیا۔

عارفہ نے دیکھ لیا پانی سر سے گزر چکا ہے۔ اب سیلاب کو روکنا ممکن نہیں۔ ڈیڈی یوں بھی نغمی سے ادھار کھائے بیٹھے تھے۔

فون سنتے ہی فوراً بعد جج صاحب دوڑے آئے۔

"عارفہ باجی میں نے تو آپ کے کہنے پر اپنی بیٹی دی تھی، یہ پاجی تو آج میری بچی کو قتل ہی کر دیتا۔ اب نغمی ایک منٹ بھی اس گھر میں نہیں رہے گی۔"

اس طرح خاندان کے بزرگوں کے سامنے نہ چاہنے کے باوجود دباؤ تلے آکر زبیر کو طلاق لکھنی پڑی۔ نغمی اپنے والدین کے پاس چلی گئی زبیر کے لئے اس کا ہمیشہ کے لئے چلے جانا بہت بڑا ذہنی دھچکہ ثابت ہوا جج صاحب نہ صرف اپنی بیٹی کو لے گئے بلکہ زبیر پہ عمداً قتل کا الزام بھی لگا دیا۔

احسن صاحب کے لئے دو ہی صورتیں تھیں کہ یا بیٹے کو قتل کے ارادے کی صورت میں جیل بھیجنے یا پھر ذہنی خرابی کے بہانے کچھ عرصے کے لئے ہسپتال بھیج دیں۔

وکیل کی نظر میں دوسری صورت بہتر تھی۔ اور اس طرح پہلی بار زبیر کو مینٹل ہسپتال بھیج دیا گیا۔ ہسپتال میں آکر وہ ساری دلچسپیوں سے محروم کر دیا گیا۔ پارٹیاں، دوست، مہمان، کتابیں، رسالے، گالف، رائیڈنگ سبھی کچھ چھوٹ گیا۔ کبھی کبھی وہ خواب میں چونک پڑتا۔

"نغمانہ کہاں ہو۔ میں تمہیں پیار کرتا ہوں۔ خدایا کوئی میری بیوی کو بلا لائے۔"

ہسپتال میں جب شریف اس کے اردگرد نہ ہوتا تو وہ اپنے خیال میں نغمی سے باتیں کرتا۔ اگر تمہارے دل میں میرے لئے ذرا بھی ہمدردی اور

محبت ہے تو تم لوٹ آؤ گے۔"

تبھی ایک دن ڈیڈی نے اس کے منہ سے بے وفا عورت کا نام سن کر اس کے منہ پہ تھپڑ دے مارا۔

"خبردار جو میرے سامنے اس ناگن کا نام لیا۔"

ہسپتال سے دو ہفتے پندرہ دن کے بعد امی یا ڈیڈی سے ملنے چلا جاتا۔ ورنہ ہسپتال میں اپنے کمرے میں بند جلتا رہتا۔ کئی دفعہ دس دس دن تک وہ حجامت نہ بنواتا۔ شیو نہ کرتا۔ ہزاروں خیالات آسیب کی طرح صبح شام اس کا پیچھا کرتے۔ میرا باپ میرا سب سے بڑا دشمن ہے اسی لئے اس نے "الزبیر" کو سوزانہ کے نام کر دیا ہے۔ پھر ہر گزرنے دن کے ساتھ اسے باپ سے تو شکایت تھی مگر اب اسے عادل اور نوشیرواں اپنے راستے کا کانٹا لگتے۔ اس کا بس چلتا تو دونوں کا گلہ نہ دبا دیتا۔

ایک دن اس نے ڈیڈی کے لاڈلے نوشیرواں کو پکڑ لیا اور قریب تھا کہ غصے اور نفرت کے شعلوں میں جلتا وہ اپنے سوتیلے بھائی کا گلہ دبا دے جنون کی اس کیفیت میں اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے آنکھیں سرخ انگارا بنی ہوئی تھیں۔ اور ہاتھوں میں جانے کہاں سے بے پناہ قوت آگئی تھی۔ اس کا خوفناک ارادہ اس کے ہاتھوں کی گرفت سے نمایاں تھا۔ نوشیرواں اس کے ہاتھوں کے جال سے نکلنے کے لئے زور لگا رہا تھا اس کے منہ سے بھیانک سی چیخ نکلی تو کچن سے سوزانہ دوڑی آئی اور کچھ نہ اسے ملا مگر برآمدے میں ایک لوہے کی سلاخ اٹھا لی۔ قبل ازیں لوہے کی سلاخ زبیر کا سر کھول دیے زبیر نے نوشیرواں کو زمین پر پٹخ دیا اور تیزی سے ڈرائینگ روم میں بھاگ گیا۔

شور سنکر ڈیڈی اپنے کمرے سے باہر نکل آئے مگر اتنی دیر میں گرنڈنگ کارڈیو سیٹ دیوار سے ٹکرا کر گرا پھر ریکارڈ پلیئر۔ کچن کی الماری میں رکھے ٹی سیٹ اور کافی سیٹ کے چور چور ہونے کی آوازیں آئیں۔ یہی نہیں وہ سوزانہ کے کمرے میں گھس گیا۔ اور اس کے سنگار میز کی چیزیں ایک ایک کر کے ٹوٹنے کی آواز آئی ممی اپنی قیمتی چیزوں کی تباہی دروازے میں کھڑی دیکھ رہی تھیں۔

وہ تو صورت سے ہی قاتل لگتا تھا۔

"آئی جی کو وہ بتانے لگیں۔ اس مرتبہ ڈیڈی کو پھر پولیس سے مدد لینی پڑی۔ مجھے تو شبہ تھا کہ آج وہ کسی نہ کسی کا خون ضرور کرے گا" ڈیڈی نے سوزانہ کے خیال کی تائید کی۔

دوپہر کو زبیر کو مینٹل ہسپتال بھیج دیا گیا۔ تو ممی کی جان میں جان آئی۔ شروع میں اسے بجلی کے جھٹکے دیئے گئے۔ ڈیڈی کو توقع تھی وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اسی لیے سال کے اندر وہ اسے انگلینڈ کینیڈا جرمنی۔ فرانس اور امریکہ کے دماغی علاج کے ماہرین کے پاس لے کر گئے مگر زبیر ایسا سریس کیس تھا جسے ہسپتال میں تالا لگا کر رکھا جاتا۔ ڈیڈی نے دنیا کے مشہور سائیکاٹرسٹس سے ذاتی اور خط و کتابت کے ذریعے فیس ادا کر کے مشورے کئے۔ سب کا متفقہ فیصلہ تھا۔ کہ زبیر کو بجلی کے جھٹکے دیئے جائیں اعصابی سکون کی گولیاں زبیر کو دماغی دورں سے بچایا جا سکتا ہے اور یہ گولیاں پچھلے کئی سالوں سے وہ لے رہا تھا۔

ہسپتال کے جس کمرے میں زبیر رہتا تھا۔ اسے وہ اپنا گھر کہتا تھا۔ شریف نے جانے کہاں کہاں سے ایکٹرسوں والے کیلنڈر۔ اس کے

کمرے میں لگار کھے تھے۔

اس کی پچھلی زندگی کو یاد کرتے ہوئے رضو نے وفعتاً نگاہ اٹھائی۔ زبیر اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ کوئی جذبہ کوئی تاثر یا دلچسپی اس کی نظر میں نہ تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اس آرسٹو کریٹ فیملی کے شہزادے کے لئے رضو کے دل میں ہمدردی اور محبت کی جو ننھی سی قندیل چمکی تھی وہ خوف کے ایک ہی جھونکے نے بجھا دی۔ کیا خبر تھی کہ نغمانہ کی بے وفائی کا انتقام لینے کے لئے یہ مجھے قتل کر دے۔

سفید استری شدہ قمیص اور کریز والی سیاہ پتلون کے ساتھ اس نے شوخ پھولوں والی ٹائی لگا رکھی تھی۔ اس کی شخصیت کی ساری وحشت اس کی آنکھوں میں چھپی لگتی تھی صورت سے وہ کتنا معصوم اور پیارا لگتا تھا۔ رضو نے کسی وجہ سے اپنے دل میں اس کے لئے ایک اعتماد جمانے کی کوشش کی۔

"زبیر صاحب۔" اپنا نام سن کر وہ بے خودی سے چونک پڑا۔ "آپ کام نہیں کر رہے۔"

"میں کر رہا ہوں۔"

وہ پھر مصروف ہوا تو رضو کو اس کے تکیے کے نیچے سے جھلکتی تصویر دکھائی دی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ وہ نیم برہنہ عورت کی تصویریں تھیں۔ زبیر کو جیسے کسی ڈراؤنے خواب سے چونکا۔ اس نے جھپٹ کر تصویریں لے لیں۔ اور الماری میں بند کر آیا۔ "اسے کہتے ہیں ذہنی عیاشی۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"آپ کے دیکھنے کی چیز نہیں تھی ورنہ دکھا دیتا۔"

وہ شرمندہ سی ہنس دی۔

"اصل میں کوئی چیز بھی اچھی یا بری نہیں ہوتی۔ صرف ہمارے سمجھنے کی بات ہوتی ہے۔ آپ کو ایسی تصویریں دیکھ کر خوشی ملتی ہے اس میں کیا برائی ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ہمارے لئے فیصلہ کرے کہ ہمارے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا۔"

"آپ کو پھول پسند ہیں۔" اس نے بات بدل دی۔

"ہاں پھول مجھے ہمیشہ سے اچھے لگتے ہیں۔"

"ٹھہریئے میں آپ کیلئے ایک پھول لا دوں۔"

اس کے قبل کہ وہ انکار یا معذرت کرتی وہ کمرے سے باہر جا چکا تھا۔

اور دو منٹ بعد کانٹوں سے ننھی انگلیوں میں پکڑا گلاب کا سب سے خوبصورت پھول لے آیا۔

"یہ لیجیے۔" وہ فاتحانہ شان سے بولا۔ رضو نے پھول لیتے ہوئے اسکا زخمی ہاتھ بھی دیکھ لیا تھا۔

اب وہ کھڑا اپنے بازوؤں کو زور زور سے جھلا رہا تھا۔

اب کام ہونا چاہیئے۔ رضوانہ کو نامکمل نشست کا خیال آیا

"اچھا۔" وہ فرمانبردار بچے کی طرح کام میں مصروف ہو گیا۔ دو منٹ بعد ہی وہ بولا۔

"آپ کو پامسٹری سے دلچسپی ہے۔"

"معمولی سی۔"

"لائیے میں آپ کا ہاتھ دیکھوں۔"

"کام کے بعد۔"

"نہیں پہلے۔" وہ مچل سا گیا۔

رضو نے ہاتھ اس کے آگے کیا تو وہ غور سے اس کے ہاتھ کی لکیریں پڑھنے لگا۔

"آپ کی زندگی بہت تھوڑی ہے اس لئے کہ آپ کی زندگی کی لکیر بہت چھوٹی ہے۔"

وہ ناخن سے رضوانہ کے ہاتھ کی لکیر کو واضح کرنے لگا۔

"معاف کیجئے جسے آپ زندگی کی لکیر سمجھ رہے ہیں وہ تو دل کی لکیر ہے۔ میری زندگی کی لکیر تو بڑی لمبی ہے۔"

"ضرور ہوگی مگر آپ دل کی بہت اچھی ہیں۔"

"اس تعریف کے لیے شکریہ۔"

"رضو آپ خود کو میرے لئے کیوں نہیں وقف کر دیتی۔"

یہ دولت مند جاگیردار پاگل ہو جانے پر بھی اپنی آمرانہ فطرت کو نہیں چھوڑتے سمجھتے ہیں ساری دنیا ان کی زرخرید غلام ہے۔

"خود کو تمہارے لئے وقف کر دوں اسلئے کہ تمہارے ڈیڈی لینڈ لارڈ ہیں۔"

"ڈیڈی کی جاگیر سے میرا کیا تعلق۔ میں نے تو یہ بات اسلئے کہی کہ مجھے تم بہت اچھی لگتی ہو۔"

"زبیر صاحب بات اچھائی یا برائی کی نہیں۔ اگرچہ میں عالمی انسانی ہمدردی پر یقین رکھتی ہوں پھر بھی جب کبھی ضرورت محسوس ہوئی تو میں خود کو ایک انسان کے لیے وقف کر دوں گی۔ جو واقعی مجبور اور مظلوم ہو۔ جسے میں ہاتھ پکڑ کر اٹھا سکوں۔"

"آپ کے خیالات بہت اچھے ہیں۔"

" اچھے خیال کے ساتھ اچھا عمل بھی ہونا چاہیئے۔ میں نے ہمیشہ بیمار اور بے بس انسانوں کی خدمت کرنے کے بارے میں سوچا۔ شاید سائیکاٹرسٹ بن کر یا ماہر نفسیات بن کر میں وہاں پہنچنا چاہتی ہوں۔ جہاں وہ انسان نہیں اس کا علم پہنچ سکتا ہے جو اس نے حاصل کیا یہ معاشرے کے لئے ضروری بن جاتا ہے۔ میں بڑی باتوں کے بارے میں سوچتی ہوں۔ بہت زیادہ لوگوں کی خدمت اگر یہ نہ ممکن ہوا تو پھر کم از کم میں نے عمر بھر دوسروں سے ہمدردیوں اور محبتوں کی خیرات لی ہے۔ اپنی زندگی کو برقرار اور باوقار طریقے سے رہنے کے لئے اب تو بھیک دینے والے بھی سارے جا چکے اور میں جھولی پھیلائے بیٹھی ہوں۔

راہ گزر پر بیٹھے کسی گداگر کی طرح۔ یہ بھیک جو قرض کے پتھر کی طرح ہر بار میرے شعور سے ٹکرائی اور مجھے یاد دلایا یہ دو ہاتھ دو پاؤں یہ آنکھیں ایک ناک صحت مند جسم سوچنے والا دماغ کس دن کام آئے گا۔ اور اب شاید وہ دن دور نہیں جب میں بھیک اچھے طریقے سے واپس لوٹا دوں گی "

" رضو آپ کو ڈانس آتا ہے۔"

" مجھے کئی چیزیں سیکھنے کی فرصت نہ ملی۔ روٹیاں پکانے کی اور ڈانس سیکھنے کی۔"

" کھانا تیار ہے۔" ایک بجے نوکر نے مژدہ سنایا۔ تو رضو اٹھ کھڑی ہو گئے۔

" میں اب جاتی ہوں کافی دیر ہو گئی۔"

" نہیں جی کھانا چھوڑ کر آپ جائیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

شریف نے زبیر کی طرف سے اپنائیت جتائی۔

"آپ نہیں کھائیں گی تو میں بھی نہیں کھاؤں گا۔" زبیر کے الٹے میٹم نے تو اسے لپا کر دیا۔

مجبوراً رضو کو رکنا پڑا اور شریف نے بڑے سلیقے سے کھانے کی میز لگائی۔ دو رکابی، دو چمچے، دو کانٹے اور دو گلاس رضو کے ذہن کے کسی گوشے نے سکون سا محسوس کیا، مگر یہ مینٹل ہسپتال، وہ چپ سی ہو گئی۔

تورمہ آلو گوشت، اور سلاد ٹماٹر چٹنی سبھی کچھ تھا۔

زبیر نے تورمے کی ڈش اس کے آگے کی ایک کے بعد دوسری چیز وہ اچھے میزبان کی طرح بڑھا رہا تھا۔ پھر رضو نے کھانا شروع کیا۔ مگر وہ دیکھ رہی تھی، کہ زبیر بے ڈھنگے پن سے کھا رہا تھا۔ کھانے کے دوران وہ بار بار اپنی شوربے میں بھیگی انگلیاں چاٹ رہا تھا چپ چپ کی آواز رضوانہ کے دل پہ ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھی۔ قدیم وحشی جانوروں کی طرح وہ ہڈیوں سے لگا گوشت نوچ رہا تھا۔ اب آنکھوں کی وحشت نے سارے چہرے اور ہستی پہ قبضہ کر لیا تھا۔ اور رضو کو کئی بار ابکائی اور اس نے منہ پہ ہاتھ رکھ کر اسے روک لیا۔ آنکھوں کے آنسو روکتے مشکل ہو گئے۔

"معلوم ہوتا ہے مرچیں زیادہ ہیں" شریف نے بغور اسکے چہرہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"شاید یہی بات ہے۔" رضو کے منہ سے جواب بھی آہستہ سے نکلا۔

کھانا ختم ہو چکا۔ شریف برتن اٹھا کر لے گیا۔ تو رضو اپنے آپ پہ ملامت کرنے لگی۔ اگر یہ شخص اچھا بھلا نارمل ہوتا تو شہر سے دور اس

بستی میں کیوں بیٹھا ہوتا۔ یہ تو ایک مریض ہے جسے ہائی سوسائٹی نے اپنے معیار کی چھڑی سے ناپا اور رد کر کے یہاں ڈال دیا اور یہ یہاں چار سالوں سے جلا وطنی کی زندگی گزار رہا ہے۔ برسوں سے عورت کے قرب کو ترس گیا ہے، اس کمی کو پورا کرنے کیلئے اس نے دیواروں پر مختلف ایکٹرسوں کے کھلے لمبے اور چھاتی نمایاں کی ہوئی تصویروں والے کیلنڈر آویزاں کر رکھے ہیں۔

کھانا کھانے کے بعد رضو نے شریف کی اچھا کھانا پکانے کی خوبی کی تعریف کی۔ شریف تو مسکرا دیا، مگر زبیر نے ہنسنا شروع کر دیا۔ اس کی مسلسل بے تماشا ہنسی نے رضو کو اپنے مینٹل ہاسپٹل میں ہونے کا احساس دلایا۔

"ہستی علاج غم ہے" زبیر نے کہیں گھسی پٹی مثال دے ماری۔

"ایسی ہنسی سے کیا حاصل جس کے پیچھے دل روتا ہو۔ اچھا میں جا رہی ہوں۔"

"کل آئیں گی۔"

"مشکل ہے آجکل پروفیسر ضروری نوٹس لکھا رہے ہیں اور میرے پاس وہ کتابیں نہیں۔ چند روز کے بعد سہی۔"

"میں باہر تک آپ کو چھوڑ آؤں گا۔"

"نہیں میں اکیلی چلی جاؤں گی زبیر آپ آرام کریں۔"

رضو نے اسے بہت روکا، مگر وہ گرمجوشی سے اپنے بوٹ اور جرابیں پہننے لگا۔

"میرے ساتھ چلتے ہوئے آپ کو شرم آتی ہے۔ میرے ڈیڈی نے مجھے اچھے کپڑے بنوا کر نہیں دیئے۔"

"یہ بات نہیں زبیر مگر تمہارا انگلیشیئر جیسا ٹھنڈا دماغ کبھی نہ سمجھے گا۔ اور

گلیشیئر کی دو خوبیاں میری امی نے بچپن میں مجھے بتائی تھیں کہ گلیشیئر جس پر گرتا ہے۔ وہ چیز ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ اور جو چیز گلیشیئر پہ گرتی ہے وہ بھی اپنی ہستی کھو بیٹھتی ہے اور اب تصویروں فلموں اور کتابوں میں تفصیلی طور پہ گلیشیئر کے بارے میں جان چکی تھی۔

زبیر اس کے شانہ بشانہ چل رہا تھا۔ ارد گرد کے کئی ہوش مند وارڈن چوکیدار مالی۔ کمپوڈر انہیں بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے وہ کسی نئے ڈرامے کے منتظر ہوں۔ اور رضو کے دل میں خجالت کا سا احساس تھا۔

ستمبر کے اس جاتے مہینے کی یہ دوپہر روز کی طرح گرم تھی پیدل چل کر وہ پسینے میں نہا گئی تھی۔ گھر آتے ہوئے وہ سارا وقت زبیر کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ آج دوپہر وہ کیسے بے ڈھب طریقے سے کھانا کھاتے ہوئے اپنی انگلیاں چاٹ رہا تھا۔ وہ شخص جس نے کئی برس سال تہذیب و تمدن اور علم کے مراکز میں گزارے ہے، لندن واشنگٹن پیرس اور برلن کے مشہور اور عظیم سیاسی اور ادبی شخصیتوں کے ساتھ ہوٹلوں کلبوں میں اعلےٰ سطح کی پارٹیاں اٹینڈ کی تھیں، کبھی وہ اپنے باپ کے ساتھ جاتا اور اور کبھی اکیلا ہی۔ مگر اب وہ نفاست اور آداب عہد پارینہ کی داستان بن چکے ہیں۔ اس کے دل میں جیسے زبیر کے خلاف نفرت سی امنڈ آئی اور اس نے خود سے سوال کیا:

"رضوانہ تمہاری زندگی آگے ہی کیا کم عذاب ناک ہے جو تم اور دکھ اپنی جھولی میں سمیٹنا چاہتی ہو۔ اور یہ راستہ جو زبیر کے گھر کی طرف جا رہا ہے

یہاں قدم قدم پر نوکیلے پتھر اور ٹوٹے شیشے بکھرے ہوئے ہیں۔ شیشوں اور پتھروں سے پھولوں کی مہک کی توقع رکھنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ پہلے تو ــــ دوسروں نے تمہاری مرضی کے خلاف تمہیں دکھوں کے خارزار میں دھکیل دیا تھا۔ مگر کبھی متبرک ہاتھوں نے تمہیں اٹھا کر نئے سرے سے تمہاری زندگی کی بنیاد ڈالی۔ اور اب وہ وقت دور نہیں جب تم ایم اے کرنے کے بعد کوئی نوکری کر سکتی ہو۔ جب تم اپنے لئے کوئی مضبوط تختہ لے سکتی ہو۔ تو پھر شکستہ سفینوں میں اترنے کے کیا معنی۔

"کیا تم اذیت پسند تو نہیں ہو گئی۔ کیا تمہیں خوشی سے نفرت ہے الم سے محبت ہو گئی۔

نہیں میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ خوشی کے لئے روشنی کے لئے اپنے ساتھ دوسروں کو بھی زندہ رکھنا چاہتی ہوں۔ اپنے اندر ہونے والی بحث و کشمکش کا سامنا اس نے ایکبار نہیں کئی بار کیا تھا۔ اور کئی دفعہ اس کیفیت نے اس میں بڑا ہیجان پیدا کر دیا تھا۔

جب تک ڈاکٹر آفندی کا ساتھ تھا۔ اس نے کبھی اتنا فکر نہ کیا تھا مگر اب تو ہر چیز کا فیصلہ اسے خود ہی کرنا تھا۔ شروع میں اسے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ مگر اب تو کافی مہینے ہو گئے۔ تنہا رہتے ہوئے اکیلے فیصلہ کرتے ہوئے اور کبھی کبھی یہ کھٹکن ایک بوجھ بن جاتی۔ میں نے ایسی زندگی کب مانگی۔ یوں تو میں نے نہ چاہا تھا۔ پھر ایسے کیوں ہوا۔ اور آج ذہن میں آئے ہوئے سوالوں کا جواب دینے والا کوئی نہیں۔ یہاں میرے اجڑے صحرا میں شبنم کے قطرے بھی نہیں برستے اور وہاں یہ انسان جو سمندر کی طرح ہے اس نے مجھے ایک قطرے کی حق تو کیا خیرات بھی نہ دی

سوگوار سی اس شام رضوانہ نے سوچا تو آج پھر پچھلی یادوں نے تمہارے ذہن پر چھاپہ مارا ہے۔ چلو چھوڑو جانے دو، اب راکھ کو کریدنے سے کیا فائدہ چلو زبیر کے بارے میں سوچیں کہیں ایسا نہ ہو۔ زبیر کی زندگی کے بکھرے ابواب کو سمیٹنے میں اتنا وقت لگ جائے کہ پھر اپنے لئے کچھ گھڑیاں نہ مل سکیں اور اگر زبیر ٹھیک ہو گیا تو میرے لئے وہ کتنی خوشی کا دن ہو گا۔ اور میرے ایثار کو احسن صاحب جانے کیا سمجھیں۔ ممکن ہے وہ انکار کر دیں۔ "بی بی تم اپنی دنیا میں خوش رہو اور زبیر کو مستقل ہسپتال رہنے دو۔ اسی میں ہم سب کی بھلائی اور نجات ہے۔" نہیں میں مایوس نہیں زبیر ٹھیک ہو سکتا ہے۔

زبیر کی سادہ سی معصوم صورت اس کی نگاہوں میں آگئی، یہ شخص اجنبی تو نہیں کیا ہوا اگر یہ تھوڑا سا دیوانہ ہے اور ہسپتال کے ڈاکٹر نے اسے اکثر زبیر کے پاس آتے جاتے دیکھ کر کہا تھا۔

"آپ کو احتیاط کرنی چاہیئے یہ بے حد خطرناک قسم کا شیزوفرنک کیس ہے۔"

ڈاکٹر صاحب آپ کو کیا پتہ میں کیا سوچ چکی ہوں اگر احسن صاحب آمادہ ہوں تو میں زبیر کے لئے یہ دنیا تیاگ دوں، چند ماہ تک میرے امتحان ہو جائیں گے، اور میں فارغ ہو جاؤں گی۔ اور زبیر صاحب جنہیں علاج کیلئے ان کے ڈیڈی کہاں کہاں لئے پھرے اور پھر مایوس ہو کر ہسپتال میں داخل کرا کر صبر کر بیٹھے، کیا زبیر یونہی رہے گا۔ نہیں میں کل ہی احسن صاحب سے ملوں گی۔ اس نے رات کو سونے سے پہلے تہیہ کر لیا صبح وہ جلدی ہی تیار ہو کر کالج چلی گئی، پہلے دو پیریڈ مسز مظہر کے تھے تیسرے پیریڈ میں کنول نے اسے پکڑ لیا۔ "بی بی یہ چہرے پہ بارہ کیوں بجے ہوئے ہیں اور کئی دنوں کے بعد آپکی سواری کالج کی چار دیواری میں اتری ہے۔"

"بس یونہی کچھ مصروف تھی۔"

"اچھا وہ تمہارے ابنارمل سبجیکٹ کا کیا حال ہے۔"

"ہاں زبیر پہلے مجھے اس سے صرف ہمدردی تھی مگر تھوڑے سے دنوں میں اس نے میرے دل میں خاص جگہ پالی ہے۔ میں اس کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں تاکہ وہ پھر صحت مند انسان کی طرح ہمارے معاشرے کا مفید فرد بن سکے۔

"خیال بڑا نیک ہے مگر تمہارے ایثار و قربانی کے جذبے کی وہ دیوانہ کیونکر قدر کر سکے گا۔ کہیں اس کیلئے خوشیوں کی تلاش میں تم نہ پریشانیوں کی وادی میں کھو جاؤ۔ اور شادی ہی کرنی ہے تو کسی ایسے انسان کو منتخب کرو جو باعزت اور باوقار زندگی کی گارنٹی دے جس سے مل کر باتیں کر کے خوشی کا احساس ہو جس کا ساتھ میسر ہے۔

"کنول تم کچھ بھی سمجھو میں تمہارے خیال سے اتفاق کروں یا نہ۔ مگر میں نے سوچ لیا ہے۔ میں زبیر سے شادی کروں گی۔"

"تم پر مینٹل ہسپتال کا اثر ہو گیا ہے۔ سنو اس وقت جب تم شہرت کے بام پر ہو۔ تم چاہو تو اچھی جگہ شادی کر سکتی ہو۔ یہ وقت جب موسم بہار کا ہے باغوں میں رنگینیاں برس رہی ہیں آموں کے پیڑوں پر کوئل بول رہی ہے۔ دور کہیں پپیہے کی پکار سے دل میں ہوک اٹھتی ہے۔

"کنول ہر شخص کا خوشی کے بارے میں مختلف نظریہ ہوتا ہے۔ اور خوشی کا ذریعہ بھی ہر انسان کے لئے ضروری نہیں ایک سا ہو۔ میں غیر معمولی حالات میں پیدا ہو کر پلی بڑھی ہوں۔" اور میں عام انسانوں سے مختلف زندگی گزارنا چاہتی ہوں میرے نزدیک خوشی سمیٹنے کا نہیں دوسروں کو کچھ دینے اور ایثار کا نام ہے۔"

"دھنو یہ سب سی چیزیں یا تو فلموں میں سجتی ہیں یا افسانوں میں بھلی لگتی ہیں۔

بہت سی باتوں میں شاعری اور ذہانت ہوتی ہے زندگی کی سچائی نہیں ہوتی۔ وہ صرف الفاظ کا گورکھ دھندہ ہوتا ہے اس کی بنیاد کچھ نہیں ہوتی۔"

"کنول رہنے دو میرے تمہارے خیالات آپس میں مل نہیں سکتے نہ ہی تم میری بات سنتی ہو تمہیں میری خوشی سے کوئی سروکار نہیں۔"

ایمان سے رضا لیا تو کہو میری نظر میں تمہاری خوشی سب سے اہم ہے چلو میں مان لیتی ہوں کہ زبیر تمہاری زندگی کا جزو بن گیا ہے۔"

"بڑی کمینی ہو تم بھی آج مجھے جلدی جانا ہے کئی ضروری کام کرنے ہیں۔"

"اور زبیر سے بھی ملنا ہے"

"نہیں اس کے باپ سے ملنا ہے۔"

"باپ رے باپ۔

"اب زیادہ بنو نہیں" رضو اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مہکیں تیرے ہونٹوں کے گلاب اور بادہ۔"

کنول ترنم سے گنگنانے لگی۔

اپنے کالج کے آفس سے اس نے احسن صاحب کی کوٹھی میں فون کیا۔ اتفاق سے وہ گھر پہ ہی تھے۔ اگلے دن صبح نو بجے کا وقت انہوں نے دے دیا۔

کالج سے باہر سڑک پہ آ کر اس نے رکشہ لیا۔ "کدھر چلوں۔"

گھر کی بجائے اس نے مینٹل ہسپتال کہا تو رکشے والے نے گردن گھما کر دیکھا۔ لڑکی تو خاصی معقول لگتی تھی۔ لباس بھی صاف ستھرا تھا ہاتھ میں موٹی سی ایک کتاب اور فائل بھی تھی۔

"آپ کو اتنا تجسس کرنے کی ضرورت نہیں کہ میں وہاں کیوں جا رہی ہوں۔"

رکشے والے کو پیسے دے کر وہ کھلی سڑک پر چلنے لگی۔

زبیر اسے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھا مجھے امید تھی آپ آئیں گی جو میرا دل کہے وہی ہوتا ہے۔"

"زبیر میاں آپ خود پر اتنا نہ اترائیں۔ دنیا میں بھی کچھ ہو سکتا ہے جہاں خون کے رشتے کچے دھاگے سے زیادہ مضبوط نہ ہوں وہاں کیا ممکن نہیں تم بہت کچھ دیکھ چکے اور میں نے کچھ سن لیا۔ آپ جو اس ہاسپٹل میں رہتے ہیں اگر اس ماحول میں خوشی کی کوئی بھولی بسری کرن آپ کی زندگی کی تاریکیوں کو مٹا دے تو اسے اپنی خوش نصیبی سمجھئے۔"

"سنئے آپ کو راز کی بات بتاؤں میں ایک شہزادہ ہوں رائل فیملی سے تعلق رکھتا ہوں وہ لالچی بڈھا کھوسٹ اپنے جیتے جی کسی کو جائیداد میں شریک نہیں کرنا چاہتا اسی لئے مجھے اس قید خانے میں ڈال رکھا ہے۔ میں اپنے حق کے لئے اسے ملنے جاتا ہوں وہ ڈر کے مارے میرے سامنے نہیں آتا۔ تم نے دیکھا۔ اس نے ایک اور شادی رچا لی ہے کسی نہ کسی سے میرا باپ ہٹلر کی اولاد ہے۔"

شریف اسے بتا رہا تھا۔

"آج زبیر کی طبیعت خراب ہے صبح سے یونہی بے تکی باتیں کر رہے ہیں۔ صبح برآمدے میں رکھا پھولوں والا گملہ مجھے دے مارا خوش قسمتی سے میں ایک طرف کو ہو گیا ورنہ آج تو آپ کو کچھ اور ہی نظارہ نظر آتا۔ ادھر احسن صاحب اوران کا سیکرٹری سمجھتے ہیں کہ ان کے پیسوں سے میں عیش کر رہا ہوں۔"

رفعت نے پہلی بار زبیر کو ایسی جنونی حالت میں دیکھا تھا۔ بکھرے بال، وحشت زدہ سرخ آنکھیں بے قابو پاگلوں کی طرح برآمدے کے ایک کونے سے دوسرے کونے کی طرف وہ جاتے ہوئے منہ ہی منہ میں کچھ بول رہا تھا۔

شریف حسب دستور بازار سے سبزی لا کر برآمدے سے باہر مٹی کے تیل کا سٹوو

جلا کر کھانا پکانے لگا۔

اور زبیر کار دیہ جیسے جانتے نہیں رہا دیکھ کر وہ مایوسی سے ایک درخت کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

پیڑ پہ ایک کوئل کوک رہی تھی۔

"بی بی میں کئی بار سوچتا ہوں آپ کو یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے اپنی پڑھائی کا کام ختم ہوا یہ جا وہ جا دوسری طالبات کی طرح بھلا دیکھ کر زبیر کو ملا ہے اس پاگل خانے میں ہمیں تو ہمارا پیٹ اور ہماری مجبوری رکھے ہوئے ہے یہ پاگل خانے اور زبیر کے گھر کا راستہ جو بظاہر سیدھا سادا ہے بیاندر سے بڑے بل فریب اور چکر ہیں آپ کیوں اس راستے پر آئی ہیں؟ آپ کیوں زبیر کی دیوانگی سے ہمدردی رکھیں آپ سے پہلے بھی کئی لوگوں نے زبیر سے اپنی بیٹیوں کی شادی کی پیش کش احسن صاحب کو کی ہے تاکہ اپنی بیٹی کی وساطت سے وہ بھی احسن صاحب کی دولت سے کچھ حصہ وصول کر سکیں۔ ایسے تمام دستوں کو احسن صاحب اچھی طرح جانتے ہیں۔

"کل تو میں احسن صاحب سے ملنے کا وقت لے چکی ہوں۔"

رضو پریشان سی ہو گئی۔ جیسے آج اس پر کئی بھید کھلے ہوں۔

"آپ احسن صاحب سے ملیں گی۔"

شریف حیرانی سے بولا۔

"اس میں برائی کیا ہے وہ اچھے آدمی ہوں گے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ احسن صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ مگر آپ کو دلی نہیں جانا چاہیئے۔"

شریف کے لہجے میں بڑا خلوص تھا۔

"شریف میں اپنے لیے تو کچھ نہیں چاہتی، جو کچھ کروں گی زبیر کی بھلائی کیلئے ہو گا۔"

"پھر بھی انسان کو دوسروں کی خاطر اپنی جان مشکل میں نہیں ڈالنی چاہیے آپ نے دیکھا، دوائیاں کھانے کے باوجود مہینے میں ایک آدھ دفعہ زبیر کی حالت خراب ہو جاتی ہے، اور کئی دفعہ تو بڑے خونخوار ہو جاتے ہیں یہ تو اپنے بازوؤں کی طاقت ہے کہ میں یہاں زندہ سلامت ہوں، ورنہ تو اللہ ہی جانے کیا ہو چکا ہوتا۔ اور آپ تو ایک لڑکی ہیں نازک سی جس کا آگے پیچھے کوئی نہیں"

"شریف یہ تم سے کس نے کہہ دیا ہے۔" رضو گھبرا کر بولی۔

"ایمان سے کہیے آپ کا کوئی قریبی رشتہ دار زندہ ہے میں نے دنیا دیکھی ہے اور چار سال اس مینٹل ہسپتال میں گزر گئے کئی سالوں سے انسانوں کا بہت قریب سے مشاہدہ کر رہا ہوں، اب تو میں بھی آدمیوں کو اندر سے پہچاننے لگا ہوں، صورت دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ اگلا کتنے پانی میں ہے۔"

رضو مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

"مجھے بھی بتائیں کتنے پانی میں ہوں کہیں ڈوبنے کے قریب تو نہیں۔"

"جی نہیں، آپ کی بات تو نہیں کر رہا عام لوگوں کی بات کر رہا ہوں۔"

یکلخت رضو کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔ اپنے کمرے میں دروازے کی دراز سے وہ آنکھ لگائے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں جا رہی ہوں۔"

"کیوں اتنی جلدی ابھی تو آپ آئی ہیں۔"

"ایک کام یاد آ گیا ہے اس لیے جانا ہی پڑے گا۔"

"آپ مجھے یہاں سے چھٹی دلوا دیں۔ میں یہاں سے بیزار ہو گیا ہوں۔"

وہ منت بھرے لہجے میں بولا۔

"میری اس ہسپتال میں کیا وقعت ہے جو میں آپ کو چھٹی لے دوں"

"آپ کرنل منیر سے میری سفارش کر سکتی ہیں"

"ڈاکٹر بھلا میری کیونکر بات ماننے لگا بہرکیف کبھی موقع ملا تو کہہ دیکھوں گی"

اتنے میں شریف بھی کمرے میں آ گیا۔

"اچھا میں چلتی ہوں شریف میرے مقصد میں کامیابی کی دعا کرنا"

"خدا کرے" شریف نے اس کے سامنے کو کہہ دیا مگر اس کے جانے کے بعد اس کے لبوں سے نکل گیا۔ "خدا نہ کرے"

لارنس روڈ کی سیاہ بل کھاتی سڑک پر وہ اکیلی جارہی تھی۔ شب بھر کی بارش کے بعد فضا بڑی خنک اور خوشبو والی تھی۔ دور نزدیک کوئی نہیں تھا، مگر دورویہ بڑی عالی شان کوٹھیوں کی قطار تھی۔ اسی قطار میں احسن صاحب کی کوٹھی بھی تھی۔ ایک شاندار و وسیع و عریض کوٹھی کا غیر معمولی پن دیکھ کر وہ رک گئی۔

سیاہ آہنی گیٹ کے دائیں طرف دیوار میں گڑی ہوئی تختی پر کوٹھی کا نمبر اور نمایاں طور پر "المستربر" لکھا دیکھ کر وہ ٹھہر گئی۔ اس کی گھڑی میں نو بجنے والے تھے۔

گیٹ کے دوسری طرف گھنی مونچھوں والے پچاس سال کے پٹھان کو بندوق کے کندھے پر رکھے ہوئے اس عام سی چھوٹی سی معمولی صورت والی لڑکی کو گیٹ کے باہر کھڑا دیکھ کر تعجب سا ہوا۔ وہ متجسس نگاہوں سے دیکھتا ہوا گیٹ تک آگیا۔

"خود کس سے ملنا مانگتا ہے۔"

وہ کہہ رہا تھا مگر رضو کے اندر کی آرٹسٹ کوٹھی کا حسن و جمال دیکھنے میں محو تھی۔ ایسی کوٹھی اس نے کاہے کو دیکھی تھی۔ وہ تو فن تعمیر اور حسن کا بہترین نمونہ تھی۔

اندر بڑے نایاب درختوں کی قطاریں۔ ہر رنگ کے گلاب کے پودے غرور و نخوت سے کھڑے تھے۔

"مجھے احسن صاحب سے ملنا ہے۔"

رضو نے کہا۔ تو چوکیدار نے آہنی گیٹ کا تالا کھول دیا اور تھوڑی دور تک رضو کی رہنمائی کی۔ پھول پودے درخت دیواریں سیاہ آبنوسی لکڑی کا باریک کام کئے ہوئے کئی سو سال پرانے دروازے کھڑکیاں طویل برآمدے میں سے گزرتے ہوئے اسے اردگرد کوئی انسان نظر نہ آیا۔

کتنے باذوق انسان ہیں۔ چند چیزیں برآمدے میں پڑی دیکھ کر رضوانہ متاثر ہوئی۔ برآمدے میں احسن صاحب کے سیکرٹری نے پوچھا۔

"آپ کسی سکول کی امداد کے سلسلے میں ان سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"نہیں۔" رضو نے بتانے سے تامل کیا۔

"آپ سے ملنے کا کیا وقت مقرر ہے۔" سیکرٹری نے پوچھا۔

"نو بجے صبح کا۔"

"نو تو بج رہے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک وسیع ہال کمرے کا دروازہ کیا کھولا گویا باب طلسم کھل گیا۔

"آپ یہاں انتظار کریں۔"

سیکرٹری چلا گیا۔ دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ تو رضوانہ کمرے کا بغور جائزہ

لینے لگی، فرش پر بچھا ہوا پھولدار اصفہانی قالین ہی کئی لاکھ روپے کا ہوگا۔ دیواروں کی پینٹنگز دنیا کے بہترین آرٹسٹوں کے فن کے نمونے تھے، مینٹل پیس پر چاندی کے فریم والی چند پرانی خاندانی تصاویر رکھی تھیں ایک طرف پیانو رکھا ہوا تھا۔ تانبے کا نفیس کام کئے ہوئے چند قدیم گلدانوں میں پھول سجے تھے۔ نہ ابھی تفصیل سے سب کچھ دیکھ نہ پائی تھی کہ نوکر ایک طشتری میں بیضوی گلاس میں شربت لے آیا۔ چاروں طرف سے ٹھنڈی ہوا امنڈ کر آرہی تھی۔ اجنبی سے ماحول میں اسے بےحد پیاس لگ رہی تھی اور یہ جانے بغیر کہ کس چیز کا شربت ہے ایک ہی سانس میں اس نے گلاس خالی کر دیا، تبھی بغلی کمرے کے دروازے سے احسن صاحب نمودار ہوئے۔

" آداب ہے"، وہ مؤدب سے ہو کر بولی۔

اس کا خیال تھا یہ شخص بے حد قیمتی سوٹ میں ملبوس ہوگا، اونچا لمبا قد سرخ و سفید چہرہ لئے بہت ہی سنگدل ہوگا، مگر درمیانے قد کا یہ شخص پرانی گندم جیسے رنگ کا تھا۔ انہوں نے بو شرٹ اور پتلون پہن رکھی تھی البتہ ملنے کے ابد آدھے سر تک کے سارے بال اتر چکے تھے، ان کی آنکھوں میں ایک چمک تھی۔ پہلی نظر میں وہ شخص اسے بڑا ایماندار لگا مگر صورتیں بھی کیسے کیسے دھوکے دے جاتی ہیں۔

" میں اس وقت بھی کافی مصروف ہوں، تمہیں تھوڑا سا وقت دے سکونگا۔"

" نوازش ہے آپ کی۔"

" مہربانی والی کوئی بات نہیں میں خود تم سے ملنا چاہتا تھا، یہ جاننے کے لئے کہ تمہارے ٹسٹوں کا کیا نتیجہ نکلا۔"

" آپ نے زبیر کو اب تک جانے کن کن ذہنی امراض کے ماہرین کو دکھایا ہوگا،

ان کے سامنے میری رائے تو سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے میں ابھی ایک طالب علم ہوں۔ مگر میرا مشاہدہ ہے کہ آپ کا بیٹا اتنا بیمار نہیں کہ اس کا علاج دماغی امراض کے ہسپتال میں کیا جائے۔ یہ باہر کے صحت مند ماحول میں رہ کر بھی ٹھیک ہو سکتا ہے ایسے ماحول میں جہاں قدم قدم پر کوئی یاد دلانے والا اور کہنے والا نہ ہو کہ زبیر تم بیمار ہو۔ آپ اسے ہسپتال کے ماحول سے نکال لیں۔"

"مگر وہ ہسپتال کے ماحول سے نکلے بھی۔"

وہ ہسپتال سے نکل کر کہاں جائے آپ کے خاندان کے سبھی لوگ اپنی اپنی دنیا میں مگن ہیں کسی کو زبیر کی پرواہ یا ضرورت نہیں۔"

"ہم میں سے کسی کو اتنی فرصت نہیں کہ زبیر کی دیکھ بھال کر سکیں۔ یہ تمہیں معلوم ہے۔"

"آپ زبیر کی شادی کیوں نہیں کر دیتے۔"

"ایک دفعہ کی تھی۔ ان دنوں زبیر ٹھیک تھا۔ مگر میں ذاتی طور پر مجرموں اور دماغی مریضوں کی شادی کے خلاف ہوں۔ اب جدید ماہرین نفسیات اور سائیکاٹرسٹ کے خیال کے مطابق ذہنی اور جسمانی بیماریاں نسل در نسل چلتی ہیں۔ زبیر کے بعد ایک اور شیزوفرینک نسل بڑھے میں اس کے خلاف ہوں۔ صرف زبیر کو ٹھیک کرنے کے لیے میں نے ہر ملک کے ماہرین سے مشورہ اور علاج کروایا۔ اب ہم تھک چکے یا ہار چکے ہیں۔ مگر اب بھی زبیر کی بھلائی کے لیے جو ہو سکتا ہے کیا جا رہا ہے۔"

"یہ کافی نہیں احسن صاحب۔"

"آپ کے خیال میں کیا ہونا چاہیے۔؟"

"آپ زبیر کی شادی نہیں کر دیتے۔"

"شادی مگر کس سے ؟"

"مجھ سے ۔"

ایسی آمنے سامنے گفتگو کسی نے پہلے کہاں کی ہو گی۔ لمحے بھر کے لیے رضوانہ نے سوچا۔ ایک منٹ کے لیے احسن صاحب کو خیال آیا۔ کہیں نفسیات کی کتابیں پڑھنے اور ذہنی امراض کے ہسپتال میں کئی دن دیوانوں کے قریب رہ کر یہ لڑکی کہیں اپنا ذہنی توازن تو نہیں کھو بیٹھی۔ اور اس کے سوچنے سمجھنے کی قوت وہاں کے ماحول سے متاثر نہ ہوئی ہو۔ اور اب یہ اس میں برائی بھلائی سمجھنے کی تمیز نہ رہی ہو۔

رضو تم ابھی بچی ہو۔ اور تمہاری زندگی کے بارے میں تمہارے والدین بہتر فیصلہ کریں گے۔"

"میرے والدین نہیں ہیں۔"

"پھر تمہیں زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔"

"میں نے سوچ کر جواب دیا ہے۔"

"اس شخص کی طرف دیکھو جو تمہاری قدر کر سکے تم سے محبت کرے اور زبیر سے تمہیں کچھ نہ ملے گا۔ سوائے پریشانی اور پچھتاوے کے۔"

"احسن صاحب میں نے زندگی میں سوچ رکھا ہے کہ خود کو اس شخص کے لیے وقف کر دوں گی جسے میری مدد کی ضرورت ہو۔"

"اس سے تمہارے مستقبل کا کوئی خاکہ باقی نہ رہے گا۔"

"میں سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں۔"

"زبیر سے شادی کے لیے میری ایک شرط ہے۔"

"شرط۔" وہ پہلی بار چونکی۔

"مجھے معلوم ہے تم زبیر کی بھلائی چاہتی ہو۔ مگر شادی تو پہلے تمہیں ہی اور

کرائی ہوگی تاکہ تمہارے کوئی بچہ نہ ہو۔"

"احسن صاحب یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ظلم ہے۔"

"تم زبیر کی بھلائی چاہتی ہو اور یہ راستہ تو ایسے ہی نوکیلے پتھروں سے بھرا پڑا ہے۔ تمہیں اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔"

اب رضو کو احسن کے روپ میں ایک پتھر دل جاگیردار باپ نظر آیا۔ جو آئیوالی نسل کو صرف اسلیئے ختم کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کی جاگیر کا حصہ دار نہ پیدا ہو جائے۔

"آپ کو میں ایسا باپ نہیں سمجھتی تھی۔"

"زبیر سے شادی کی خواہشمند عورت کو اس امتحان سے گزرنا ہی ہوگا۔"

"میں نے آپ سے اپنے مستقبل کے تحفظ کے لیئے کوئی شرط نہیں رکھی آپ کو بھی مجھے کسی شرط کا پابند نہیں بنانا چاہیئے۔"

"یہ ضروری نہیں کہ ہر بات کا فیصلہ تم آج کرو۔ تمہارے پاس وقت ہے سوچ سمجھ لو جلدی کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے مجھے ایک میٹنگ میں جانا ہے اب اجازت چاہتا ہوں۔"

"خدا حافظ۔"

رضوانہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور احسن صاحب جس دروازے سے آئے تھے اس سے واپس چلے گئے۔

اتنے بڑے ڈرائینگ روم میں وہ اکیلی تھی۔ ہر چیز اجنبی امارت اور تفاخر کا احساس لیئے اسے گھور رہی تھی۔

بیگی تم کن بھول بھلیوں میں آپھنسی ہو۔ یہاں کی کسی چیز کی تمہیں سمجھ نہ آئے گی۔ یہاں اگر تمہاری کیا قدر ہو گی۔ ہمیں دیکھو ہم دلیس دلیس کے قیمتی نوادرات ہیں۔ پیالے ستار کئی سو سال پرانے گلدان ـ پہلے ہم احسن صاحب کی پسندیدہ چیزوں میں شمار ہوتے تھے۔ مگر اب یتیموں کی طرح ان کونوں میں پڑے ہیں اور احسن صاحب کی

امریکن بیگم نے مشرقی لباس تو پہن لیا ہے۔ مگر مشرقی توادرات کی قدر کرنی نہیں سیکھی، جتنی دیر رضوا اس ہال کمرے میں رہی ہر چیز جیسے چلا چلا کر اعلان کر رہی تھی۔ میں امریکہ سے لائی گئی ہوں، میں جاپان سے آئی ہوں۔ پیکاسو کی اوریجنل پینٹنگ کی قیمت صرف اس کا قدرداں ہی ادا کر سکتا تھا، پیکاسو جو جسمانی طور پر بوڑھا ہو کر مر چکا تھا۔ مگر اپنے آرٹ ورک میں وہ اس وقت تک زندہ ہے۔ جب تک اس کی ایک بھی تصویر باقی ہے۔

اور اگر رضوانہ تم مر گئیں تو تمہارا نام بھی تمہارے جسم کے ساتھ زمین میں دفن ہو جائے گا۔ تم پیکاسو نہیں اس نے اپنی عمر میں ہزاروں پینٹنگز بنائیں، مگر احسن صاحب تم سے تخلیق کا حق چھین رہے ہیں، عمر بھر کے لئے وہ تمہیں ایک ویران صحرا بنجر وادی بنا دینا چاہتے ہیں، جہاں کوئی کونپل کوئی پھول نہ کھلے۔

لوٹ جاؤ رضوانہ تم بھولے سے ادھر آنکلی ہو جسے تم نے سرخ گلابوں کا گلشن سمجھا ہے ماس کے پیچھے انگارے دہک رہے ہیں اور تم ننگے پاؤں ہو، تمہیں جوتے نہ ہونے کا شکوہ ہے، مگر کیا تم اس شخص سے خوش قسمت نہیں ہو جس کے پاس سرے سے پاؤں ہی نہیں۔

قبل اسکے کہ تمہارے پاؤں کے چھالوں سے جلتا ہوا لہو بہے تم چلی جاؤ یہ جادو نگری ہے۔ اس جادو نگری پر اس دیو کی حکومت ہے جو ایک ہی نگاہ قہر سے جیتے جاگتے انسان کو پتھر کی مورت بنا کر رکھ دیتا ہے اس نگار خانے میں چاروں طرف پتھریلی مورتیں ساکت چہرے سوچ احساس اور فکر سے خالی اداس دکھائی پڑتے ہیں، کیا تم بھی پتھر بن جانا پسند کر دگی۔

عمر بھر تجھے زیادتی اور ظلم کے پتھر اپنے آپ پر سہے ہیں۔ اب وہ واقعہ پھر دوہرایا جائے مگر کیوں؟ احساس سے خالی اس پنجرے میں تم کیسے زندہ رہو گی۔ جہاں نسیم

سحری نے کبھی نہیں جھانکا۔ وہ کمرے سے باہر نکلی تو کمرے کی خنک فضاؤں میں بھی وہ پسینے میں نہا گئی تھی۔ کیبا نروس کر دینے والا احساس تھا۔ اور اب برآمدے میں اسے احساس ہوا۔ لیکن تھکن کا شدید احساس اسکے اعصاب میں جذب ہو گیا ہے۔ برآمدے میں اس نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ اسی لمحے لبوڈ نیکو سے اس کے احسن صاحب کی نیلی ڈاج جاتے دیکھی۔

"کتنی لمبی اور خوبصورت کار ہے۔"

رضو نے اپنی سوچ کا رخ بدلنے کیلئے سوچا۔

چوکیدار نے گیٹ کھولا اور کار جیسے فضا میں تیرتی فضاؤں میں اڑتی چلی گئی۔ پہاڑوں کی انتہائی بلندیوں پر زم روئی کے گالوں کی طرح شب کو گرتے والی برف کی طرح خاموشی سے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے رضو کو لگا۔ اگر اس نے جلدی قدم نہ اٹھائے تو یہ لوہے کا وزنی گیٹ اس کے سر پر آگرے گا۔ اور اس کا دماغ ذرّے ذرّے ہو کر بکھر جائے گا۔

بس سٹاپ پر اسے آدھ گھنٹہ انتظار کے بعد بس ملی ویسے بھی اس راستے سے بسیں کم ہی گزرتی تھیں۔ بس آئی تو رضو کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی کوئی عزیز سہیلی مدت بعد ملی ہو بھوک اور پیاس کا احساس بڑھ گیا ہے تھوڑی دیر کی ملاقات جیسے سالوں لمبی تھی۔ جس نے رضو کو سرتاپا تھکا دیا تھا۔ کتنی زیادہ انرجی استعمال ہو گئی ہے۔ اس تھوڑے سے عرصے میں۔ یوں لگتا ہے جیسے بڑھاپا آہستہ آہستہ اعصاب کو کمزور کر رہا ہے اور ہڈیاں، میں برسوں پہلے کی چوٹوں کا رچا بسا درد جاگ اٹھا ہے۔

احسن صاحب کی کہی ہوئی ایک بات اس کے ذہن میں زندہ اور تازہ تھی جیسے حادثے میں بہتا ہوا سرخ لہو۔

گھر آنے کے بعد باتھ روم میں وہ دیر تک اپنے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیتی رہی۔ آئینے میں صورت دیکھی تو احساس ہوا، جیسے لمحوں کے قریب کئی سال گزر گئے ہوں۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

خوبصورت چمکیلے ریشمی بالوں میں چاندی کے تار جیسا سفید بال۔۔۔

تو اب تمہیں بڑھاپے کا یقین بھی آجانا چاہیئے۔ بتیس سال کی عمر میں بڑھاپا۔ سفید بال نوچنے کے جنوں میں اس نے کئی کالے بال بھی نوچ ڈالے سلیقے سے بنے ہوئے بال بکھر گئے۔

ایک دو بجنے کا تھا اور یہ بڑھاپے کا دور آگیا ہے۔ درمیانی عمر جانے کہاں راستے میں رہ گئی۔ کھو گئی ہے۔ شاید وہ جوانی کا دور تھا، جب شکیب نے کہا تھا:

"رضوانہ تم میری زندگی کے اندھیروں میں پھوٹنے والی اجالے کی پہلی کرن ہو۔ مجھے تمہارا انتظار رہتا ہے میں تمہارے بارے میں سوچتا ہوں۔"

ہم دو مختلف راستوں کو جانے والے مسافر تھے۔ یہ میری غلطی تھی کہ اسے اس سے زیادہ سمجھ لیا۔ جو کچھ ہم چاہتے ہیں، وہ کبھی نہیں ہوتا اور جو ہوتا ہے۔ وہ ہم نے کبھی نہیں چاہا ہوتا۔ یہ المیہ زندگی کے ساتھ ہمسفر کی طرح چلتا ہے۔ مگر پتہ نہیں لگتا۔ کئی زندگیوں میں گھاؤ ڈال دیتا ہے ہم رسنے والے زخم بنا دیتا ہے۔ اور کئی لوگوں کے لیئے یہ ایک معمولی واقعے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

کئی دنوں کے بعد رضوانہ باورچی خانے میں کھانا بنا رہی تھی۔ رفیعہ کی مستقل بیماری کی وجہ سے اس نے اسے ہسپتال میں داخل کرا دیا تھا، اور اب وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ پچھلے ہفتے ہسپتال کے ایڈمنسٹریٹر کی طرف سے اسے یاددہانی ملی تھی، کہ اپنے امتحان کے بعد رزلٹ تک وہ یہاں ٹھہر سکتی ہے۔ اس کے بعد ہسپتال کے سول سرجن کے لیئے یہ کوٹھی خالی کرنی ہو گی۔

اس کوٹھی کی دیواریں چھتیں ان میں کتنا پرانا پن ہے اور اس میں کتنا اپنا پن ہے اب وہ وقت دور نہیں جب یہ اپنائیت بھی زندگی سے نکل جائے گی۔ جیسے ہاتھوں میں گرفتار نہ ہوتے والی پاگل ہو۔

باورچی خانے میں کافی دیر لگا کر اس نے کھانا تیار کیا اب میز پر جب اس نے کھانا لگایا تو ایک پلیٹ اور ایک گلاس تھا۔ یہ ایک ایک چیز تو وہ کتنے مہینوں سے رکھتی آئی تھی۔ مگر آج ایک گلاس ایک پلیٹ ایک چمچہ کا احساس نشتر کی طرح سینے میں اتر گیا۔ پہلی بار اس کے دل میں شدت کا درد اٹھا۔ یہ درد جیسے صدیوں کا کرب بن کر سینے میں جم سا گیا۔ پسینے سے اس کا چہرہ گردن اور ہاتھ تر ہو گئے دانت بھینچ گئے۔ اگر اس نے ضبط کرنا نہ سیکھا ہوتا تو فلک شگاف چیخ اس کے منہ سے نکل جاتی۔ کئی سال پہلے بھی ایک دفعہ وہ اس کیفیت سے گزری تھی۔ اس وقت ڈاکٹر چچا نے کتنی دوائیوں کے ساتھ اس کو کتنی نصیحتیں کی تھیں۔ مگر آج اس کی حالت کچھ سنبھلی تو دروازے پر دستک سن کر وہ اٹھی تو دیکھا پوسٹ مین کھڑا تھا۔ دستخط کر کے اس نے رجسٹری وصول کی۔ اور کمرے میں آ کر کھول کر دیکھنے لگی

دعنو بیٹی

بہت سے پیار ــــ

کئی ماہ کے مسلسل علاج اور توجہ کے باوجود تمہارا چچا اب بے بس ہو گیا ہے۔ لاچاری اور بے بسی کی یہ منزل بڑی کٹھن لگتی ہے۔ انجانے راستوں سے گزر رہا ہوں، چاہتا تھا۔ اپنی زندگی میں تمہارے لئے کچھ کر جاتا۔ مگر درویشوں سے دعاؤں کے سوا کیا مل سکتا تھا۔ میرے پھیپھڑوں کا اپریشن کامیاب نہیں ہو سکا۔ اب یہ آخری پگڈنڈی جس کے بعد زندگی نامعلوم کے پُراسرار راستوں پر کھو جائے گی۔

تیس چوبیس سال پہلے میں نے اپنی ایک تحریر بینک میں رکھوائی تھا۔
اس میں میرا عدالت کے سامنے حلفیہ بیان ہے۔ میری موت کے اگلے دن
اس کی ایک کاپی تمہیں اور دوسری جہانگیر چندر کو بھجوا دی جائے گی۔ میرا
تحریر ایک ایسا ثبوت ہے جس کے سہارے تم اپنے باپ سے اپنے حق
کا مطالبہ قانونی طور پر کر سکتی ہو۔

تمہارا چچا
آذر

ڈاکٹر چچا کی محبتیں اور مہربانیاں قطار اندر قطار یادوں کی پریوں کی طرح سامنے کھڑی تھیں۔ اس خط کو لکھے ایک ہفتہ تو ہو چکا تھا۔ اور اب تک ڈاکٹر چچا آپ نامعلوم کے پراسرار راستوں پر جا چکے ہوں گے۔

یہ احساس ایک برچھی کی طرح رضو کے سینے میں اتر گیا۔ پہلے پلکیں بھیگیں پھر آنسو اور پھر آنسوؤں سے آبشاریں بہنے لگیں۔ وہ روتی رہی۔ اسے گمان ہوا جیسے وہ برسوں سے رو رہی ہے۔ کسی بہت پیاری ہستی کے لئے جس نے برسوں اس کی دیکھ بھال کی۔ اس کے کھانے پینے اور تعلیم کا خیال رکھا۔ اور جب اس لمحے وہ ان کی خدمت اور دیکھ بھال کرنا چاہتی تھی تو انہیں علاج کے بہانے سمندر پار بھیج دیا گیا۔ اور وہ دیارِ غیر کے کسی ہسپتال میں چپ چاپ ختم ہو گئے۔ اور پھر آخری بار میں نے انہیں دیکھا بھی نہیں۔

موت کے اس آخری لمحے میں چچا آذر آپ کو کتنا احساس ہوا ہوگا کہ آپ دنیا میں تنہا بالکل اکیلے ہیں۔ مگر نرس کے ہاتھ سے لکھوائے خط میں آپ نے اس احساس کی پرچھائیں بھی نہیں پڑنے دیں۔ میرے عظیم چچا آپ انمول ہیرے کی طرح تھے جو وقت کی گرد میں ہم سے بچھڑ گیا۔ جیسے فضا میں گونج دمدار

تارا ٹوٹ کر افق کی پنہائیوں میں کھو جائے.

بھیگی بھیگی آنکھوں سے اس نے خط کو ایک بار پھر پڑھا. یکلخت غصے اور رنج کے احساس سے اس کے آنسو ختم گئے.

"ڈاکٹر چچا آپ نے بھی مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کی. میں جہانگیر قدسے بھیک مانگوں اس در پر جاؤں جہاں سے پہلے دن مجھے نفرت سے دھتکار دیا گیا تھا. کیا اب اس ذلت کی کسر رہ گئی تھی. آپ نے اپنی عمر ایک بہادر سپاہی کی طرح گزاری ہے اور خدا جانے یہ ایک خیالی ہستی ہے یا کوئی ان دیکھی قوت ہے مجھے تو ہمیشہ اس پر شبہ رہا ہے میں اس سے کیسے آپکی بخشش یا مغفرت کی درخواست کروں. آپ نے ہمیشہ دوسروں کی خوشی اور راحت کو مقدم سمجھا. آپ میرے خیال میں ایک ہمدرد اور پیارے انسان کے روپ میں زندہ رہیں گے. میں آپ کو مرنے نہیں دوں گی. میں آپ کو مرنے . . . میں آپ کو—"

اس کی آواز بلند ہوئی اور ساتھ ہی آنسو اس کے حلق پر چلتے تیل کی طرح بوندوں کی طرح ٹپکنے لگے.

زندگی بھر دوسرے تجھے فریب دیتے رہے اور اب تو خود کو دھوکہ دینے لگی ہے. سچ کو جھوٹ تسلیم کرنے لگی ہے اس لئے کہ تیرے دکھ، الم پریشانی و ناخوشی پر اشکبار ہونے والی آخری آنکھ بھی بند ہو گئی.

لائبریری میں کنول کے ساتھ کلینکل سائیکالوجی کی کتاب دیکھ کر دونوں خوش تھیں۔ کنول کا خیال تھا چونکہ کتاب رضو نے ڈھونڈی ہے اس لیے وہ اپنے نام ایشو کرالے۔

"کنول مجھے اس کی ضرورت نہیں تم یہ کتاب لے لو میں فائنل ایئر کے امتحان میں شامل نہیں ہو رہی۔"

"نہیں تو میں نے پڑھائی میں کئی لڑکیوں سے زیادہ سنجیدہ دیکھا ہے پاگل تو نہیں ہوگئی ہو"

"نہیں کنول میں امتحان نہیں دوں گی میری شادی ہو رہی ہے۔"

"تمہاری شادی — مذاق نہ کرو۔"

"نہیں یہ سچ ہے مجھے اس شخص سے محبت ہے۔"

"کون ہے کہاں رہتا ہے محبت تو تم نے کبھی ذکر نہیں کیا۔"

"کئی دفعہ ذکر کر چکی ہوں۔ ابھی تو وہ ہسپتال میں ہے آج کل اپنے گھر آنے والا ہے۔"

"کیا وہ تمہارا میٹرک کیس تو نہیں۔"

"ہاں اونچی سوسائٹی نے اسے اپاہج کر کے پھینک دیا ہے۔ میں نے اس کے ڈیڈی سے بات کی تھی۔"

"کیا وہ مان گئے ہیں"

کنول کے ذہن میں اندیشے کے سانپ نے پھن پھیلایا۔ "ایک سمجھدار باپ نے کے رشتے سے کیا انہوں نے تمہیں اپنے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کی۔"

"نہیں وہ شادی پر رضا مند ہو گئے ہیں۔"

رضو بڑے اطمینان سے بولی۔

"یہ نہیں ہو سکتا رضو۔"

"سنو کنول تم اس شخص سے شادی کرو گی جو تم سے محبت کرتا ہو مگر میں اس شخص سے شادی کرونگی جسے میری اپنائیت اور خلوص کی ضرورت ہو۔ میں اس آدمی کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھاؤں گی جسے میری مدد کی ضرورت ہو گی۔"

"میرا خیال ہے تم انتہا پسند ہوتی جا رہی ہو۔"

باتیں کرتی دونوں لائبریری سے باہر آگئیں۔

کالج کے گیٹ پر کار کے ہارن کی آواز سنکر کنول نے معذرت کی۔

"بھیا میرا انتظار کر رہے ہیں۔ خدا حافظ۔"

رضو کالج سے گھر آئی عجیب سی بے کیفی اور بے چینی کا احساس تھا۔ دوپہر کو اس نے خود کھانا بنایا مگر چند لقمے کھا کر ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ بڑے غور سے اپنے عکس کو دیکھتی رہی۔

کافی عرصہ بعد اس نے رنگوں اور برش کو ہاتھ لگایا۔ کئی ماہ سے ایک تصویر ادھوری پڑی تھی۔ جس دن سے اس نے اپنے شاہکاروں کو آگ لگائی تھی ایک دفعہ بھی رنگ اور برش کو نہ چھوا تھا۔ مگر آج طبیعت کچھ آرٹ ورک کی طرف مائل تھی۔ کبھی تیزی سے اور کبھی آہستہ آہستہ اس کی مخروطی انگلیوں میں پکڑا برش کام کر رہا تھا۔ تصویر کے چہرے کے نقوش نمایاں ہو رہے تھے۔ فرش پر رنگ بکھرے تھے۔ قالین کے ڈیزائن پر بھی رنگ پھیل چکے تھے۔ مگر وہ تصویر بنانے میں مگن تھی کئی گھنٹے گزر گئے۔

شام پھیلنے لگی۔ سورج کی نارنجی کرنیں روشندان سے جھانکنے لگیں۔ تصویر کے رنگ گہرے ہوئے اسے پڑھنے کا احساس ہوا کہ شام پھیل رہی ہے۔

تصویر مکمل ہوئی تو اسے احساس ہوا جیسے اس نے کوئی جانی پہچانی تصویر بنائی ہو۔ رضوانہ کو یقین تھا کہ یہ خیال اس کے دماغ میں تصویر بنانے سے پہلے موجود نہیں تھا۔ یہ تو ایک ان دیکھا خیال تھا جو آج بجلی کے کوندے کی طرح ذہن کے افق پر چمکا تھا۔ جسے اس نے کینوس پر اتار لیا تھا۔ یہ تو ایک مکمل تصویر تھی۔

اس وقت پانچ بجے تھے جب دروازے پر دستک ہوئی۔ رضوانہ کو اس وقت کسی کا آنا اچھا نہ لگا۔ دستک دوبارہ ہوئی تو طوعاً و کرہاً اس نے دروازہ کھولا۔ کاشنی شلوار قمیض میں ملبوس شبینہ اندر آ گئی۔

"ہیلو رضو تم تو خدا جانے کس دنیا میں رہتی ہو۔ ایک دو دفعہ میں آئی مگر تمہارے دروازے پر تالا دکھائی دیا جیسے شبہ ہوا کہیں تم نے گھر نہ تبدیل کر لیا ہو۔"

"اندر آ جاؤ۔ رضو نے دروازہ کھولا تو شبینہ بولی۔ شکیب میرے ساتھ نہیں انہیں

بھی بلا لو۔"

یوں جیسے جملے کی طرح مگر بڑی اپنائیت سے وہ اندر آگئی۔ شکیب کی انگلی تھامے یاسر بھی ساتھ تھا۔ ثبینہ کے چہرے پر شفق پھیلی تھی۔ مگر شکیب کا چہرہ فکر مند سا لگتا تھا۔

ڈرائینگ روم میں وہ انہیں لے تو آئی مگر رنگ اور برش ابھی تک فرش اور قالین پر بکھرے تھے۔ ثبینہ بڑے اشتیاق سے اس کی نئی پینٹنگ دیکھنے لگی۔

"بڑا اچھوتا سا خیال ہے۔"

"شکستہ یقینی پر۔"

"میرا خیال ہے یہ آپ کی سب سے اچھی تصویر ہے۔" شکیب بولا۔

"یہ تصویر آج ہی میں نے مکمل کی ہے۔"

"کیا اس تصویر سے حقیقت کا بھی کوئی تعلق ہے۔" ثبینہ نے پوچھا۔

"ہمارے خیالات اپنے ماحول سے کافی مناسبت رکھتے ہیں۔"

رضو نے غیر واضح سا جواب دیا۔

تصویر دیکھنے کے بعد ثبینہ اور شکیب تو صوفے پر بیٹھ گئے اور رضو باتیں کرتی ہوئی بکھرے رنگ اور برش سمیٹنے لگی۔

"آپ نے ثبینہ کی امی کے انتقال پر اظہار افسوس بھی نہیں کیا" شکیب نے کہا

"کیا واقعی آپ کی امی کا انتقال ہو گیا۔"

رضو نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں رضو تم ان سے ایک بار ملی ہو۔ وہ کتنی صحت مند تھیں مگر پندرہ دن ہوئے

انہیں تیسری دفعہ دل کا دورہ پڑا اور وہ ختم ہو گئیں۔

" میں دس دن کراچی میں رہی ہوں جب میں آئی تو مجھے احساس ہوا میرے ابو بہت اداس اور تنہا سے ہیں۔"

" تمہارے ابو تو اب تنہا ہوئے ہیں مگر ہم صدیوں سے تنہا ہیں اور اب اداسی زندگی کا حصہ بن گئی ہے۔"

" تمہاری شادی ہوئی تو یہ تنہائی دور ہو جائے گی خدا کرے۔" شبینہ نے کہا۔

" ممکن ہے تنہائی کا احساس اور بڑھ جائے کون جانے۔"

" رضو سنو اس دفعہ میں نے ابا جان سے تمہارا ذکر کیا تھا وہ تم سے ملنے کے مشتاق ہیں۔"

" شبینہ تمہارے ابو کو مجھ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

" کیوں اس میں کیا برائی ہے کیا تمہیں میرے ابو سے بغیر دیکھے تعصب پیدا ہو گیا ہے۔"

" نہیں شبینہ مجھے تمہارے ابو سے کوئی رنجش نہیں پھر جس شخص کو دیکھا نہ ہو، اس سے کیا گلہ ہو سکتا ہے۔"

" یہی تو میں سوچ رہی تھی۔" شبینہ نے کہا۔

" کیا تمہاری امی نے کبھی اس بچی کا ذکر کیا تھا جو تمہاری پیدائش سے پہلے پیدا ہو کر مر گئی۔"

" ہاں کبھی کبھی امی اس کا ذکر کرتی تھیں کہ پیدائش کے وقت وہ صحت مند اور زندہ تھی مگر میرے ابو نے اسے کسی سازش کے تحت ختم کر دیا۔ صرف اس لئے کہ وہ ابو کے معیارِ حسن سے کمتر تھی، پر مجھے یقین ہے میری امی کے دل میں آخری وقت تک اس بچی کی محبت زندہ تھی۔

"محبت زندہ تھی۔"

رضو کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آئی۔

"میری امی کو ہمیشہ غلط بیانی سے نفرت رہی ہے۔"

ثبینہ کو جیسے رضوانہ کا یہ اندازِ گفتگو پسند نہ آیا ہو۔

"بیس پچیس سال پہلے ختم ہوئی محبتوں کی یاد دلوں میں زندہ رکھنے کا فائدہ کیا ہے۔"

"ہر چیز فائدے اور نقصان کا سودا نہیں ہوتی یہ تمہیں ماننا پڑے گا۔"

"میں نے تو ایک عام سی بات کہی تھی۔"

ممکن تھا کہ رضو اور ثبینہ میں کسی بات پر تلخی پیدا ہو جاتی کہ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔

دروازہ کھلا تو خلافِ توقع کنول اور اس کی امی نے گھر میں قدم رکھا اس سے پہلے تو تنا دو نا دو ہی کنول اپنی امی کے ساتھ آئی تھی۔

"آداب خالہ جان۔" رضو نے ان کے لئے دروازہ کھولدیا۔ آیئے آپکو چند اور مہمانوں سے ملاؤں۔"

رضو نے کنول اور اس کی امی کا ثبینہ اور شکیب سے تعارف کرایا۔

"بڑی خوشی ہوئی ہے آپ سے مل کر۔" ثبینہ نے مسکرا کر کہا۔

"آپ لوگ باتیں کیجئے میں ذرا چائے بنا لوں۔"

رضوانہ کچن میں گئی تو شکیب کو یاد آیا چھ بجے انہیں دفتر میں ایک ضروری میٹنگ میں جانا ہے۔ "میں سات بجے تمہیں لینا جاؤنگا چائے کیلئے معذرت کر دینا۔" یاسر صوفے کے بازو پہ سر رکھ کر سو چکا تھا۔

آپ رضوانہ کی کلاس فیلو ہیں اکثر آتی جاتی ہوں گی۔"

"مہینے میں ایک آدھ دفعہ جب ضرورت پڑے اور رضوانہ تو ہمارے یہاں بالکل نہیں آتی۔ آپ کا اکثر ادھر سے گزر ہوتا ہو گا۔" کنول نے ثبینہ سے پوچھا۔

"نہیں جی میری بھی گھر یلو مصروفیات ہیں پچھلے دنوں میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ میں دہلی گئی ہوئی تھی۔ رضو سے ملے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ سوچا آج ادھر کا چکر لگ جائے۔ میرا اس سے کسی نہ کسی بات پر کلیش ہو جاتا ہے۔"

کنول اٹھ کھڑی ہوئی: "دیکھوں تو رضو کچن میں کیا کر رہی ہے ہم نے بڑی تکلیف دی ہے۔"

کنول کے ساتھ اس کی امی بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ جب انہیں گئے کچھ دیر ہو گئی تو ثبینہ اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ سائیڈ کی میز پر رضوانہ کے نام ایک خط رکھا ہوا تھا۔ ثبینہ کے دماغ میں غیر اخلاقی سی خواہش نے سر اٹھایا۔ اس خط میں کیا ہے اسے تجسس تھا اس نے چاروں طرف دیکھا کوئی نہ تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ایک ہی نظر میں وہ خط پڑھ کر یونہی لفافے میں بند کر کے رکھ دے گی مگر ابھی اس نے خط لفافے سے نکالا ہی تھا کہ برآمدے میں آہٹ ہوئی۔ قبل اسکے کہ کوئی اندر آئے۔ ثبینہ نے جلدی سے خط اپنے پرس میں ڈال لیا۔

چوری بری بات ہے بچپن میں سیکھا ہوا یہ جملہ اب بھی اس کے ذہن میں موجود تھا۔ اور اس نے ساری عمر جہاں تک ہو سکا۔ اس بات پر عمل کیا تھا مگر آج کی چوری سے اسکی پیشانی پہ ندامت کے پسینے آ گئے۔ دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔

باورچی خانے کی بند فضا میں رضوانہ پسینہ میں نہا گئی تھی۔ چائے کی ٹرے لے کر وہ آئی اور اس کے پیچھے کنول ایک پلیٹ میں بسکٹ لے آئی۔

"معاف کرنا ثبینہ تمہیں اتنی دیر تنہا بیٹھنا پڑا۔"

"کوئی بات نہیں ۔" شبینہ نے کہا۔

"آپ کے شوہر کہاں گئے ہیں؟"

"ان کو چھ بجے ایک میٹنگ میں شامل ہونا تھا۔ انہیں جانا پڑا۔ سات بجے وہ مجھے یہاں لینے جائیں گے۔"

کنول نے چائے بنائی، اور سب کو پیش کی۔

چائے پینے کے دوران کنول اپنی امی سے مخاطب ہوئی۔

"اس کام کے لئے ہم کسی اور وقت آ جائیں گے۔"

"کوئی راز کی بات ہے کیا؟"

شبینہ مزاح سے بولی۔

"یہاں کوئی راز نہیں سارا کچھ عیاں ہے کھلی کتاب کی طرح۔ بات شبینہ کے سامنے بھی کی جاسکتی ہے۔"

شبینہ نے دل ہی دل میں فخر محسوس کیا۔ رضوانہ مس پر اعتماد کرتی ہے اسے اپنی نزدیکی دوست سمجھتی ہے۔"

کنول نے بات شروع کی۔

"تمہاری شادی کے بارے میں میں نے امی سے بات کی تھی۔ انہیں یقین نہیں آتا"

"واقعی رضوانہ تمہاری شادی ہو رہی ہے؟" شبینہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں صرف ضرورت کی بات ہے۔"

"تمہاری ضرورت۔"

شبینہ کے منہ نکل گیا۔

"نہیں جس سے شادی کروں گی اسے میری ضرورت ہے۔"

"رضو کیا یہ سچ ہے کہ وہ دماغی مریض ہے۔"

کنول کی امی نے تشویش ہوئے خیر کی تائید چاہی۔

"جی ہاں۔"

رضو کو یہ کہتے ہوئے اچانک احساس ہوا جیسے وہ انسانوں کی اس منڈی میں آگئی ہے جہاں ہر آدمی کی قیمت ہے جہاں ہر چیز پر اچھائی یا برائی کا لیبل چسپاں ہے۔ جہاں بہت سارے نیلے پیلے سرخ سبز رنگ ہیں۔ بے رنگی کو کوئی نہیں جانتا۔ اور وہ اس عدالت میں موجود ہے جہاں اس نے دنیا کے بندھے اصولوں اور قانون سے بغاوت کی ہے۔

"اس کے جی میں آیا صاف کہدے میرا آپ لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں، میں اپنا مستقبل تاریک کروں یا روشن آپ کو کیا؟"

"تم ایک دیوانے سے شادی کر رہی ہو مگر کسی دباؤ کے تحت یہ ظلم ہے یہ زیادتی ہے۔" ثبینہ رہ نہ سکی۔

"وہ جس دنیا کا کوئی رنگ نہ ہو۔ وہاں قوس و قزح کے رنگوں کی برسات کا حاصل ہے۔"

"اسے بے جا مداخلت نہ سمجھو تو میں جاننا چاہتی ہوں کیا وہ شدید دماغی مریض ہے۔"

"ثبینہ اسے تم میری ذاتی پسند کہہ لو کہ میں فطری طور پر مہم پسند واقع ہوئی ہوں خطرات سے کھیلنا اور جان جوکھم کا کام مجھے اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔"

کنول نے اس مرتبہ زبان کھولی۔

"کیا احسن صاحب نے اس شادی کی تمہیں پیشکش کی تھی۔"

"نہیں یہ تو میں نے انہیں خود آفر کی تھی۔"

کنول کی امی سوچ میں پڑ گئیں۔ اس پگلی لڑکی کو وہ اس خطرناک کھیل سے کیسے روکیں۔ یہ اگر چاہے تو میں اپنے بھانجے شاہد سے اس کی شادی کر دوں وہ کبھی کبھی کنول کی سہیلی کا تذکرہ کرتا تھا۔

"رضو تمہیں اس شادی سے کچھ نہیں ملے گا اگر تم خالی ہاتھ رہ گئیں تو۔"

"خالی ہاتھ تو میں پہلے بھی تھی اور ہوں کنول یہ نہ سمجھو۔"

"مگر ابھی تمہارے پاس اچھے خیال ہیں اگر یہ بھی چھن گئے تو۔"

"قمار خانے میں لوگ بڑے دل اور بڑے حوصلے کے ساتھ آتے ہیں۔"

ابھی کنول اور رضو کی گفتگو جاری تھی کہ باہر کار کے ہارن کی آواز آئی۔

"اچھا رضو میں چلتی ہوں۔"

تبسم یاسر کی بازؤں میں اٹھلانے لگی اور باری باری سب سے ہاتھ ملا کر چلی گئی۔

"ارے باتوں میں وقت کا احساس بھی نہیں رہا۔" کنول کی امی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔

"کافی دیر ہو گئی ہمیں اب چلنا چاہیئے۔"

دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"بہت بہت شکریہ خالہ جان آپ کے آنے کا۔ اور کنول تم سے تو کل ملاقات ہوگی

خدا حافظ۔"

ان کے جاتے کے بعد رضو کو تھوڑی دیر کیلئے افسوس ہوا کنول نے میرے ذاتی معاملے کا اپنی امی سے کیوں ذکر کیا۔

اس شب کھانا کھانے کے بعد ظاہراً اس نے اپنے آپ کو پرسکون کرنے کی کوشش کی مگر ذہن میں کئی سوچوں اور فکروں کی دھنک تھی۔ کچھ بھی ہو۔ کل میں احسن صاحب کو فوراً پتہ بتا دوں گی کہ مجھے ان کی شرط منظور ہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ایم اے کا امتحان نہیں دے گی، پھر بھی وہ دو گھنٹے تک پڑھتی رہی۔ حتیٰ کہ اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں اور وہ بتی بجھا کر سو گئی۔

ثبیتہ نے اپنی کسی اندرونی خواہش کی تکمیل کیلئے رضوانہ کا خط تو چوری کر لیا تھا۔
مگر اب گھر آ کر وہ شام کے کھانے میں لگ گئی۔ کھانے کی میز پر کافی دیر تک شکیب کے ساتھ
رضوانہ اور اسکے موجودہ رویئے کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ شکیب کا خیال تھا موجودہ
حالات اور بچپن کے حالات کی سنگینی نے اسے اذیت پسند بنا دیا ہے جسے وہ مہم پسندی
کا نام دیتی ہے۔ ورنہ آدمی ایک ذہنی مریض سے شادی کیسے کر سکتا ہے۔
"ثبیتہ وہ تمہیں اپنی دوست سمجھتی ہے تم اسے سمجھاؤ کہ اسکا مستقبل روشن ہے۔
اب وہ اچھی خاصی ہر دلعزیز آرٹسٹ ہے۔ وہ اپنے آپ کو اندھیروں کی نذر نہ کرے۔"
شکیب نے اپنے دل میں رضو کیلئے محبت کی کرن چمکتی دیکھی۔
"وہ کہتی ہے میں لکھنا اور تصویریں بنانا بھی چھوڑ دوں گی۔ خود کو زبیر کے علاج
کے لئے وقف کر دوں گی۔"
شکیب نے ثبیتہ کی بات سن کر ایک لمحے کے لئے کچھ سوچا۔

" ایسی لڑکی کو آج سے سو سال پہلے پیدا ہونا چاہیئے تھا، تاکہ یہ جو کچھ کرتی، اس کی کوئی تو قدر کرنے والا ہوتا۔ "

" آپ کا کیا خیال ہے رضوانہ جو کچھ کر رہی ہے یہ گمراہی ہے یا ایثار ؟ " ثبینہ نے کہا

" میں نہیں سمجھتا کہ احسن صاحب جیسے امیر آدمی اس ایثار کی قدر کر سکیں۔ رضوانہ کے نام کوئی جائیداد لکھ دیں۔ "

" شکیب ممکن ہے وہ دولت کی خاطر ایک دیوانے سے شادی کر رہی ہو کہ اس طرح وہ دولت مند ہو سکے گی۔ "

" رضوانہ کو میں زیادہ نہیں جانتا مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایک فنکار کیلئے دولت کبھی اتنی کشش کا باعث نہیں ہوتی۔ رضو ایسی فنکار ہے جسے دولت کبھی متوجہ نہیں کر سکی، پھر بھی زندگی میں وہ جو کچھ بھی کرے اسے راحت اور اطمینان ملے۔ شکیب نے رضو کو دعا دی۔

اپنے سونے کے کمرے میں جاتے ہوئے شکیب کو خیال آیا کہ اب اس بات کا کوئی سوال نہیں کہ رضوانہ کو کوئی خوشی یا دکھ، اس کے سسرال والے اس سے اجنبیت کا سلوک کرتے یا اپنائیت سے پیش آتے ہیں۔

"ذرا اپنے دل میں جھانک کر دیکھو شکیب میاں تم نے کونسی بھلائی یا نیکی اس لڑکی سے کی ہے۔ اس کے دل کو صدمہ پہنچانے میں تم نے کونسی کسر چھوڑی ہے؟ اسے تم نے کیا دیا ہے سوائے تلخ یادوں اور ٹوٹے ہوئے دل کی کرچیوں کے پھر بھی وہ تم سے بلند اور بہتر انسان ہے۔ اس نے تمہیں کبھی نہیں جتایا، کہ تم ہی وہ آدمی ہو جس نے اس کی زندگی کی ویرانیوں میں اضافہ کیا ہے۔ یاد کرو، یزدل انسان ... تمہارا وہ ایک

بیوی اور بچہ تھا تم نے اس سچائی کے اظہار کی جرأت نہ کی اور زندگی کے کسی موڑ پر بالکل غیر متوقع طور پر تنبیعیں سے ساری حقیقت کھول دی۔

گزری ہوئی باتیں یاد کرتے ہوئے شکیب کو تو نیند آگئی مگر شبیبہ بے چینی سے اس کے سوجانے کی منتظر تھی تاکہ رضو کے گھر سے چرایا ہوا خط اطمینان سے پڑھے اب وہ حیران تھی اس غیر ملکی نیلے لفافے میں کیا کشش تھی کہ وہ چرا ری کئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ خط اہم ہے یا غیر ضروری۔ بس یونہی غیر ارادی طور پہ وہ روزمرہ کی زندگی سے ہٹ کر کوئی کام کرنا چاہتی تھی۔ اسی لئے اس نے خط اٹھالیا تھا۔ یوں جیسے وہ رضو کی زندگی کا کوئی راز جاننا چاہتی ہو۔

ایکبار پھر شبیبہ کے دل میں ندامت کا احساس آیا۔ وہ تمہیں اپنی دوست سمجھ کر اپنے گھر آنے دیتی ہے۔ اپنی چیزیں تمہارے سامنے کھلی چھوڑ کر ادھر ادھر ہو جاتی ہے اور تم نے آج کے اس اعتماد کو فریب دیا ہے اسے آج کے واقعہ کی خبر ہوئی تو کتنا دکھ ہوگا۔

کچھ بھی ہو خط واپس کرنے سے پہلے میں اسے ضرور پڑھوں گی۔ اس میں ضرور کوئی خوبی ہے کہ میں نے اسے چرایا ہے۔ میں رضو پر کبھی بہ ظاہر نہ ہونے دوں گی کہ میں نے خط پڑھا ہے۔

خط پرس سے نکالنے سے پہلے اس نے ایک نظر شکیب پر ڈالی اور خط کھول کر بے تابی سے پڑھنے لگی۔

خط پڑھتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک رنگ آتا ایک رنگ جاتا۔ ایک لمحے کیلئے اس کے دل میں خیال آیا۔ کہیں یہ کوئی سازش نہ ہو اس کے پیارے

ابو کو پھانسنے کیلئے۔ مگر رضوانہ ایسی لڑکی نہیں لگتی۔ جو دولت کے حصول کی خاطر کوئی چال چلے بشکل سے تو وہ معصوم سی ایماندار لڑکی ہے۔ اگرچہ شبینہ کی شادی کو پانچ سال ہونے والے تھے۔ مگر اپنے ابو کی عادت اور فطرت کو وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ امی نے کئی بار اپنی پہلی بچی کا ذکر ضرور کیا تھا۔ اس کی صورت کیسی تھی یہ تو امی کو پتہ نہ چل سکا۔

اور رضوانہ کیا یہ وہ کیا تک بچی تھی جسے ابو نے اپنے معیار حسن سے رد کر کے پھینک دیا۔ ابو کیا آپ اتنے ہی پست تھے۔؟

کیا انسانی ہمدردی اور محبت کی ایک کرن بھی آپ کے دل میں نہ جاگی۔ پھر بعد میں آپ اپنے اس عمل پر کبھی نہ شرمندہ ہوئے۔ اور ڈاکٹر آذر اگر اتنے فرض شناس نہ ہوتے تو کیا رضو کی زندگی ایک رات سے زیادہ ہوتی؟

آہ ڈاکٹر آذر۔ رضو آپ کا کتنے احترام سے ذکر کرتی ہے اس کی زندگی پر ڈاکٹر چچا کی زندگی کا کتنا گہرا اثر ہے۔

پڑھنے کو شبینہ نے خط پڑھ لیا مگر اسے لاکھ کئی الجھنوں نے آگھیرا تھا۔ اسے یاسر کی سالگرہ کا دن یاد آیا۔ جب اس نے اپنی امی سے رضو کو متعارف کرایا تو دونوں نے ایک دوسری سے مل کر رسمی سی خوشی کا اظہار کیا۔ امی اپنی بیٹی کو نہ پہچان سکیں اور رضو تم نے بھی اپنی ماں کو نہ پہچانا کتنی عجیب بات ہے۔ مگر مجھے خوشی ہے کم از کم پہلی اور آخری مرتبہ تم نے امی کو تو دیکھ لیا۔

اس رات شبینہ جانے کتنی دیر تک بے خواب آنکھوں کے ساتھ اپنے بستر پر لیٹی رہی۔ شب کی ٹھنڈی ہوا اس کے بالوں سے شوخیاں کر رہی تھی۔

وہ کبھی ایک فیصلہ کرتی کبھی دوسرا۔ ایک طرف وہ سوچتی کہ اسے کچھ نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ خاموش تماشائی کی طرح دیکھتے رہنا چاہیئے۔ ورنہ اس نے زبان کھولی تو رضو اور ابا جان کی تنہائی دھند میں لپٹی زندگی میں کہیں زلزلہ نہ آجائے گا۔

اندھیرے میں اس نے تصور کرنا چاہیے کہ اس میں اور رضو میں کیا چیز مشترک ہے دونوں کے لمبے سیاہ ریشمی بال ہیں اس کے ہاتھوں کی انگلیاں موٹی اور بھدی سی ہیں مگر رضو کے ہاتھوں کی انگلیاں لمبی اور خوبصورت ہیں اس کے پاؤں گورے نہیں مگر کتنے خوبصورت ہیں۔ جیسے کسی یونانی سنگتراش نے بڑی چاہت سے تراشے ہوں۔

ثبینہ سوچ سوچ کر رضو کی شخصیت میں سے وہ باتیں تلاش کر رہی تھی جو دونوں میں مشترک ہوں۔ اسے آج رضو کوئی عظیم و برتر ہستی لگتی تھی۔ ذہین فکر مند سنجیدہ سا جیسے وہ مصائب کی بھٹی سے کندن بن کر نکلی ہو۔ رضو جب پر پہاڑ بھی گرے تو اس کی ہستی میں زلزلہ نہیں آئے گا اور ثبینہ بالو تمہاری ساری زندگی ناز و نعم میں گزری ہے تمہارے لیے تو ایک معمولی سا حادثہ بھی جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے تمہاری ہستی تو شیشے کے مرتبان کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر بکھر سکتی ہے ہاں امی جان کی موت ہی وہ حادثہ تھا جس نے تمہاری آنکھوں میں ساون بھادوں کی جھڑی لگا دی

کیا صبح میں شکیب کو بتا دوں کہ رضوانہ میری بہن ہے۔ اس کا شکیب پر کیا ردِ عمل ہو گا۔ اور رضو کے بارے میں اگر ابا جان کو بتاؤں تو انہیں خدا جانے خوشی ہو گی یا دکھ۔ مگر انہوں نے تو اپنے تصور میں پہلے دن ہی اس مکروہ صورت اور بھدے نقوش والی بچی کو ختم کر دیا تھا۔ مگر ابا جان آپ آج کی رضو کو دیکھیں تو اس میں آپ کو ایک بھی بدصورتی نہیں ملے گی، وہ کیسی ذہین اور محنتی ہستی بن گئی ہے، رات کے دو بجے ثبینہ نے کاغذ قلم سنبھالا اور اپنے ابو کو خط لکھنے لگی۔ لکھتے لکھتے کبھی اس کے دل میں ابو کے خلاف نفرت سی امنڈ آتی اور رضو سے بے پناہ

محبت اور ہمدردی کا سیلاب اس کے دل میں موجیں مارتا اس کے بس میں ہوتا تو شبینہ اس لمحے بھاگ کر رضو کے گلے لگ جاتی اور روتے ہوئے کہتی رضو میری بچی وقت نے روز اول سے ہی تم پر زیادتیاں کی ہیں مگر اب میں تم پر کوئی ظلم یا زیادتی نہ ہونے دوں گی۔ میں ہر مصیبت کے لئے تمہاری ڈھال بنوں گی۔

ابا جان

وہ بچی جسے قتل کرنے کی ذمہ داری آپ نے ڈاکٹر آذر پر ڈالی تھی وہ زندہ ہے۔ رضوانہ کے روپ میں ہمارے سامنے ہے۔ میں اس سے ملی ہوں۔ باتیں کی ہیں۔ اس نے اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر ہمیں پلائی ہے۔ یقین ہے بنک کی طرف سے آپ کو بھی ایک خط مل چکا ہو گا۔ رضو کو خبر نہیں کہ مجھ پر کتنا بڑا بھید کھل چکا ہے۔ مجھے آپ کے خط کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔

آپ کی بیٹی
شبینہ

جب رات کو وہ سوئی تو صبح کے تین بج چکے تھے۔ صبح بڑی تھکن اور کم خوابی کا اعصاب پر اثر تھا مگر اس نے پرواہ نہ کی۔ ناشتے کے بعد اس نے خط شکیب کے حوالے کیا۔ اور کہا

"ضرور پوسٹ کر دیجئے آج ۔"

"خط تو پوسٹ ہو جائے گا۔" مگر اگلا اقدام آپ کی کراچی کے لئے تیاری کا ہو گا یا پھر والد صاحب کو لاہور آنا پڑے گا۔"

"یہ ضروری تو نہیں ۔" شبینہ زیر لب مسکرائی۔

شکیب تیار ہو کر دفتر چلا گیا اور آیا یاسر کو باغ میں کھلانے لے گئی۔ تنہائی اور فراغت کا احساس ہوا تو شبینہ کے دماغ میں چیزیں صاف ہوتے لگیں۔ کل کے واقعات لمحے بھر پہلے کی باتیں لگتی تھیں۔ وہ ابھی فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ شکیب کو ابا جان کی زیادتی اور حسن کے بارے میں انتہا پسندی کے پس پشت پلنے والی المیہ کہانی سنائے یا نہ۔

شبینہ دوپہر کے کھانے کا انتظام کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ رضو کو اگر اس خط کی ضرورت ہوئی اور تلاش پر بھی اسے خط نہ ملا۔ تو کیا وہ اس پر شبہ کرے گی۔ مگر کل تو میرے اور شکیب کے علاوہ کنٹول اور اس کی امی بھی اس کے یہاں موجود تھیں۔ رضو ان پر بھی خط کے لئے شک کر سکتی ہے اور اگر سچ مچ رضو نے مجھ سے پوچھ ہی لیا تو میں کہہ دوں گی۔ مجھے تو خط کا کچھ نہیں پتہ — مگر یہ جھوٹ۔ — یہ بہتر یہی ہے کہ اس سے پہلے کہ رضو خط کے لئے فکرمند ہو شام کو میں شکیب کے ساتھ جا کر اسے خط لوٹا دوں گی۔

دوپہر کے کھانے پر شکیب نے آنے کی بجائے فون کیا۔

"میں آج دیر سے آؤں گا۔ دوپہر کو میرا انتظار نہ کرنا۔"

"کیوں نہ کروں۔" شبینہ نے بچوں کی طرح ضد کی۔

"آج صبح ہماری میڈیسن کمپنی کے جنرل منیجر کراچی سے آئے ہیں۔ مجھے آج میڈیکل ایسوسی ایشن میں ان کے ساتھ شرکت کرنی ہے۔ شام کو بھی شاید دیر سے آؤں گا تم پریشان نہ ہونا۔"

"بھلا میں کیوں پریشان نہ ہوں۔"

"اب تمہاری پریشانی سے مسائل حل تو ہونے سے رہے۔ بہرکیف میں جتنی جلدی ہو سکا آنے کی کوشش کروں گا۔"

یہ شکیب کی عادت تھی۔ جب بھی شبینہ ضد کرتی وہ انگلش بولنے لگ جاتا اور

اب بھی اس نے خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔ تو شبینہ دانت پیس کر رہ گئی۔

دوپہر کے کھانے پہ اس نے کئی قسم کی چیزیں تیار کروائی تھیں مگر شکیب کے نہ آنے پر اس نے بے دلی سے کھانا کھایا اور اپنے بیڈ روم میں جا کر لیٹ گئی اور پھر رضوانہ کے ساتھ اپنا موازنہ کرنے لگی۔ کیا رضو کو پتہ ہے کہ میں اس کی بہن ہوں کیا اسے یہ جان کر خوشی ہو گی۔ کہ اس کی۔۔۔۔۔"

قبل اس کے کہ ماضی کی باتیں سوچتی ہوئی وہ نیند کی آغوش میں چلی جائے کہ اتنے میں دروازے پر کسی نے دستک دی۔

"کون ہے؟"

اس نے تکیے سے سر اٹھایا۔

"آپ کی بھابی رضوانہ آئی ہیں آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

یاسر کی آیا نے یہ کہہ کر اس کے اعصاب پر گویا چنگاریاں سی پھینک دیں اس کی آنکھوں سے نیند غائب ہو گئی۔ چھلانگ مار کر بستر سے اتر آئی۔ رضو ایسی ہستی نہیں تھی کہ وہ صرف اسے ملنے کی خاطر چلی آتی۔

یاسر کی سالگرہ کے بعد ایک آدھ دفعہ وہ کتنے اصرار کے بعد اس کے یہاں آئی تھی۔ اس کا شاید اس راستے سے گزر نہیں ہونا تھا۔ یا پھر وہ خود جان بوجھ کر یاسر منزل میں آنے سے گریز کرتی تھی۔ اور آج بات معمولی نہیں۔ کہ رضوانہ ہمارے گھر آئی ہے۔ معاً اس کی توجہ کل کے جلائے ہوئے خط کی طرف چلی گئی۔ اس کی ایڑی پر جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ بیبیے محترمہ شبینہ شکیب آج تمہاری عقل کا امتحان ہے۔ آمد کی ملاقات کے بعد یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ آئندہ تم رضو سے ملنے کے قابل ہو یا نہیں۔

وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے سر کے بالوں کو ٹھیک کرتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی۔ اور چہرے پہ مصنوعی مسکان کا غازہ مل کر بولی۔

"اری رضوانہ تم کب آئی۔"

شبینہ نے بے تکلفی اور اپنائیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔

رضو نے بھی بڑھا دیا۔

"بیٹھو۔ میرا خیال تھا آپ سو رہی ہیں۔ ڈسٹرب کرنے پر معذرت خواہ ہوں گی۔ مگر اپنی پریشانی کے پیش نظر مجھے اس وقت آنا پڑا۔ صبح کنول سے بھی پوچھا مگر اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میرا ایک ذاتی خط کے بارے میں۔ جو کل شام تک میری میز پر تھا۔ پرس کر شبینہ نے قہقہہ لگایا۔ اور کہا۔

"ارے بلی آج صبح میں اپنا پرس دیکھ رہی تھی تو مجھے احساس ہوا کہ ایک حماقت مجھ سے سرزد ہو گئی ہے۔ ایک منٹ ٹھہرو میں ابھی آئی۔"

شبینہ بھاگ کر اپنا پرس لے آئی کل جب تم چائے بنا رہی تھی تو میں اپنے پرس کی چیزوں کی چھان بین کرنے لگی۔ اور تمہارا خط میرے کاغذات کے ساتھ آگیا۔ صبح پرس کھولا۔ تو اپنی بے وقوفی کا پتہ چلا۔ میرا خیال تھا۔ دوپہر کے کھانے پر بغیب دفتر سے آجاتی تو میں تمہارا خط واپس کر دوں گی۔ مگر ان کے جنرل مینیجر بھی آج ہی آنا تھا۔ انہوں نے دفتر سے فون کیا کہ شام سے پہلے گھر نہ آسکوں گا۔"

جوں ہی شبینہ نے پرس سے خط نکالا رضوانہ نے بے تابی سے خط لے لیا اور بولی۔

"اف میں کس درجہ پریشان رہی ہوں اس خط کے لیے گزشتہ رات سے آج دوپہر تک۔ اسی لیے اپنے ڈیپارٹمنٹ سے میں سیدھی یہاں آئی تھی۔ اچھا میں چلتی ہوں۔"

وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھیے۔ کم از کم چائے تو پیتی جاویے۔"

"پھر سہی۔ کہیں تم نے یہ خط کھولا تو نہیں۔"

"نہیں — میری عادت نہیں۔"

شبنم نے ایک بار پھر جھوٹ بولا۔

"اچھا — خدا حافظ۔"

ہفتے کی صبح دور حدِ نگاہ تک بادل چھائے تھے۔ آج دو بجے احسن صاحب نے اسے الزبیر آنے کے لئے کہا، ڈیڑھ بجے تک اسے ڈیپارٹمنٹ میں رہنا پڑا۔ آخری کلاس ختم ہونے کے بعد کنول سے اس کا سامنا ہوا۔

"ہیلو رضو۔ ہاؤ آر یو۔" اس نے بالکل رسماً انداز میں اس کا حال پوچھا۔

"ٹھیک ہوں تم سناؤ" ۔ اس نے دل میں چبھن سی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

ان چند رسمی جملوں کے بعد کنول چلتی بنی۔ رضو کو پتہ تھا۔ ان چند دنوں میں وہ کتنی بدل چکی ہے۔ شاید وہ مجھے اپنے جیسے لوگوں میں نہیں سمجھتی۔

تبھی کالج کے گیٹ سے باہر آتے ہوئے وہ اپنے آپ سے بولی۔ "زبیر صاحب دیکھ لو تمہاری خاطر کیا کیا ستم میرے دل پر سوار ہے ہیں۔ کنول جیسی دوست کے ساتھ ممکن ہے، شبینہ شکیب کو الوداع کہنا پڑے اور سب سے بڑا ستم تمہارا باپ اپنے محل کی دیواریں محفوظ رکھنے کے لئے میری زندگی کے نیچے دلدل بنانا چاہتا ہے یہ شرط ہے اور تمہاری خاطر میں یہ بھی مان لوں گی۔

اکیلی پیدل چلتی ہوئی وہ بس سٹاپ تک آئی کالج کا گیٹ پیچھے رہ گیا۔ یہ دن جو کتنے عام سے لگتے ہیں ایک وقت آئے گا، جب ان خوب صورت دنوں کی یاد آنسو بنکر آنکھوں میں چھلکے گی اور زندگی یوں ہی گزر جائے گی،

بادلوں کے باوجود فضا گرم تھی، ہوا کا کوئی بھولا بھٹکا جھونکا گزرتا تو ایک لمحے کے لئے خنکی کا احساس ہوتا۔

بس نہیں آئی تھی اس کے ہم جماعت اعجاز بٹ نے کار اس کے قریب روک دی۔

"کس قدر گرمی ہے رضو، بیٹھو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔"

"پیشکش کے لئے شکریہ۔"

اعجاز نے اصرار نہ کیا وہ چلا گیا، تھوڑی دیر کے بعد بس آئی تو رضوانہ نے شکر کیا، مگر بھری ہوئی بس تھی پھر بھی کھڑے ہونے کیلئے اس نے جگہ بنا لی۔

وہ الزبیر پہنچ گئی، اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی چوکیدار نے گیٹ کھول دیا اب وہ جیسے جانی پہچانی راہ گزر پر چل رہی تھی، اسے احساس تھا۔ کہ پیچھے کیا ہے اور آگے کیا آئے گا، وسیع برآمدے، ساگوان اور مہاگنی کے دروازے اور چاروں طرف پھیلی ہوئی اجنبی دیار کی خوشبو ہر ملک کے لوگوں کی طرح چیزوں کی بھی اپنی مخصوص خوشبو ہوتی ہے۔

اس کے دل میں خوف کھاٹ پولیا چور کی طرح چھپا ہوا تھا، مگر اب کچھ بھی ہو واپس نہیں جانا۔ جو بھی پیش آئے اس کے ذہن میں عدم کی رباعی گھوم گئی، جیسے اس کے دل کی ترجمانی کی گئی ہو۔

میں اگرچہ جا سکا نہ منزل تک
جا سے لوٹ کر نہ آؤں گا

یا یگوئوں کا روپ لے لوں گا
یا شعاعوں میں پھیل جاؤں گا

برآمدے کے پاس احسن صاحب کے سیکرٹری نے اس کا استقبال کیا۔

"کیا حال ہے رضوانہ۔"

"ٹھیک ہوں کیا احسن صاحب گھر پر ہیں۔"

"آپ ڈرائینگ روم میں بیٹھیں میں انہیں اطلاع کرتا ہوں۔"

"شکریہ۔"

سیکرٹری نے جیسے اس کیلئے باب طلسم کھول دیا۔جہاں کے گوشے گوشے میں دنیا کے نوادرات سلیقے سے رکھے تھے۔ان کے اندر اور باہر کے ماحول میں کتنا فرق ہے۔ کئی ایئر کنڈیشنڈ نے یہاں کی فضا کو بڑا خوشگوار بنا رکھا تھا۔ فضا کی خنکی اور خاموشی سے رضو کو سردی کا احساس ہونے لگا۔اسے لگتا تھا اگر اس نے زور سے سانس لیا تو فضا چونک جائے گی۔ لمحے بھر کے لئے اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اجنبیت کا احساس اس کے دل میں باقی تھا، مگر چند ایک بار یہاں آنے پر اپنی اندرونی حالت پر قابو پانے کا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اتنے میں ملازم اس کے لئے مشروب لے آیا۔ اس نے شربت ختم کیا تو احسن صاحب آ گئے۔ تو وہ بولی۔

"مجھے آپ کی شرط منظور ہے اگر آپ اس پر نظرثانی کریں تو اچھا تھا۔"

"میرے فیصلوں میں تبدیلی کی گنجائش کم ہوتی ہے۔ سناؤ زبیر کا کیا حال ہے۔"

"کئی دنوں سے ہسپتال جانے کا موقع نہیں مل سکا۔"

"شادی کے لئے تمہارا سرپرست کون ہو گا۔"

"میرا خیال ہے میری عمر میں سرپرست کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور اسی صورت

جب کہ کوئی سرپرست باقی نہ ہو۔"

"شادی کونسا وقت مناسب سمجھتی ہو۔"

"میں چاہتی ہوں جتنی جلدی ہو سکے ایک تو زبیر کو زیادہ عرصہ ہسپتال میں نہیں رہنا چاہیئے دوسرے کچھ لوگ میرے اس اقدام کو پسند نہیں کرتے وہ مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔"

"اگلا ہفتہ مناسب رہے گا۔ اہتمام معمولی سا ہو گا۔"

"مجھے منظور ہے۔"

رضوانہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"کل میرا سیکرٹری تمہارے گھر ٹائپ لیٹر دے جائے گا۔ جو کچھ ہماری طرف سے تمہارا لئے کیا جائے گا اس میں لکھا ہو گا۔ اور جو شرائط ہوں گی تمہیں پوری کرنی ہوں گی۔ وہ الگ کاغذ پر ہوں گی۔"

"بہت بہتر اب میں اجازت چاہوں گی۔"

"خدا حافظ۔"

وہ الزبیر سے باہر آ رہی تھی کہ اس نے سفید مرسڈیز میں بیگم سوزانہ احسن کو آتے دیکھا۔ چینی کی گڑیا جیسی وہ بڑی حسین عورت تھی راستے میں اس نے پہلو بچایا تو رضوانہ کو حیرانی ہوئی۔ وہ تو اسے جانتی بھی نہیں۔ راستے میں گھر آتے ہوئے اسے نہ بھوک تھی نہ پیاس نہ خوشی تھی۔ نہ اداسی۔۔ یہ کس ساحل پر میں آ گئی ہوں۔ جہاں پر احساس بے حسی کی چٹان پہ لا کر چھوڑ گیا ہے۔ کہیں مجھے یہ پچھتاوں کی منجدھار میں نہ لے جائے۔

بجز سے لوٹ کر نہ آؤں گا

یا بگولوں کا روپ لے لوں گا

عدم کے شعر کی بازگشت پھر ذہن سے ٹکرائی۔ گھر آ کر اس نے بنک کی طرف سے آیا ہوا خط ایکبار پھر پڑھا اور ڈاکٹر چچا کا خط کھونے پر پچھلے ہفتے وہ کتنی پریشان ہوئی تھی، اس خط کا شبینہ کے گھر پہنچ جانا محض اتفاق نہیں، کیا پتہ وہ تجسس کی وجہ سے اٹھا کر لے گئی ہو۔ میرا خیال ہے اس نے خط پڑھ لیا ہوگا۔

مگر اب اس سے فائدہ کیا کہ میرا باپ زندہ ہے یا مر چکا اور اگر جہانگیر قدر جیسا خود غرض اور بے حس آدمی میرا باپ تھا اس سے کیا حاصل کہ وہ میرا باپ ہے۔

نہیں مجھے اس سے انکار ہے وہ میرا باپ نہیں ہو سکتا۔ اتنا خود غرض اتنا بے حس میرا باپ تو نہیں ہو سکتا۔ جس نے آخری لمحے تک مجھے اپنی آنکھوں کا تارا بنا کر رکھا، وہ جو ایک ایماندار اور پیارا انسان تھا، جس نے ایک بھاور سپاہی کی زندگی گزاری اور ختم ہو گیا،

یہ کیسا اتفاق تھا کہ اس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ بچے کے انتظار میں گزار دیا، جب قدرت نے اسے ایک بچی دی تو وہ تھکن سے چور ہو چکا تھا، وہ کتنی جلدی جانے کا گر بجا۔

ہم اسے پسند کریں یا نہ کریں مگر ایسے ہی ہونا تھا، اب دکھ کر بدلنے کا کیا حاصل۔

اپنے گھر کا تالا کھولا تو دروازے کے اندر ایک کاغذ پڑا تھا۔ وہ اٹھا کر پڑھنے لگی،

دھنو ———!

آج شام ہمارے یہاں ایک مختصر سی پارٹی ہے تم تیار رہنا

رہنا پانچ بجے ڈرائیور تمہیں لے جائے گا۔ جی ہاں بہانہ کوئی نہ سنوں گی۔

تمہاری مخلص

ثبینہ

میں نہیں جاؤں گی۔ ثبینہ چاہے تم انتظار کرو یا نہ میرے بغیر تمہاری محفل سونی نہیں رہے گی۔ گھڑی پر چار بجے تھے۔ اگر پانچ بجے ڈرائیور کی بجائے وہ خود لینے آگئی تو اسے ٹالنا کتنا مشکل ہو جائے گا۔

"کتنی ضدی لڑکی ہے۔"

ثبینہ مجھ میں اور تم میں اصولاً کوئی قدر مشترک نہیں ہونی چاہیئے ہم دو مختلف دنیاؤں کے باسی ہیں، پیدائش سے لے کر آج تک ہماری زندگی کا ہر دن ایک دوسری کی زندگی سے مختلف گزرا ہے۔ ہاں پیدائش سے پہلے میرا اور تمہارا ایک ہی مقام اور ٹھکانہ تھا۔ مگر یہ چیز اتنی اہم نہیں ہوتی کہ تمہیں کس نے پالا۔ پڑھایا اور تربیت کی، یہ چیز زندگی میں ایک مقام متعین کرتی ہے اور اسی حساب سے رشتے بنتے بگڑتے ہیں۔

وقت تیزی سے بھاگ رہا تھا اور وہ گھر میں بکھری چیزیں اکٹھی کر رہی تھی۔ جیسے آج کہیں جا رہی ہو۔ چار مہینے بعد ویسے بھی اس بنگلے کو خیر باد کہنا ہی ہے۔ اب ایک ہفتے بعد میں چلی جاؤں گی۔

ساڑھے چار بجے اس نے باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کنگھی کرنے لگی۔ دل ہی دل میں وہ ثبینہ سے خفا تھی — دوسروں پر فیصلے مسلط کرنا مجھے پسند نہیں اور میں عزلت پسند ہو گئی ہوں تو کیوں مجھے پارٹیوں میں بلاتی ہے۔ تمہارا اسی صندا فد زبردستی کی وجہ سے

ایک دن تم سے لڑائی ہو کر رہے گی۔

نیوی بلیو رنگ سے اسے عشق تھا اور آج اس نے اپنا پسندیدہ سوٹ پہنا تھا۔ کانوں میں ننھے ننھے آویزے جھوم رہے تھے۔ ثبینہ سے وہ ہاتھ بھر اونچی تھی پھر بھی وہ اونچی ایڑی کے سینڈل پہنتی۔ ثبینہ اس سے چھوٹی ہونے کے باوجود موٹی اور بھدی ہوتی جا رہی تھی مگر اس کا چہرہ میلے پانی میں کھلے کنول کی طرح حسین تھا ویسے بھی وہ بڑی ہنس مکھ تھی۔

ہم دونوں میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ وہ یہ سوچ رہی تھی کہ دروازے پر کار کے ہارن کی آواز آئی۔ دوسرے لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔

"ارے بھئی دروازہ تو کھولو۔" وہاں تو اسے ثبینہ لینے آئی تھی رضوانہ نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

"اگر تیار ہو تو باہر آجاؤ اگر نہیں تو تیار ہو جاؤ۔"

"تیار تو ہوں۔"

رضو نے باہر نکل کر دیکھا وہ گلابی رنگ کی ستاروں والی ساڑھی میں موسم بہار کا گلاب بن کر کھڑی تھی۔

"ارے تم تو بڑی سویٹ لگ رہی ہو" وہ رضو کو دیکھ کر بولی۔

"اب بناؤ نہیں تم سے کم۔" رضو کو اس کا چمکتا ہوا چہرہ دیکھ کر ایک لمحے کے لئے احساس کمتری نے آگھیرا۔

مگر وہ سنبھل گئی۔

وہ کار میں بیٹھی تو ثبینہ سٹارٹ کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے ڈرائیور کو اس لئے نہیں بھیجا کہیں تمہارا انکار نہ آجائے۔ کہ بہت کام ہے۔"

"میں تو آ رہی تھی چاہیے تم نہ بھی آتی۔"

"آج میں تمہیں ایک ہستی سے ملاؤں گی۔" ثبینہ شرارت سے بولی۔

"کون ہے وہ۔" رضو نے اشتیاق سے کہا۔

"ہے کوئی۔ پتہ چل جائے گا۔"

"میں نا واقف آدمی سے ملنے کی قائل نہیں ہوں۔"

رضو کے چہرے پر سنجیدگی آ گئی۔

"ایک بات کہوں اگر تم برا نہ مانو۔"

کار کی رفتار پچاس میل فی گھنٹہ تھی جب ثبینہ نے یہ بات کہی۔

"اس دن تمہارا ایک خط میرے گھر چلا گیا تھا میں تم سے شرمندہ ہوں۔ وہ خط میں جان بوجھ کر اٹھا کر لے گئی تھی اور میں نے وہ تحریر پڑھ لی تھی۔ اس دن میں نے جھوٹ بولا تھا کہیں تم برا نہ مان جاؤ۔"

"ثبینہ۔" وہ پوری قوت سے بولی۔

"آج میں تمہیں اپنے ابو جان سے ملاؤں گی۔"

رضوانہ کو جیسے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے پوری قوت سے ثبینہ کے رخسار پر تھپڑ دے مارا۔ پچاس کی سپیڈ سے جاتی ہوئی کار ثبینہ کے ہاتھوں سے بے قابو ہو گئی۔ وہ جو ہمیشہ خود کو ماہر اور محتاط ڈرائیور تصور کرتی تھی۔ آج سب کچھ اس کے اختیار سے نکل گیا۔ عین اس وقت جب وہ کار موڑ رہی تھی۔ رضوانہ کے تھپڑ سے اس کی آنکھوں کے سامنے چمکتے ستارے جھلملا گئے۔ اور کار سائیڈ کے مضبوط درخت سے ایک دھماکے کے ساتھ ٹکرا کر الٹ گئی۔ ثبینہ کے ماتھے پر سکرین ونڈ کے شیشے نے گہرا شگاف تو ڈالا مگر سٹیرنگ وھیل اس کی پسلیوں کو توڑ کر اندر چلا گیا۔ ساری سیٹ ثبینہ کے خون سے

لالہ زار ہو گئی۔

دھماکے کی آواز سنکر بے شمار لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ہجوم میں سے دو آدمیوں نے بڑی مشکل سے کار کا دروازہ توڑا، اور دونوں بے ہوش لڑکیوں کو باہر نکالا ۔ اور ہسپتال فوراً پہنچا دیا۔

ایمرجنسی روم میں رضوانہ کی پیشانی اور بازو کی ڈریسنگ ہو گئی مگر ثبینہ کو اپریشن تھیٹر میں فوری طور پر پہنچانا پڑا۔ سرجن علی رعنا اپنے فرض کی ادائیگی میں بڑی عجلت کر رہے تھے۔ مگر انہوں نے سر کا گہرا زخم اور تین ٹوٹی ہوئی پسلیاں اور ڈھیر سارا بہہ جانے والا خون دیکھ لیا تھا، اور اب بھی خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اپریشن میں ممکن ہے مریضہ جانبر نہ ہو سکے اس کے لئے اس کے وارثوں کا انتظار تھا۔ ثبینہ کے پرس سے اس کے گھر کا پتہ مل گیا پندرہ بیس منٹ میں حادثے کی دل ہلا دینے والی خبر سن کر جہانگیر قدر اور تنگیب ہسپتال پہنچے، مخصوص اجازت سے انہیں اپریشن تھیٹر تک جانے کی اجازت ملی۔

ثبینہ جو گلابی ساڑھی پہن کر گھر سے نکلی تھی اب اس کی ساڑھی کا رنگ گلابی کہاں تھا، وہ تو ثبینہ کے جواں سرخ خون میں لالہ زار ہو گئی تھی۔ جیسے اس کے جسم کا سارا خون نکل گیا۔ تبھی تو وہ اپریشن تھیٹر کی لمبی میز پر ہلدی کی طرح زرد پڑی تھی، اس کی نبض بڑی مدھم تھی یوں جیسے کوئی مسافر تھکنے کے بعد اب سستا رہا ہو۔

جہانگیر قدر نے محسوس کیا جیسے اب وہ بوڑھے ہو گئے ہیں اور بڑھاپے میں ایسے حادثے آدمی کو موت کے اور بھی قریب کر دیتے ہیں۔ دو ماہ پہلے وہ اپنی زندگی کے سب سے پہلے اور بڑے حادثے سے دو چار ہوئے تھے،

بیوی کی ناگہانی موت نے ان کی ہستی کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ مگر آج ان کی بائیس ۲۲ سالہ بیٹی شبینہ کو موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا دیکھ کر انہیں اپنا برسوں پہلے کا ظلم زیادتی اور رعونت یاد آگئی۔ وہ بچی جو بالکل معصوم تھی جو چند لمحے پہلے اس دنیا میں آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں انہوں نے خود کو خدا سمجھ کر موت کی چھٹی تھما دی تھی۔ اور اب چوبیس سالوں کے بعد بنک اور شبینہ کے خط نے ان پر انوکھا انکشاف کیا تھا۔

رضوانہ زندہ ہے ابو میں اس سے ملی ہوں۔ باتیں کی ہیں؟

شبینہ نے انہیں خط میں لکھا تھا اور آج شام کی تقریب میں رضوانہ کی جہانگیر قدر سے ڈرامائی انداز میں ملاقات ہونے والی تھی۔ کون جانتا تھا۔ رضو منہ پھیر کر چلی جائے۔ اپنے باپ سے نفرت کرے۔ ان سے ہر قسم کی اجنبیت برتے۔ وہ تو ہر قسم کے ڈرامائی سبق کے منتظر تھے مگر شبینہ کی موت سے آنکھ مچولی کے بارے میں تو انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

"خدایا یہ مجھے کس عذاب میں ڈال دیا ہے میرے اگلے پچھلے گناہوں اور زیادتیوں کا حساب آج ہی کیوں۔" ان کے دل میں کسی نے سرگوشی کی شبینہ نہیں بچے گی۔

"ڈاکٹر رضا خدا کے لئے کچھ کیجئے۔ شبینہ کو دیکھ کر مجھے خوف سا لگتا ہے۔"

شکیب نے ڈاکٹر کو آتے دیکھ کر منت کی۔

"مریضہ کی حالت بے حد نازک ہے، خون زیادہ ہی بہہ چکا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"پانچ بوتل خون درکار ہے۔ مگر ہسپتال میں نہیں ہے۔"

اپریشن تھیٹر سے دونوں باہر نکلے تو نرس نے خبر سنائی،
" رضوانہ کی حالت بہتر ہے مگر وہ ابھی تک بے ہوش پڑی ہے ۔"
" کیا رضو شبینہ کے ساتھ تھی ۔" جہانگیر حیرانی سے بولے ۔
پہلے خون کا بندوبست ہو جائے تو واپس آکر ہم رضوانہ کو دیکھیں گے ۔ وہ زندہ ہے اور شبینہ کشمکش میں مبتلا ہے ۔"
جہانگیر نے تجویز پیش کی،
ہسپتال سے دونوں باہر آگئے ۔
" میرا خیال تھا یہ حادثہ شبینہ کو جاتے ہوئے پیش آیا ہے میں نے اب تک یہی سمجھا تھا، مگر میرا خیال ہے کہ شبینہ نے رضوانہ کو گھر واپس جاتے ہوئے راستے میں بتایا ہوگا کہ آج اس کی جہانگیر قدر سے ملاقات ہوگی ۔ اور رضوانہ بگڑ گئی کہ میں کسی سے نہیں ملنا چاہتی ۔ گاڑی روک لو میں اترنا چاہتی ہوں ۔
" نہیں تم ابو سے ملو گی وہ تمہیں دیکھنا تم سے ملنا چاہتے ہیں ۔"
" شبینہ میں کہتی ہوں گاڑی روک لو ۔" یوں دونوں کی تکرار میں گاڑی درخت سے جا ٹکرائی اور ایسا المناک حادثہ پیش آیا ۔ شکیب کی نگاہوں میں جیسے گزرا ہوا نظارہ آگیا ۔
" اے کاش شبینہ تم نے ڈرائیور کو بھیج دیا ہوتا ۔ وہ کس مرض کی دوا تھا ۔"
جہانگیر قدر نے کرب سے سوچا ۔
" شبینہ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو اس تین سال کے بچے کو کون سنبھالے گا ۔
نہیں، شبینہ ابھی تم نہیں مرو گی ۔ یاسر کو تمہاری ضرورت ہے، ہمیں تم سے محبت ہے ۔"

شکیب کے ذہن میں خدشات سر اٹھانے لگے۔

"شکیب تم گیٹ تک چلو میں ایک نظر رضو کو دیکھ آؤں۔"

شکیب تو آگے چلا گیا، مگر جہانگیر قدر تیز تیز قدموں سے اس طرف آئے جہاں وارڈ میں رضوانہ بے ہوش پڑی تھی۔ اس کی پیشانی اور بازو پر بندھی ہوئی پٹی دیکھ کر جہانگیر کا جی چاہا اس پیاری بچی کی پیشانی چوم لے۔ مگر انہیں احساس تھا ہوش میں آنے پر رضوانہ کی نگاہوں میں ان کے لیے کتنی نفرت ہوگی۔ وہ جو اس حسن کے پجاری کی مکروہ حرکتوں کا شکار رہی اب وہ ان کی صورت دیکھے تو کیوں۔؟

جہانگیر قدر نے پہلی بار رضوانہ کو اس وقت دیکھا جب اسے دنیا میں آئے چند گھنٹے ہوئے تھے اور اب چوبیس سال بعد وہ اسے دیکھ رہے تھے اگر بینک انہیں ڈاکٹر آذر کی تحریر نہ بھیجتا اور شبینہ اتنے یقین سے اس کے بارے نہ لکھتی تو وہ کبھی یقین نہ کرتے۔ انہیں احساس تھا، وہ بھدے نقوش والی کالی سی لڑکی اب کتنی بدل گئی ہے۔ اس کے چہرے کے نقوش خوب صورت ہو چکے ہیں یہ بات ہے یا پھر میری جاپانی حسن مر چکی ہے۔ یا پھر کئی حادثوں سے دوچار ہونے کے بعد بڑھاپے کے احساس سے ساتھ میں نے زندگی کی سب کی بدصورت سچائی کو تسلیم کر لیا ہے۔

رضوانہ بے ہوش تھی۔ مگر ایک نظر اسے دیکھ کر وہ واپس مڑے ان کا شکیب منتظر تھا۔

وہ جلدی سے پہلے ایک بلڈ بینک گئے اور منہ مانگی قیمت پر بھی انہیں بی گروپ کا خون نہ ملا۔

اس کے بعد دوسرے کے بعد تیسرے بلڈ بنک سے انہیں دو بوتل مشکل سے خون مل سکا۔

شکیب دوڑ کر ہسپتال پہنچ جانا چاہتا تھا۔ کہیں موت اس کی ثبینہ کو نہ چھین لے جہانگیر ایک مجروح دل اور تھکے جسم کے ساتھ اس کے ساتھ چل رہے تھے۔ شکیب تو خون کی بوتلیں سنبھالتا ہوا اپریشن تھیٹر کی طرف بڑھا اور جہانگیر اس کے پیچھے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔

اپریشن تھیٹر کے باہر شکیب ایک لمحے کے لئے سانس لینے کے لیے رکا — اسی لمحے سرجن علی رضا باہر نکلے۔

ان کی پیشانی پر پسینہ تھا۔

"بہت دیر کر دی اب خون کی ضرورت نہیں رہی۔"

ثبینہ تم ایسی لاوارث اور بے سر و سامان تو نہ تھی۔ تم نے ہمیں کچھ کرنے کا موقع تو دیا ہوتا۔ کیا ہم اپنے خون کا آخری قطرہ نہ تمہارے لئے بہا دیتا۔"

شکیب نے ثبینہ کی لاش پر جھکتے ہوئے سرگوشی کی

"تو ثبینہ بھی اپنی ماں کی طرح روٹھ گئی یہ ایک سزا سہی مگر اب اسے جھیلنا ہے۔"

جہانگیر قدر نے بڑے حوصلے صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا۔

شب کے گیارہ بجے ثبینہ کی لاش گھر لائی گئی۔ دیا سر نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا وہ اپنی امی کی گود میں جانے کے لئے بےتاب تھا۔ اس کی گورنس بڑی مشکل سے اسے سنبھال رہی تھی۔

جہانگیر کی خواہش تھی کہ ثبینہ کو اس کی ماں کے قریب کراچی میں دفن کیا جائے۔ مگر شکیب نے ثبینہ کی ایک دفعہ کی خواہش کے مطابق لاہور میں

کیا۔ سینکڑوں آنکھیں اس جوان مرگی پر اشکبار تھیں وہ جس کی پیدائش پر شہر کے رؤسا بلائے گئے۔ آج اس کے جنازے کے ساتھ بھی سینکڑوں آدمیوں کا جلوس تھا۔ مگر شبنم تو اب سب باتوں سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ کرب کے اس لمحے بھی اس کے چہرے پر سورج مکھی کا رنگ پھیلا ہوا تھا۔ جب شکیب نے اسے قبر کی گہرائی میں اتارا تو چاروں طرف تاریکی تھی۔

صبح آٹھ بجے کہیں جا کر رضوانہ کی بے ہوشی کا سلسلہ لوٹا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ ہسپتال میں ہے گزرے واقعات بھولی بسری کہانی کی طرح ذہن کی تختی پر ابھر آئے۔ اس کی سوچ کے شیشے پر ایک دھماکہ سا ہوا کس درجہ خوفناک حادثہ تھا اور ماتھے پر بندھی پٹی اور کندھے کا درد کتنا شدید ہے، اور کمزوری کا احساس جو میرے چاہنے کے باوجود مجھے نہیں دے رہا۔

ارے یہ تو ہسپتال ہے اس نے چاروں طرف بچھے سفید بستروں پر نظر ڈالی۔ اور یہ ہسپتال کی دوائیوں کی ملی جلی بو کیسی عجیب ہے اسے ہوش میں دیکھ کر ایک نرس قریب آئی۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔"

"میں تو ٹھیک ہوں مگر یہ سب کیا ہے۔"

"آپ کی سہیلی کی کار کا حادثہ ہو گیا تھا، آپ تو خوش قسمت ہیں زیادہ

چوٹیں نہیں لگیں مگر ثبینہ شکیب ۔"

نرس چپ ہو گئی۔

رضوبیہ تابی سے بولی "میں تو دوسری سیٹ پر بیٹھی تھی، ثبینہ ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ وہ ہمیشہ تیز کار چلاتی تھی۔ پر اس دفعہ کوئی بات ہوئی اور کار ایک بڑے درخت سے ٹکرائی۔ مجھے دھاکہ یاد ہے مجھے بتاؤ ثبینہ کیسی ہے؟"

"آپ ٹھیک ہو جائیں تو خود ہی پتہ چل جائے گا۔"

نرس بولی۔

"جھوٹی تسلی اور الجھاؤ سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔"

"ثبینہ کا آخری وقت تھا شدید ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا سے بر وقت خون بھی نہ مل سکا، اور وہ جانبر نہ ہو سکی۔"

"ثبینہ مر گئی نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔"

وہ بستر پر اچھل پڑی۔ اس چیخ نے اسے گزشتہ شام کی چیخ یاد دلا دی۔ مگر اس دفعہ تو کندھے کا جوڑا اپنی جگہ سے ہل گیا تھا۔

نرس نے اس کا ٹمپریچر لے کر دوائی کی خوراک پلائی اور آرام سے اسے لٹا دیا۔

"جہانگیر تدرا اور شکیب پر کیا گزری ہو گی۔ ثبینہ کی موت سے آپ اتنے دل گرفتہ ہو گئے ہیں کہ میرا حال بھی جاننے کی کوشش نہیں، مگر کوئی پاس نہ آئے۔ کوئی میرے لیے پھول نہ لائے، میں جب ہی چلنے پھرنے کے قابل ہوئی یہ جگہ چھوڑ دوں گی۔"

نو بجے نرس نے اسے معمولی سا ناشتہ کرایا تھوڑا سا دلیہ کھا کر وہ

بے سدھ ہو کر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر تک وہ گزشتہ شام کے بھیانک سپنے کے بارے میں سوچتی رہی اور پھر جانے کب اسے نیند آ گئی۔ وہ سو رہی تھی، جب گیارہ بجے تو جہانگیر اور شکیب اسے دیکھنے آئے۔

جہانگیر نے وارڈ کے ڈاکٹر کو خصوصی ہدایت کی کہ رضوانہ کی دوائیاں، علاج اور خوراک کا خصوصی خیال رکھا جائے۔ اس وقت تو وہ دونوں چلے گئے مگر شام کو پھر آ گئے۔ تو رضو کے بستر پہ کئی رسالے اور اخبار بکھرے ہوئے تھے۔ وہ کئی گھنٹے لیٹی پڑھتی رہی تھی۔ اور پھر رسالے ٹھکانے پر رکھنے سے پہلے ہی اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔

یہ اتفاق تھا کہ دو دن تک صبح شام شکیب کے ساتھ جہانگیر آتے رہے۔ مگر رضو کو ہر وقت سوتے ہوئے پایا۔ دونوں پہ مایوسی چھا جاتی۔ وہ دونوں اس سے کہنا چاہتے تھے۔

رضوانہ شبیبہ ہم سے روٹھ گئی ہے۔ ہمارے دل اندر سے روتے ہیں مگر ہماری آنکھیں خشک ہیں۔ اب ہماری آخری امید تم ہو۔ تم اب ہمارے دلوں کو زخمی نہ کرنا۔!

انہیں رضو سے بات کرنے کا موقع نہ ملا۔ تیسرے دن اس نے ہسپتال کے تھکا دینے والے ماحول سے بھاگ جانے ارادہ کر لیا۔ اسے گمان ہوتا تھا۔ اب پہلے دن والی کمزوری بھی نہیں اور سر میں ہتھوڑے کی ضرب ہر لحظہ نہیں لگتی۔ اور کندھے کا زخم اب پہلے دن جتنا اذیت ناک نہیں رہا۔

صبح ڈاکٹر یوسف راؤنڈ پر آئے تو وہ چھوٹتے ہی بولی۔

"مجھے یہاں سے چھٹی کب ملے گی۔ اب تو میں ٹھیک ہو گئی ہوں۔"

"آج پٹی کھلے گی تب ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔"

"مسز انجم کہہ رہی تھی کہ اب میں تقریباً ٹھیک ہوں۔ پٹی میں گھر میں کر سکتی ہوں۔ یہ بستر کسی ضرورت مند کو ملنا چاہیے۔ یہاں کونسے فالتو بستر ہیں۔"

"یقیناً ہمارے ہسپتال میں بستروں کی بے حد کمی ہے آج ڈاکٹر مرتضےٰ سے ڈسچارج ہونے کی سلپ لے لیجیے۔"

"شکریہ ڈاکٹر۔"

وہ بے تابی سے ڈاکٹر مرتضےٰ کی منتظر تھی آج وہ ذرا جلدی آ گئے — ڈسچارج سلپ لے کر اسے بڑی خوشی ہوئی۔ جیسے قیدی کو رہائی کا پروانہ مل گیا ہو۔ شکیب اور جہانگیر کے آنے سے پہلے گھر چلی جانا چاہتی تھی۔

موت اور جدائیوں کے گھاؤ وقت کے ساتھ مندمل ہو جائیں گے اور بڑا ہونے پہ یاسر بھی سمجھ جائے گا۔

چار بجے ڈیوٹی پہ موجود ڈاکٹر اور نرسوں کا ان کے حسن سلوک کی وجہ سے اس نے شکریہ ادا کیا اور ہسپتال سے باہر نکلی۔ چمکتی ہوئی دھوپ ہسپتال کی مضبوط عمارت تارکول کی سڑک سبھی کچھ ویسے ہی تھا۔

سڑک پہ آ کر اس نے ایک رکشہ لیا اور گھر آ گئی۔ دروازے کا تالا کھولا تو اس کا دل چیخ اٹھا۔

یہ اتنی خاموشی اور ویرانی کیوں ہے کوئی آواز یہاں کیوں نہیں ہے۔ کھانے کی میز پر اب بھی ایک گلاس ایک پلیٹ ایک چمچہ اور ایک چھری کانٹا رکھا ہے۔ یہاں ہر چیز ایک ہی کیوں ہے مدت گزری یہاں ایسے ہی ہو رہا ہے۔ آج تم اتنی حیران کیوں ہو۔ آج اتنا سا فاصلہ طے کیا ہے۔ اور اتنی تھک گئی ہو۔ اب عافیت اسی میں ہے کہ آرام کرو۔ ۔ ورنہ پھر

ہسپتال کا طواف ہوگا اور ہسپتال کے بستر پہ لیٹے رہنے سے کتنی وحشت ہوتی ہے۔ سارا دن چھت پنکھے کے چکر گنتے رہو یا دیواروں پر رینگتی چھپکلیوں اور مکڑیوں کی تعداد گنو۔

اسے گھر آئے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ ڈاکٹر چچا کا بوڑھا مالی اسکی خبر کے لیے آ گیا۔

"آپ کے سر پہ یہ پٹی۔" وہ تعجب سے بولا۔

"سچ پوچھو تو مالی بابا مجھے اس پٹی سے نفرت ہے یہ مجھے خود ترسی کا احساس دلاتی ہے یہ پٹی چیخ چیخ کر دوسروں سے کہتی محسوس ہوتی ہے اس ہستی پر رحم کھاؤ۔ اسے ہمدردی کی بھیک دو۔ یہ زخمی ہے اپاہج ہے۔"

"میں نے تو سمجھا آپ کسی دوسرے شہر گئی ہیں وہ ایک دفعہ ادھر آیا تھا۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں اگر آپ کہیں تو میں گھر کے اندر کی صفائی کر دوں۔"

"ضرور کر دو مالی بابا۔"

مالی صفائی میں مصروف ہو گیا تو وہ خود سے کہنے لگی۔

بابا جی اس گھر کی صفائی تو آپ کر دیں گے میرے ذہن کے جالے کون صاف کرے اور میرے دل کا آنگن اور صحن بھی پتوں سے ڈھیر ہے۔

"کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے

روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے"

مالی بابا نے اس دن بڑا کام کیا۔ گھر کی صفائی کے بعد وہ بازار گیا اور کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے آیا۔

کل سے میری بیوی یا بیٹی آپ کا کام کرے گی جتنے دن آپ صحت مند

نہیں ہو جاتیں۔ آپ کہیں گی تو کوئی آپ کے پاس رہ جائے گی۔

"نہیں فضل دین میں تم پر اور بوجھ نہیں ڈالوں گی۔ میں آج سے کچھ نہ کچھ کام کرنے کی کوشش کروں گی۔ بیکاری سے بھی تو آدمی تھک جاتا ہے۔"

"میں کل آؤں گا جو کام ہو بتا دیجیے۔"

فضل دین کو گئے ابھی آدھ گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

اب اس کے سر میں شدت کا درد شروع ہو گیا تھا۔ دکھتے سر کے ساتھ اس نے دروازہ کھولا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی وہ اس شخص سے کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں ملاقات کی توقع رکھتی تھی مگر آج اور اس وقت نہیں!

"آیئے۔" وہ بمشکل یہی کہہ سکی اور ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

جہانگیر قدر اندر آ گئے۔

(چاہنے کے باوجود رضوانہ نے ان کے لئے ڈرائینگ روم کا دروازہ کھولا

"بیٹھیے۔"

جہانگیر خاموشی سے ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

"چند ایک مرتبہ ہم تمہارا حال جاننے تمہارے پاس آئے مگر تم سو رہی تھی۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے شبینہ کا انتقال ہو گیا۔"

"مجھے آپ کی بیٹی کی موت کا بہت ملال ہے وہ ایک اچھی خاتون تھی۔"

"ہسپتال چھوڑنے سے پہلے تم نے ہمیں نہیں بتایا۔"

"اپنے ذاتی مسائل میں میں کسی کو شریک نہیں کرتی۔"

"کیا میں تمہارے لئے اجنبی ہوں۔"

"یہ پوچھنے کی بات نہیں۔"

"یہ غلط ہے رضوانہ۔"

"میں نے زندگی میں آپ کو آج پہلی بار دیکھا ہے۔"

"ہمارے درمیان ایک رشتہ ہے۔"

"انسانیت کا رشتہ۔"

"اس سے بھی بڑھ کر"

"اس سے بڑھ کر جن سے تعلق تھا وہ تو مر چکے اور ماں چاہنے والوں کی موت کا کرب بھی جھیلا جا چکا ہے۔"

"مجھے بینک کی طرف سے ایک خط ملا ہے۔ اس میں تمہارا ذکر تھا۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر آذر کی ایک تحریر کی کاربن کاپی تھی۔ اصل تحریر تمہارے پاس آئی ہو گی۔"

"معاف کیجئے جہانگیر صاحب آپ نے غلط مکان کو منتخب کیا ہے مجھے عجیب و غریب باتوں اور تجسس سے بھرپور کہانیوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

اس کے چہرے پر پتھریلا سا احساس تھا۔

"رضوانہ تم میری بیٹی ہو اور ثبینہ تمہاری بہن تھی۔"

"میرا خیال ہے ثبینہ کی موت سے آپ کا ذہن بہت متاثر ہوا ہے آپ نے سوچا ثبینہ مر گئی چلئے کسی اور لڑکی کو دلچسپ کہانی سنا دو اور بیٹی بنا لیجئے۔ جہانگیر صاحب مجھے افسوس ہے کہ وہ شخص جس نے مجھے پالا۔ بیماری میں میری دیکھ بھال کی مجھے تعلیم دلائی۔ وہ مر چکا ہے اور اس کی موت کے بعد مجھے ہرگز خواہش نہیں کہ باپ جیسا مقدس لفظ کسی اور شخص کے لئے استعمال کروں۔"

"رضو۔ یہ سچ ہے کہ تم میری بیٹی ہو ڈاکٹر آذر کی چوبیس سال پہلے کی تحریر میرے پاس ہے۔"

"ایسی دلچسپ اور حیرت انگیز خبریں اکثر اخباروں میں آتی رہتی ہیں۔ باپ نے بچپن سال کے بعد بیٹی کو پہچان لیا۔ چالیس سال کے بعد بیٹے نے ماں کو ڈھونڈ نکالا۔ آپ کی بات سن کر مجھے حیرت نہیں ہوئی۔"

"مگر ڈاکٹر آذر کی تحریر ایک حقیقت ہے"

"اگر یہ سچ ہے تو کیا اور اگر جھوٹ ہے تو کیا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا"

"قانونی نقطۂ نظر سے بیٹی ہونے کے رشتے سے تم میری جائیداد میں حصہ دار ہو۔"

"آپ کا اور میرا صرف اجنبیت کا رشتہ ہے۔"

"میرا تم سے خون کا رشتہ ہے۔"

"یہ وہ رشتہ تھا جو میرے اس دنیا میں آنے کے دو لمحوں بعد ٹوٹ گیا جب آپ نے میری صورت دیکھی اپنے الفاظ تو آپ کو کبھی نہیں بھولنے چاہئیں کہ یہ بچی میری بیوی اور میرا عکس نہیں یہ میری بیگم کے کردار کیلئے چیلنج اور میری جاہلانہ حس کے لئے ایک گولی ہے۔ میں یہ بدصورتی برداشت نہیں کر سکتا۔

یہ الفاظ تو آپ کو عمر بھر یاد رکھنے چاہئیں اس لئے کہ اس دن آپ کی زندگی کی سب سے پہلی اور آخری بدصورتی ختم کر دی گئی، زندگی سے باہر دھکیل دی گئی۔"

"صفو میں کتنا شرمندہ ہوں اپنی حماقت کا آج مجھے کتنا احساس ہو رہا ہے۔ اور آج ہم کتنے تنہا رہ گئے ہیں یکے بعد دیگرے درِشہوار کے بعد شبینہ کی ناگہانی موت میں جب سوچتا ہوں تو مجھے لگتا ہے میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی صفو انہیں تمہاری ضرورت ہے۔"

"مگر مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔"

"ہم ایک دوسرے سے مفاہمت کر سکتے ہیں اگر میری سب سے بڑی غلطی پر تم مجھے معاف کر سکو۔"

"آپ جیسے سفاک انسان کو معاف کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہیں، جنہوں نے اپنی جاپانی حس کی تسکین کے لیے دوسروں کی زندگی کو جہنم بنا دیا۔"

"رضو یقین کرو، میں کتنا شرمسار ہوں تمہیں ہماری ضرورت ہے۔"

"یہ غلط ہے کہ مجھے آپ کی ضرورت ہے آپ کو میری ضرورت ہے، کہ اب آپ تنہا رہ گئے۔ ہیں مجھے تو آپ کی اس وقت ضرورت تھی۔ جب میں پیدا ہوئی تھی۔ اور اب چوبیس سال کی عمر میں مجھے آپ سے کیا لینا۔"

"ہم واپس اس دور میں نہیں جا سکتے۔ مگر پچھلی غلطیوں اور زیادتیوں کی تلافی ہو سکتی ہے۔"

شوق ہے تو سینۂ جہانگیر قدر اس دنیا میں آپ واحد شخص ہیں۔ جن کا نام سن کر یا جسے دیکھ کر میرے دماغ میں آگ سی لگ جاتی ہے مجھے اب دل پر قابو نہیں رہتا۔ آپ میرے گھر میں آئے ہیں آپ کی مہربانی مگر میں آپ سے صرف یہ درخواست کروں گی کہ آج کے بعد آپ دوبارہ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کیجیے۔"

"نہیں رضو یہ نہیں ہو سکتا۔"

جہانگیر قدر اٹھتے ہوئے بولے۔

"اب ایسے ہی ہوگا۔"

"کیا تمہارے دل میں عفو و درگزر کی ایک بھی کرن نہیں۔"

"ہر شخص کے لیے ہے آپ کے لئے نہیں ۔"

"تم اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کر سکتی ہو۔"

"آپ نے اپنے برسوں پہلے کیے ہوئے فیصلے پر نظرِ ثانی کی زحمت گوارا نہ کی تھی یہ خرابی مجھ میں بھی ہے۔"

"رضوانہ تم مجھ سے میرے گناہوں کا حساب لے رہی ہو۔"

"میں نے کچھ نہیں لینا دینا۔ صرف یہ کہنا ہے کہ اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کریں"

"خدا حافظ رضو۔"

"خدا حافظ۔"

جہانگیر قدر نے دروازے سے باہر قدم رکھا اور چند قدم جا کر واپس مڑ کر دیکھا۔

رضو دروازہ بند کر چکی تھی۔ انہیں احساس تھا کہ یہ بند دروازہ ان کے لئے اب کبھی نہ کھلے گا۔

گھر جاتے ہوئے جہانگیر قدر اتنے دل گرفتہ کبھی نہیں ہوئے تھے ہر چند ان پر جیسے تلخی اور زہر کی تہہ چڑھ چکی تھی۔ انہیں یوں لگتا تھا جیسے ہر چیز بے مقصد و بے معنی ہو کر رہ گئی ہو اور یہ زندگی کتنی بوجھل ہو گئی ہے۔

اور —

یہ لڑکی جسے لوگ رضوانہ کہتے ہیں۔ اس نے پہلی بار انہیں شکست دی تھی، رحم و ہمدردی کی ہر درخواست مسترد کر دی تھی۔ یوں جیسے ساری زندگی پتھروں میں گزارنے کے بعد وہ خود بھی ایک پتھریلی چٹان بن

چکی ہو۔ یہ جو ایک معمولی سی حقیر لڑکی تھی، جسے مار دینے کو ڈاکٹر آذر نے گناہ سمجھا۔

کتنا اچھا ہوتا چوبیس سال پہلے میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کا گلہ گھونٹ دیا ہوتا۔ تو یہ عذاب جو اس نے مجھے دیا ہے اس کا احساس تو نہ ہوتا۔ مگر اب ۔۔۔۔

"ہم واپس نہیں جا سکتے اور جو ہو گیا اسے ہم بدل نہیں سکتے۔"

دو دن بعد رضوانہ کی شادی تھی۔ احسن صاحب زبیر کو گھر لے آئے تھے۔ آج انہوں نے رضو کو اس کا نیا گھر دکھایا۔ جہاں شادی کے بعد وہ اور زبیر رہیں گے۔ چھوٹا سا خوب صورت بنگلہ ہر قسم کے فرنیچر اور ضروری گھریلو سامان سے آراستہ تھا۔ رضو کو اس بات کی خوشی تھی کہ احسن صاحب نے اپریشن کی شرط ترک کر دی تھی۔ آج احسن صاحب کے سیکرٹری کے ساتھ اس نے شادی کے لئے زیورات اور کپڑوں کی خریداری کی۔ شام کو وہ گھر آ کر کچھ مطمئن سی تھی۔ مگر دل میں کبھی خوشی کی لہر اٹھتی اور کبھی اسے احساس ہوتا۔ جیسے زبیر سے شادی کا فیصلہ کر کے اس نے دنیا کی سب سے بڑی حماقت کی ہو۔

پانچ بجے مالی بابا آ گیا۔ تو وہ اس کے ساتھ مل کر گھر کی ضروری چیزیں اکٹھی کرنے لگی۔ غیر ضروری فرنیچر خالی ڈبے، کرسیاں اس نے مالی بابا کے حوالے کر دیں۔ وہ اس گھر کی ہر چیز چھوڑ دیتی۔ مگر اپنی کتابیں وہ ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ کلاسیکل ناول جو لوگوں کی زندگی کے واقعات، تاریخی ناولوں کے علاوہ

میڈیکل فیلڈ کی۔ ڈاکٹر آذر کی ذاتی کتابیں۔ اس نے کسی لائبریری کو دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنی کتابیں وہ ایک بکس میں ترتیب سے سکھ رہی تھی۔ مالی بابا اس کی مدد کر رہا تھا۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ مالی نے دروازہ کھولا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

" آنے کی اجازت ہے۔"

شکیب نے یاسر کی انگلی پکڑی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا بچہ تمام راستے روتا اور ضد کرتا آیا ہے۔ لسوائے ہوئے منہ والے بچے کو دیکھ کر رضو کا جی چاہا۔ دوڑ کر اس منے سے پیارے بچے کو اپنی باہوں میں اٹھا لے۔ مگر وہ اکیلا کہاں تھا۔ شکیب اس کے ساتھ تھا۔ تبھی وہ پتھر کی سنگین چٹان بن کر اپنی جگہ جم گئی۔

" آئیے۔" رضوانہ نے انہیں برآمدے میں رکھی کرسیوں پر بٹھا دیا۔

" معلوم ہوتا ہے آپ کہیں جا رہی ہیں۔"

" اس میں تو شک نہیں۔"

" میں آپ کا حال پوچھنے آیا تھا۔"

" میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

" باہر سے اچھا ہے اندر کا کون جانے۔ ہاں تمہیں چچا جہانگیر کے بارے میں کچھ اطلاع ملی۔"

" نہیں میرا ان سے کوئی تعلق نہیں، نہ ہی مجھے ان کی ذات سے کوئی دلچسپی ہے۔"

" آج دوپہر کراچی سے ان کے سیکرٹری کی تار آئی ہے خودکشی سے پہلے انہوں نے اپنی ساری جائیداد اور چیزیں تمہارے اور یاسر کے نام کی ہیں۔"

"کیا جہانگیر قدرتے خودکشی کر لی۔"

وہ بڑی حیرانی سے بولی۔

"بہت سی حقیقتیں بڑی تلخ ہوتی ہیں آج نہیں تو کل ہمیں ان کو تسلیم کرنا پڑتا ہے مجھے تو اب بھی کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شبینہ کی موت ایک بھیانک خواب ہے۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا کہ شبینہ کا یوں اچانک بچھڑ جانا اور اس بچے کا ہر وقت اپنی ماں کو یاد کرکے رونا میری تو سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں، پندرہ دن کی دفتر سے چھٹی لی ہوئی ہے مجھ سے تو کسی صورت نہیں بہلتا۔ رضوانہ اگر تم چاہو تو ہم ٹوٹے تعلق کو جوڑ لیں۔"

اس نے ڈرتے ڈرتے یہ بات کہی تھی۔ اور رضو سے کسی عجیب ردِ عمل کا منتظر تھا۔

"شکیب صاحب شیشے کے کھلونے اگر ٹوٹ جائیں اور انہیں دوبارہ جوڑا جائے تو ٹوٹے پن کی لمبی لکیریں واضح ہوتی ہیں۔"

"رضو۔ تمہیں مجھ سے محبت تھی یاد کرو۔"

"ضروری نہیں کہ محبت روگ بن کر میرے دل سے چمٹی رہے پرانے زمانے کی باتیں کون یاد رکھتا ہے۔"

"مجھے تم اب بھی پہلے کی طرح عزیز ہو۔"

"اس عنایت کے لئے شکریہ۔ میرے دل میں آپ کی محبت نے تو اسی دن دم توڑ دیا تھا۔ جس دن میرا پہلی بار آپ کی بیوی سے تعارف کرایا تھا۔ غلطی میری تھی ٹوٹے ہوئے شیشے کو ہیرا سمجھ بیٹھی۔"

"رضو۔ ایاسر کو ایک محبت کرنے والی ہستی کی ضرورت ہے وہ محبت شبینہ کی بہن ہی دے سکتی ہے۔ اسی رشتے کے سہارے میں تم تک آیا ہوں۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ رشتہ شبینہ کی موت کے ساتھ ہی ٹوٹ چکا ہو۔"

"یاسر پھر بھی تمہارا بھانجا ہے۔"

"شکیب صاحب میں اس رشتے کے لئے قطعی اجنبی ہوں۔"

شکیب صوفے سے اٹھ کر قریب آگیا۔۔ رضو کو خوف سا لاحق ہوا۔ نجانے وہ کیا کر بیٹھے۔ اسے اور کو شکیب آتے دیکھ کر وہ پریشان سی ہو گئی۔۔۔ شکیب کی آنکھوں میں ضبط کے باوجود آنسو آ گئے، وہ اس کے سامنے دوزانو ہو گیا، اور رضو کے گھٹنے کو ہاتھوں سے تھام لیا۔

"رضوانہ، ہمیں تم سے محبت ہے تم یاسر کی خاطر ہم پر رحم کھاؤ۔"

"شکیب۔۔ میں اب دیوار بن چکی ہوں اور دیواروں سے پٹخنے اور رونے کا حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ اور اب تو میری زندگی کا پروگرام ترتیب ہو چکا ہے۔"

"رضو میں اب بھی تمہاری پینٹنگ کا قدردان ہوں تم چاہو تو اپنے پروگرام میں تبدیلی کر سکتی ہو۔"

"میں یہ مشغلہ ترک کر چکی ہوں۔"

"رضوانہ۔۔ تمہارے پاس بھی دل ہے۔"

"پتھروں اور چٹانوں کے پاس دل نہیں ہوتے۔"

"رضو ظالم نہ بنو۔"

"وقت سب سے بڑا پیمانہ ہے، یہ بتائے گا کس نے ظلم کی انتہا کی۔"

"کیا میں مایوس ہو جاؤں؟ کیا تمہیں اس بچے کا بھی کوئی خیال نہیں آئیگا۔"

"میں نے کوئی امید نہیں دلائی۔ یاسر جیسے کئی بچے اپنی ماؤں سے بچھڑ چکے ہیں۔ میں کس کس کا خیال رکھوں گی۔"

رضوانہ کے لہجے میں بڑی سرد مہری تھی۔

یاسر جو کافی دیر سے مالی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے ایک تتلی کا پیچھا کرنے

کرتے تھک گیا تھا۔

کمرے میں آتے ہی بولا۔

"ابو آپ کہتے تھے میری امی کے پاس لے کر جائیں گے۔"

منے اب تم اپنی امی کو سوائے تصویر کے کہیں اور نہ دیکھ سکو گے اب سمجھ جاؤ کہ وہ مر چکی ہیں۔"

شکیب کی بجائے رضوانہ نے جواب دیا۔

وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ اور بولا۔

"تم جیسی ظالم عورت میں نے کہیں نہیں دیکھی جو ایک بچے کو تسلی نہیں دے سکتی۔"

"اپنی طرح بچے کو کب تک فریب دیتے ہو گے اسے ابھی سے حقیقت کی خبر ہونی چاہیئے۔"

شکیب اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو منے گھر چلیں۔"

رضو نے رستہ بھی انہیں روکنے کیلئے نہ کہا۔ جب دونوں باہر نکلے تو وہ بولی۔

"میرا خیال ہے آئندہ آپ مجھ سے ملنے کی خواہش نہیں رکھیں گے۔"

خدا حافظ۔"

وہ بچے کی انگلی تھامے سڑک پر ہو لیا۔ اس کے چہرے پر اداسیاں پھیلی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ اسے وہم تھا کہ شاید رضو اسے آواز دے کر روک لے گی۔ مگر دونوں چلتے ہوئے سڑک کے موڑ تک پہنچ گئے۔ رضوانہ نے کوئی آواز نہ دی۔ دونوں نظروں سے اوجھل

ہو گئے تو رضو کا دل جیسے گہرائیوں میں ڈوبنے لگا۔ ہزار کوشش کے باوجود وہ آنسو نہ روک سکی، اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

"یہ آنسو کس لئے ؟"

شبینہ — جہانگیر قدر — شکیب یا بابر کے لئے یا پھر ڈاکٹر آذر کے لئے۔ ان سینکڑوں میں وہ ایک انسان تھے یہ سب تو پتھر ہیں۔ مدتوں یہ خود بے حس پتھر بنے رہے — مگر ایک ہی حادثے کے جھٹکے نے دل و دماغ کی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا اور اب یہ دوسروں سے کہتے ہیں — کیا تمہارے دل میں ہمدردی اور محبت کے لئے جگہ ہو تو ہمیں دیدو۔ اسی لئے ان کے لئے کوئی احساس کوئی جذبہ اس دل میں باقی نہیں۔ ایک سپاٹ سا بے حسی کا چٹیل سا احساس۔

اب جہانگیر اور شکیب صاحب ہم میں کوئی قدر مشترک نہیں رہی۔ شبینہ کی دوستی اور محبت ایک شکستہ پل تھا، جس نے ہم سب کے درمیان فاصلے کم کر دیئے تھے مگر اب وہ پل ٹوٹ چکا ہے اور ... کے درمیاں وسیع خلیج حائل ہے۔ اس خلیج کو کوئی نہیں ختم کر سکتا ...

شکیب کے جانے کے بعد اسے بھولی ہوئی محبت اس کی، وارفتگی اور شوق کا خیال آ گیا۔

اور تم نے مجھے میری سادگی اور خلوص کا صلہ فریب دیا۔ اس وقت میں شکستہ سفینے پر تھی۔ اور تم اپنی دنیا میں کتنے خوش تھے، میری شکست پہ تم مسکرا رہے تھے۔ مجھے سب کچھ یاد ہے۔

اس شام وہ کھانا کھانے لگی تو اسے احساس ہوا۔ کہ آج پھر ایک پلیٹ ایک گلاس ایک چمچہ میز پہ ہے بڑی خنکی سے وہ تھوڑا

سا کھانا کھا سکی۔ اس کے ذہن میں ایک گلاس ایک پلیٹ اور ایک چمچہ جم کر رہ گیا۔ ایسے تو مدت سے ہو رہا ہے جب سے ڈاکٹر چچا بیمار ہوئے تھے۔ تب سے میں اکیلی کھانا کھا رہی ہوں۔ یہ آج ان چیزوں کا کیوں احساس اتنا شدید ہو گیا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ بستر پر جا لیٹی اور کچھ دیر تک ٹیبل لیمپ کی روشنی میں عینک لنڈن کو پڑھتی رہی پھر جانے کب اس کی آنکھ لگی کہ اسے بتی بجھانے کا بھی احساس نہ رہا۔

اگلے دن وہ کافی مصروف رہی، احسن صاحب نے صبح آنے کے لیے کہا تھا۔ شادی کے لیے ہر چند اس کی پسند سے خریدی جا رہی تھی۔ انار کلی اور مال روڈ پر خریداری کے بعد چار بجے گھر واپس آئی۔

وہ جمعے کا دن تھا جب اس کی شادی تھی۔ آٹھ بجے احسن صاحب کا ڈرائیور اسے لینے آ گیا، اور وہ بغیر کسی سوال کے کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

اس نئے بنگلے وہ دو دن پہلے بھی آئی تھی۔ مگر آج گھر میں پھول اور جھنڈیاں سجی ہوئی تھیں دروازے اور کھڑکیوں پر نیا روغن ہو چکا تھا۔ وہ گھوم پھر کر گھر کا جائزہ لینے لگی۔ مگر اتنے میں دو عورتوں نے اپنا تعارف کرایا۔

ہم زبیر کی پھوپھی ہیں "ہم تمہیں تیار کرنے آئی ہیں۔" انہوں نے رضو کو شادی کا سرخ جوڑا پہنایا۔ دوسرے کمرے سے جب وہ تبدیل کر کے کپڑے آئی۔ تو ایک عورت بولی۔

"بغیر ناپ کے سوایا ہے مگر بالکل پورا آیا ہے۔"

کپڑوں کے بعد زیوروں اور میک اپ کا سلسلہ شروع ہوا پھر انہوں نے

رضوانہ کے لمبے لمبے سیاہ چمکیلے بالوں کا بڑا سا جوڑا بنا دیا۔ سب کچھ کرنے کے بعد انھوں نے سرخ گوٹے والا ڈوپٹہ اسے اوڑھا دیا۔ ایک پھوپھی نے مخملیں تخت پہ بٹھا کر گھونگھٹ اٹھایا اور دوسری سے بولی

"اچھی لگ رہی ہے۔"

رضو اب تک مجسمے کی طرح چپ تھی۔ اس کے جی میں آیا کہ ایک بار پھر کہو۔ یہ الفاظ میرے لئے اجنبی رہے ہیں۔ آج آپ کے منہ سے سن کر مجھے یقین نہیں آتا۔

"کیا یہ سچ ہے۔"

عورتیں اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔۔ کام ختم ہو گیا۔

بارہ بجے تھوڑے سے لوگوں کی موجودگی میں اس کا نکاح مولوی نے زبیر کے ساتھ پڑھایا۔ تو اس نے نکاح کے کاغذ پر دستخط کر دیئے۔ تبھی گھونگھٹ کی اوٹ سے اس نے دیکھا۔ سیاہ سوٹ اور بلیو ٹائی میں وہ بڑا معصوم اور اچھا لگ رہا تھا۔

ان تھوڑے لوگوں کی موجودگی میں چند رسمیں ادا ہوئیں۔ یہ رسم مذہبی بھی تھی اور معاشرتی بھی۔۔ شادی میں احسن صاحب کے چند دوستوں نے زبیر اور رضوانہ کو تحائف دیئے۔ احسن صاحب نے کندن کا ایک سیٹ اور کار میاں بیوی کو دی۔

چار بجے چائے پارٹی تھی۔ لوگوں نے اسے اور زبیر کو سلامی کے پیسے دیئے تھوڑی دیر کے لئے رضوانہ کو احساس ہوا جیسے کوئی فلمساز فلم بنا رہا ہو۔ اور جو کچھ ہوا یہ سب محض اداکاری ہے۔

سات بجے جب مہمان چلے گئے تو احسن صاحب نے رضوانہ کو ہدایت کی کہ کار

ڈرائیو صرف تم کرو گی زبیر کو بھولے سے بھی نہ دینا کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو میرے سیکرٹری سے کہہ دیا کرے۔ جب احسن صاحب بھی چلے گئے تو رضوانہ کو احساس ہوا کہ زبیر تنہا ہے۔ وہ اس کے پاس چلی گئی۔

"رضوانہ کیا واقعی میری تم سے شادی ہو گئی ہے۔ یا کوئی ڈرامہ ہے۔"

"یہ سچ ہے زبیر — مجھے تم سے محبت ہے۔"

شادی کا دن خیریت سے گزر گیا۔ جو کچھ ہوا۔ اس پر رضوانہ کو ذرا بھی حیرت نہ تھی، مگر اسے خوشی اس بات پر تھی کہ اس دن زبیر کی حالت نارمل رہی۔ اگلے دن اسے بیگم احسن اور زبیر کے بھائی کا خیال آیا۔ سوزانہ یا اس کا کوئی بچہ کسی نے بھی اس شادی میں شرکت نہیں کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ احسن صاحب نے کسی کو شادی کی اطلاع دینے کی ضرورت نہ سمجھی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے بھی ایک پاگل کی شادی میں شرکت کرنا اپنی توہین سمجھی ہو۔

بات تو کچھ ضرور تھی۔ گزشتہ رات وہ بستر پر لیٹی دیر تک سوچتی رہی۔ صبح وہ جاگی تو عجیب سی تھکن کا احساس تھا۔ غسل خانے میں جا کر اس نے منہ ہاتھ دھویا، بالوں میں کنگھی کی تو کچھ تازہ دم ہونے کا احساس ہوا۔ دفعتاً ماحول کی تبدیلی کے ساتھ اسے زبیر کا خیال آیا۔ اس نے اس کے کمرے میں جھانکا وہ بستر پر بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔ گزشتہ رات اس نے کپڑے

بھی نہ تبدیل کئے گئے تھے۔ اس کی پیشانی پر بال بکھرے ہوئے تھے،

جب وہ زبیر کے کمرے سے باہر آئی۔ تو برآمدے میں خانساماں کو منتظر پایا۔

"ناشتہ تیار کروں بیگم صاحبہ۔"

"ہاں میرے لئے بنا دو۔"

ڈائننگ روم میں میز پر بیٹھی وہ آج کا اخبار دیکھ رہی تھی، جب خانساماں ناشتہ لے آیا۔ مگر ناشتہ دیکھ اس کے دل کو دھچکہ سا لگا۔

ایک پلیٹ ایک چائے کی پیالی اور ایک گلاس۔ یہ ایک ایک چیز کب تک میرے ساتھ چلے گی۔

بے دلی سے ناشتہ کر کے اس نے سوچا کل سے جس وقت زبیر جاگے۔ وہی وقت وہ ناشتہ کرے گی۔ اب وہ کھانے کی میز پہ کبھی تنہا نہیں ہوا کرے گی۔

ناشتے کے بعد اس نے گھر بھر کا سروے کیا۔ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ اس نے نوٹ کیا گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ پورٹیکو میں نئے ماڈل کی نیلی ڈالسٹن کھڑی تھی۔ اسی لمحے اس کے کانوں میں احسن صاحب کی آواز آئی۔

"کار تم چلاؤ گی۔ زبیر کو ڈاکٹر نے کار چلانے کی اجازت نہیں دی۔"

تھوڑی دیر تک وہ کار کی چھت پر ہاتھ پھیرتی رہی پھر اگلا دروازہ کھول کر وہ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گر اسے اپنی مجبوری کا احساس ہوا۔ اس نے اس لمحے کو گالیاں دیں، جب ڈاکٹر چچا نے اسے ڈرائیونگ سیکھنے کی ہدایت کی تھی۔ اور اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اسے توقع ہی نہیں تھا کہ زندگی

میں کبھی وہ کار کی مالک ہو گی۔

گھوم پھر کر اس نے کار کا اچھی طرح مشاہدہ کیا، اور فیصلہ کر لیا کہ آج سے وہ ڈرائیونگ سیکھے گی۔

اس وقت دس بجے تھے۔ جیب زبیر جاگا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، بغیر منہ ہاتھ دھوئے وہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گیا۔

رضوانہ اس کا حال پوچھ کر ایک کرسی چھوڑ کر دوسری کرسی پر جا بیٹھی۔

"آج تو میں بہت تھک گیا ہوں۔"

"کیوں خیریت تو ہے۔"

"ایک پاجی سے لڑائی ہو گئی تھی میں نے اس کا سر پھاڑ دیا۔"

"غالباً خواب دیکھا ہو گا کون تھا وہ۔"

"ایک شخص تمہیں مجھ سے چھین لینا چاہتا تھا۔ اسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔"

رضوانہ اس کے پاس کی کرسی پر آ بیٹھی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تم سے مجھے کون چھین سکتا ہے کسی کی جرأت نہیں۔ مگر ناشتے سے پہلے منہ ہاتھ تو دھو لیں۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر باتھ روم کی طرف لے آئی۔"

وہ ہدایت دیتی گئی اور زبیر ویسے ہی کرتا گیا۔ تولئے سے منہ ہاتھ پونچھ کر وہ پھر کھانے کی میز پر آئے تو ناشتہ آ چکا تھا۔

"رات میں نے ایک اور خواب دیکھا۔"

"کیسا خواب ہے۔" رضوانہ کے دیسیا کے بناتی ہوئی بولی۔

"میری تم سے شادی ہو گئی ہے۔"

"جناب یہ خواب نہیں یہ حقیقت ہے۔"

"واقعی —" وہ حیرت سے بولا۔

اتنا کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور رضوانہ کو بازوؤں میں اٹھا کر لٹو جیسے چکر دینے لگا۔

"ہائے اللہ۔۔ زبیر یہ کیا کرتے ہو۔ میں گر جاؤں گی۔" مگر اس نے ایک نہ سنی۔

جب اسے خوب چکر آ گیا تو اس نے چھوڑ دیا۔ رضوانہ نے لڑکھڑا کر کرسی کو تھام لیا۔ اور وہ فاتحانہ شان سے قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ ہنستا جا رہا تھا۔ رضو کو عرصے بعد اس کی اس جنونی ہنسی سے خوف سا آنے لگا۔ اتنے میں خانساماں دوبارہ آیا تو وہ ابھی ڈبل روٹی پر مکھن لگا رہی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا اور رضو نے کچھ کہنا ضروری نہ سمجھا۔ البتہ دوپہر کے کھانے کے لیے اس نے خانساماں کو ہدایت دی۔

شام کو زبیر کے چند رشتہ دار آ گئے۔ رضوانہ نے خوش اخلاقی سے انہیں خوش آمدید کہا۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تو رضوانہ خانساماں کو چائے کا کہنے گئی۔ جب واپس آئی تو ایک لمحے کے لیے وہ برآمدے میں ہی ٹھٹھک کر رہ گئی۔

"تم کیا جانو احسن بھائی۔ اتنی آسانی سے دام میں آنے والی نہیں۔ اس لڑکی نے ضرور کوئی چکر چلایا ہے۔"

"کچھ بھی ہو ریحانہ۔ آپا مجھے اس لڑکی سے ہمدردی ہے مجھے تو تعجب ہے کہ اس کے والدین اس کی شادی ایک پاگل سے کرنے پر کیسے آمادہ ہو گئے۔"

"دولت کی خاطر لوگ اپنا ایمان بھی بیچ دیتے ہیں۔ میں نے سنا ہے اس لڑکی کے ماں باپ مر چکے ہیں۔"

"آجکل کی اولاد ماں باپ کو کہاں خاطر میں لاتی ہے۔"

"بس اب کچھ نہ کچھ کہو آمینہ بہن ہم اس گھر میں مہمان ہیں ہمیں ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔"

رضو کے چہرے پر جسم کا سارا خون آگیا اس نے بمشکل اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پایا۔

چائے پینے کے دوران زبیر کے ماموں کی بیوی اور بہن نے بڑے تنقیدی انداز میں رضوانہ کے ذاتی حالات اور زندگی کے بارے میں سوال جواب کئے۔ ماموں کے چلے جانے کے بعد کافی دیر تک رضو بجھی بجھی سی رہی۔ مگر پھر خود کو غیر محفوظ سمجھنے کا احساس آج شدت سے جاگ اٹھا۔

پھر شام کو چھ بجے خانساماں نے آکر بتایا کہ کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔ اس نے تعارفی کارڈ سامنے رکھ دیا۔

"شکیب جلالی۔"

کارڈ دیکھ کر وہ پریشان سی ہو گئی۔ مگر بخار کی حالت میں بھی زبیر نے کارڈ میز سے ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیا۔

"شکیب جلال۔"

"یہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔"

زبیر چلایا۔

"کچھ نہیں میرا بہنوئی ہے کسی کام سے آیا ہوگا۔"

رضو نے اپنے آپ پر قابو پا کر کہا۔

"جاؤ پھر یہاں کیوں بیٹھی ہو۔"

زبیر کی بے رخی سے اس کے ذہن میں کانٹا سا چبھ گیا۔ وہ بوجھل قدموں سے باہر آئی۔

سیاہ پتلون اور سفید قمیض میں وہ کھڑا تھا۔

"آداب۔" شکیب نے کہا۔

"آج میں تمہارے گھر گیا تھا۔ مالی نے بتایا تمہاری شادی ہو چکی ہے اور تمہارا شوہر دماغی مریض ہے۔"

"WHAT SO" دھنو آگ بگولا ہو گئی۔

"کچھ نہیں میں نے سوچا تمہیں مبارک باد ہی دے آؤں۔"

"مبارک باد کے لیے نہیں آپ کسی اور مقصد کے لیے آئے ہیں آپ میرے شوہر کے ساتھ اپنا مقابلہ کرنے آئے ہیں اور مجھے یہ بتلانے کہ میں نے زبیر سے شادی کر کے حماقت کی ہے۔"

"ایمان سے یہ بات نہیں مجھے تم سے ہمدردی ہے۔"

"یہ تحفہ اپنے پاس رکھیے۔"

"میرے اس سوال کا جواب دو کہ تم نے زبیر سے شادی کیوں کی۔"

"آپ میری بھی ایک بات کا جواب دیں کہ آپ نے شبنم سے کیوں شادی کی تھی۔"

"مجھے وہ پسند تھی۔"

"تو میرا جواب بھی یہی ہے۔"

"مگر زبیر ذہنی مریض ہے۔"

"میں اپنے گھریلو مسائل میں کسی کا دخل پسند نہیں کرتی۔"

"کیا میں اجنبی ہوں؟"

"بہت دنوں سے۔"

"ہو گا البتہ۔" "پھر مجھے چلے جانا چاہیے میری موجودگی سے زبیر کے

دماغ پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔"

"اس کے بتیر ہلے دماغ پر آپ کا کیا اثر ہوگا البتہ اس کے دماغ کی خرابی کا اثر آپ پر ہو سکتا ہے۔ آئندہ یہاں آنے کے لئے آپ کو احتیاط کرنی ہوگی۔"

وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"احسن صاحب نے تمہارے نام کتنی جائیداد لکھی ہے۔"

"شکیب صاحب وہ آپ تھے، جس نے شبیہ سے اس لئے شادی کہ ڈھیروں جہیز اور دولت ملے گی کیونکہ آپ حریص انسان ہیں میں ہر جگہ کاروبار نہیں کرتی۔"

"اچھا میں چلتا ہوں تم کسی دن آنا۔"

"سمجھ لیجئے کہ آج کے بعد مجھے آپ سے ملنے کی فرصت نہیں ہوگی۔"

"دکھ سکھ میں ہمیں ایک دوسرے کا ساتھ دینا چاہیئے۔ یوں بھی بابر تمہارا بھانجا ہے۔"

"میں کسی کو اپنے سکھ دکھ میں شریک نہیں کرتی۔"

"اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

شکیب چلا گیا تو رضو یہ دیکھنے کے لئے کہ زبیر کیا کر رہا ہے دوسرے کمرے میں آئی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ دروازے کے ساتھ کان لگائے سب کچھ سن رہا تھا۔ رضو کو دیکھتے ہی وہ چلا یا۔

"کون تھا وہ بدمعاش جو تم سے عشق کرنے آیا تھا۔"

"وہ میرا بہنوئی تھا۔"

"اچھا ہوا کہ وہ چلا گیا ورنہ اس کی لاش ہی یہاں سے جاتی۔"

"ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔"

"ہاں تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں ہے" وہ بولا۔

"آؤ دوسرے کمرے میں چلتے ہیں"۔

اگلے دن صبح وہ ابھی محوِ خواب تھے کہ رضوانہ نے ثاقب کا ٹیلیفون ملایا۔

"خدا کے لئے آپ غلطی سے بھی مجھ سے ملنے نہ آئیں زبیر آپکو دشمن سمجھتا ہے۔"

"راستے میں بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔"

"للہ مجھے راستے میں بھی کبھی نہ ملانا۔ وہ تمہیں پہچانتا ہے۔"

اطلاع دیکر بھی وہ بے چین تھی۔

رضوانہ نے اپنی ساری توجہ زبیر کی دیکھ بھال میں لگا دی۔ ہر پندرہ دن کے بعد احسن صاحب ٹیلیفون پہ اس کا اور زبیر کا حال پوچھتے اور وہ زبیر کی ذہنی اور جسمانی صحت کی بہتری کی خبر سنا دیتی۔

وہ زبیر کی شخصیت کو متوازن رکھنے کی کوشش کرتی۔ اس کی بکھری ہوئی صلاحیتوں کو جمع کر کے اس میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کرتی مگر اس کی محنت پہ اس وقت پانی پھر جاتا جب زبیر کا کوئی دور دراز کا رشتہ دار ملنے کے لئے آجاتا۔ اور ایسی باتیں کرتا جس سے زبیر کو تو کچھ نہ ہوتا، مگر رضو کو یہ احساس ہوتا جیسے اس کی ہستی بھی لمحہ بھر کے لئے بکھر کر رہ گئی ہے۔

وہ کسی کو گھر میں آنے سے روکنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ ویسے بھی زبیر کی رشتہ دار عورتیں باتیں بناتیں۔

تین مہینے میں رضوانہ نے کار کی ڈرائیونگ سیکھ لی اب کبھی خریداری یا شام کو شہر کی سیر کے لئے زبیر کو لے جاتی مگر اس دن تو غضب ہی ہو گیا۔

مال روڈ پر کچھ چیزوں کی خریداری کے بعد جب وہ ایک دوکان سے باہر نکلی تو زبیر تیزی سے ایک آدمی کی طرف بڑھا اور پیچھے سے اسے دبوچ لیا۔ رضوانہ پریشان ہوگئی۔

"خدایا یہ کون بدنصیب ہوگا۔ اس نے سوچا۔ رضوانہ جلدی سے آگے بڑھی۔ اتنے میں گرد و نواح کے لوگ اکٹھے ہو گئے اور اسے زبیر سے چھڑانے لگے ادھر رضوانہ کیلئے انبنے میں سے گزرنا بہت بڑا مسئلہ تھا۔

"مجھے بچاؤ اس دیوانے سے۔"

وہ دہائی دے رہا تھا۔ رضوانہ نے ایک ہی لمحے میں شکیب کو پہچان لیا۔ بھیڑ کو چیر کر زبیر تک جا پہنچی۔ مگر وہ تو غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔

وہ زبیر پر جھپٹ پڑی۔

"چھوڑ دو اسے۔"

"نہیں میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"میں کہتی ہوں چھوڑ دو۔" رضوانہ نے اسے بازو سے پکڑ کر الگ کیا۔ شکیب کو چھوڑ کر وہ خون آشام آنکھوں سے اسے تکنے لگا۔ شکیب کا قیمتی سوٹ خراب ہو چکا تھا۔ اس کی کلائی گھڑی ٹوٹ چکی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔

بڑی مشکل سے اس نے لوگوں اور شکیب سے معذرت کی اور زبیر کو کھینچ کر کار تک لائی اور تیزی کی گاڑی آگے بڑھا یا۔

کیسی عجیب اور شرمناک صورت حال تھی۔ اب یہ سوچ کر اسے شدید ندامت کا احساس ہوا۔ مگر اس دن سے رضوانہ نے یہ سبق لیا کہ بازار یا پارک کہیں بھی زبیر کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دے گی۔ اس حادثے کو کافی دن گزر گئے پھر ایک لمحہ ایسا آیا کہ اسے جان بچانے کیلئے زبیر کی مرضی

پوری کرنی پڑی۔

موسموں کی تبدیلی کے ساتھ زبیر کی ذہنی کیفیت بگڑتی اور سنبھلتی رہی موسم بہار کے آغاز میں ہی اس پہ جنون حیوانیت اور پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ علاج ہوتا رہا۔

ہر پندرہ دن بعد ڈاکٹر الطاف آکر زبیر کو چیک کرتے اور علاج میں ضروری رد و بدل کرتے۔

کئی دفعہ وہ پہروں گم صم بستر پہ لیٹا یا کرسی پہ بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہتا۔ رضوانہ کھانے کے لئے کہہ کہہ کر تھک جاتی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتا جیسے کسی نے ان دیکھی دنیا میں گم ہو۔ بات بھی کم ہی کرتا تھا۔

رضوانہ سوچتی اتنے عرصے کی ریاضت اکارت نہ ہو جائے اور یہ شب بیداریاں رنگ نہ لائیں۔ یہ سزا جھیلوں۔ زبیر کو اکثر ہارمونیم بجانے کا شوق تھا، کئی دن تو وہ رات بھر بجاتا رہتا۔۔ اور رضو کو بھی اس کے ساتھ جاگنا پڑتا، کبھی کبھی وہ زبیر سے کسی خاص گیت کی فرمائش کر کے سنتی —

پچھلے کئی دنوں سے زبیر کی حالت کافی بہتر ہو گئی تھی۔ اس کی شخصیت میں پہلے سے افاقہ ہو گیا تھا۔

اس مرتبہ دو ماہ بعد احسن صاحب زبیر منزل آئے۔ آدھ گھنٹے تک وہ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

زبیر نے شکایت کی۔

"ڈیڈی رضو کو سمجھائیں یہ مجھے کار چلانے نہیں دیتی۔ میرا بھی تو حق ہے۔"

"حق ہے بیٹے مگر عورت زیادہ محتاط ڈرائیور ہوتی ہے۔"

"مگر آپ کی اور ممی کی کاریں تو علیحدہ علیحدہ ہیں۔"

اگلے سال میں تمہیں بھی ایک الگ کار لے دوں گا۔ اس سال میرے بجٹ میں گنجائش نہیں۔ پھر چائے کا ایک کپ پی کر وہ جانے لگے تو انہوں نے گہری تنقیدی نظروں سے رضو کو دیکھا۔ زبیر کو تو انہوں کسی کام کے لیے باہر بھیج دیا۔ جوں ہی زبیر نظروں سے اوجھل ہوا تو بولے۔

"تم" ہوں۔"

"جی ــ" وہ چڑیا کے بچے کی طرح سہم گئی۔ جیسے کوئی عقاب دیکھ لیا ہو۔

"اب سے آٹھ ماہ پہلے میں نے تمہیں آپریشن کا مشورہ اس چیز سے بچنے کے لئے دیا تھا پھر میں نے سوچا تم تعلیم یافتہ لڑکی ہو۔ محتاط رہو گی۔"

"میں شرمندہ ہوں آپ نے مجھ پہ اعتماد کیا اور میں بھرم نہ رکھ سکی۔"

"دیگر ماہرین نفسیات اور سائیکاٹرسٹ کے اس خیال سے میں متفق ہوں کہ مجرموں اور دماغی مریضوں کو شادی یا بچے پیدا کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔"

"یہ زیادتی ہے احسن صاحب۔" وہ بمشکل کہہ سکی۔

"شادی کے لئے تم نے نارمل نہیں ابنارمل شخص کا انتخاب کیا۔ یہ تمہارا فیصلہ تھا۔ اس بارے میں میں پھر بات کروں گا۔"

جب زبیر واپس آیا تو وہ جا چکے تھے۔ رضو کی ٹانگوں میں جیسے دم نہ رہا تھا۔ وہ زرد سی ہو کر بستر پہ لیٹ گئی۔

"میں یہ ظلم نہیں ہونے دوں گی۔ احسن صاحب آپ کو اپنا فیصلہ واپس لینا ہوگا۔ آپ کو کیا پتہ ہمارا بچہ نارمل ہے یا ابنارمل۔"

زبیر کو ہونے والے بچے کے بارے میں اشتیاق تھا۔ وہ بے تابی سے اس لمحے کا منتظر تھا، جب وہ اپنی آنکھوں سے اپنے بچے کو دیکھے۔ رضو کے دل میں انجانے خوف کے سائے پلتے رہے مگر تین ماہ تک احسن صاحب نے بچے کے بارے میں کچھ نہ کہا تو رضو نے سمجھا، شاید وہ بھول گئے ہیں۔ مگر وہ بھولے نہیں تھے وہ تو کسی مناسب موقع کے منتظر تھے۔

بچے کی پیدائش کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ رفعو کے دل میں عجیب غریب اور ہر چیز بے کیف سی تھی۔ سہانے خیال پل رہے تھے کبھی آنے والے دنوں کے تصور سے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا۔ اور کبھی وہ بے پناہ خوش ہوتی۔ دوسری طرف زبیر بے تابی سے کسی بچے کا منتظر تھا۔ میڈیکل چیک اپ کیلئے وہ آج ہسپتال گئی تو زبیر بھی اس کے ساتھ تھا۔ زبیر کی نظروں سے وہ ڈرتی تھی۔ جب سے شکیب والا واقعہ پیش آیا تھا وہ قدم قدم پر اس کے ساتھ رہتی کون جانے کس وقت زبیر کسی کو نقصان نہ پہنچا دے۔

ہسپتال میں وہ ایک شریف شوہر کی طرح رضوانہ کے ساتھ تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے زبیر کو اپنے ساتھ دیکھ کر اسے فخر سا محسوس ہوا۔

ڈاکٹر الطاف نے بتایا کہ اسی مہینے ڈلیوری ہو جائے گی۔ رضوانہ نے تو منہ دوسری طرف کر لیا مگر زبیر ڈاکٹر کے نزدیک جا کر بولا۔

" ابھی کیوں نہیں مجھے ابھی بچہ چاہیے۔"

"کیا مطلب ہے۔" ڈاکٹر چونکا۔

"جن باتوں کا پتہ نہ ہو یونہی دخل نہ دیا کرو۔" رضو نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر آ گئی۔

"ڈاکٹر الطاف کیا سوچیں گے، آپ کیسے بے تکے آدمی ہیں، ہر کام وقت پر ہوتا ہے۔ سارا راستہ زبیر چپ رہا۔ مگر گھر جا کر زبیر نے سب سے پہلے ڈیڈا س کا ٹیلیفون ملایا۔

"سنیئے ڈیڈی ڈاکٹر نے کہا ہے بچہ اسی مہینے ہو جائے گا۔"

قبل اسکے کہ ڈیڈی کچھ کہیں خبر سنا کر وہ فون رکھ چکا تھا۔

رضو کا جی چاہا کہ اسے گالی دیدے۔

کچھ دنوں سے اس کی طبیعت بڑی بوجھل سی تھی ایک بوجھ سا سینے پر تھا، یوں جیسے دور دراز کا سفر کر کے آئی ہو۔ کوئی چیز کھانے کو اس کا جی نہ چاہتا اعصاب پر ایک غنودگی سی طاری تھی۔ اور زبیر کا یہ عالم تھا، کہ اس کی طاقت کی دوائیاں اور کھانے کا ہر وقت خیال رکھتی تھی۔

ایک دن تو اس نے شوخی سے رضو کے پیٹ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے۔"

"فضول مت بولو۔"

"فضول نہیں۔ ایمان سے۔ یہ تو کسی کا سر لگتا ہے کافی بڑا سر ہے۔ البتہ نظر نہیں آتا۔"

"زبیر مجھے پریشان نہ کرو۔"

رضو کی بات سن کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اس واقعے کو دس دن ہی ہوئے تھے کہ ایک شام ڈیڈی گھر آئے اور آتے

ہی ایک تجویز پیش کی۔

"زبیر تمہاری صحت یہاں کچھ ٹھیک نہیں میرا خیال ہے تم کچھ دن مری گزار آؤ۔"

"مگر میں تو نہیں جا سکتی۔"

رضو نے زبان کھولی۔

"تمہارے جانے کی ضرورت نہیں تم یہاں آرام کرو، میرا سیکرٹری چند دنوں کیلئے مری جا رہا ہے۔ زبیر اس کے ساتھ جا کر ساتھ ہی واپس لاہور آجائے گا۔"

"نہیں ڈیڈی میں رضو کو یہاں اکیلا نہ چھوڑوں گا۔"

رضو کو غرور سا ہوا کہ زبیر کو اس کا کتنا خیال ہے۔

ڈیڈی نے جیب سے طیارے کی ٹکٹ نکال کر میز پہ رکھ دی تمہاری بنڈی ٹکٹ کے لئے ریزرویشن ہو چکی ہے۔ کل صبح تیار ہو جانا۔ آب و ہوا کی تبدیلی سے تمہاری صحت اچھی ہو جائے گی۔

رضو کا خیال رکھنے والے یہاں کئی لوگ موجود ہیں اور ڈاکٹر الطاف کے ہوتے ہوئے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

رضو چلا کر احتجاج کرنا چاہتی تھی۔ "زبیر تم میرے دکھ درد کے ساتھی ہو، اپنے باپ سے کہہ دو کہ تم مری نہیں جاؤ گے۔"

"میرا دل تو نہیں چاہتا ڈیڈی ۔۔۔ آپ کا اصرار ہے تو میں چلا جاؤں گا۔" زبیر نے مجبوراً کہا۔

احسن صاحب چلے گئے اور زبیر نے رضو کی مدد سے رات کو اپنے اٹیچی کیس میں ساتھ لے جانے والی ضروری چیزیں اور کپڑے رکھے۔

زبیر کے جانے سے پہلے وہ کہنا چاہتی تھی۔" زبیر اگر پائین کے درختوں کے سائے لمبے ہو جائیں اور زرد پتے شاہراہوں پر بکھرنے لگیں تو سمجھنا تمہارے بچے کو کچھ ہو گیا ہے ۔ اگر سنساتی ہوئی ہوائیں تمہارے کانوں میں سرگوشیاں کریں اور بھورے بادل پہاڑی کے دامن پہ جھک جائیں اور فضا کہر سے دھندلی ہو جائے تو گھر جلدی آ جانا، مجھے تمہارے قدموں کی آہٹ کا انتظار رہے گا، دیر نہ کرنا۔"

زبیر کے جانے کے بعد شب بھر وہ سو نہ سکی، صبح وہ بڑی تھکن محسوس کر رہی تھی، دو قدم چلنا محال ہو گا، جاتے جاتے زبیر کا وعدہ یاد آیا۔

" میں جلدی آؤں گا چیل کی طرح اڑ کر۔"

" خدا حافظ۔"

آنکھوں میں مچلتے آنسوؤں کے ساتھ اس نے کہا اور ڈیڈی کا سیکرٹری اسے ساتھ لے گیا۔

زبیر کو گئے دو دن ہو گئے رخا لنا ماں سے ڈیڈی نے رضو کا خصوصی خیال رکھنے کی ہدایت کی تھی، کیونکہ رضو کے دل میں وسوسہ سا تھا کہ کہیں یہ بچہ اپاہج نہ ہو ذہنی مریض نہ ہو کہیں سننے اور دیکھنے کی قوت سے محروم نہ ہو اور اگر بس بچے کا رنگ گورا نہ ہوا تو اگر بچے کا رنگ . . .

وہ پوری قوت سے چلا پڑی

" نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔"

پھر اسے ڈاکٹر حیا کی زبانی سنا ہوا واقعہ یاد آ گیا۔

پچھلی دفعہ میری جگہ بیمار دوشیزہ تھی اور اس بچے کی جگہ میں تھی میں جو وقت کی دھول میں آ کی پڑی ہوں، میرے چہرے پر پہلے ہی سنجیدگی کی

پڑ گئی ہیں۔ اگرچہ میرے بال اب بھی ویسے ہی ریشمی اور ملائم ہیں۔

زبیر کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم اس کھلے دروازے سے آجاؤ۔ اب جب کوئی پہرہ دار نہیں۔ تمہاری آنکھوں میں میرے لئے پیار کی شمع جلتی ہوا ور تم اپنے مضبوط ہاتھوں سے میرے مٹی کے ڈھیر جیسے بکھرے جسم کو سمیٹ لو میں جو اپنے سینے پر طوفانی گلیشیر محسوس کر رہی ہوں۔ تم قریب آجاؤ تو یہ برف کا ڈھیر جو ہر سال بلند سے بلند تر ہوتا گیا تھا آج تمہارے ہاتھوں کی حرارت سے پگھل کر میرے وجود کو ہلکا کر دے۔

مگر تمہارے آنے کی جو خوشی ہے وہ آج میرے نصیب میں نہیں۔ اس نے مایوسی سے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ تبھی اس کے پہلو میں شدت کا درد اٹھا اور وہ بے سدھ سی نڈھال ہو گئی۔ ڈاکٹر اور نرسوں نے اس کے چہرے پر پھیلی زردی دیکھ ایک دوسری سے سرگوشی کی۔

کئی عورتیں پہلے بچے کی پیدائش پر خوفزدہ ہو جاتی ہیں۔

تبھی اس کے سامنے تاریکیوں کا ایک پردہ تن گیا۔ ہاتھ پاؤں پہاڑوں کی طرح بے جان سے ہو گئے، کئی ہاتھ اس کی طرف بڑھے۔ پسینے سے اس کا سارا جسم شرابور ہو گیا۔

کتنے ہی لمحے کے لئے رضوانہ جسم کو کوئی حرکت نہ ہوئی۔ وہ جیسے شعور کی موت مر چکی تھی، ایسی خاموشی تھی جو صرف قبر کی گہرائیوں میں روح کی جدائی سے پیدا ہوتی ہے۔

بے حد تکلیف اور خوشی کے غیر معمولی لمحے یادوں کی تختی پر یوں نقش ہو جاتے ہیں جیسے پتھر کے قلم سے لکھی تحریریں۔ تبھی کائنات میں ایک بچے کی چیخ سے چونک گئی۔ خاموشی کا طلسم ٹوٹا اور اسے احساس ہوا اس کا وجود

ممودی چٹان سے گر کر زخمی ہوگیا تھا۔ اس پر اس کی چیخ نے موسم بہار کی خنک پھوار ڈال دی ہے۔

پھر چیخ دور ہوتی گئی۔ رضو نے اپنا بازو پھیلا دیا۔ میرا بچہ مجھے دے دو۔ یہ میرا ہے۔ بے حد کمزوری کی وجہ سے اسے گلوکوز لگایا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ اسے اپنے اردگرد کی دنیا کا مکمل شعور ہونے لگا۔

سسٹر صبیحہ نے اسے حرکت نہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔ کہیں DRIP کی سوئی اپنی جگہ سے نہ کھسک جائے۔ ہسپتال میں آکر انسان کتنا مجبور ہو جاتا ہے۔

"آپ کا بچہ بہت خوب صورت ہے۔"

سسٹر صبیحہ نے جیسے اسے دنیا کی سب سے بڑی خوشخبری سنائی۔ وہ لفظ جسے سننے کے لئے وہ عمر بھر ترستی رہی۔ کبھی کسی نے بھولے سے یہ نہ کہا تھا۔

"رضو تم خوب صورت ہو۔"

تلخ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی۔ اگر تم خوبصورت ہوتی تو اس دھرتی پر کوئی نہ کوئی شخص اس سچائی کا اعتراف کر لیتا اور تو اور ہوشمند لوگوں کے مقابلے میں زبیر نے کبھی نہ کہا تھا۔ "رضو تم حسین ہو۔"

سسٹر صبیحہ تم کتنی عظیم ہو۔ تم نے میرے ڈوبتے وجود کو گہرے پانیوں سے نکالا ہے۔ میں اب زندہ رہوں گی۔ اس خوبصورت بچے کیلئے جو میرا اپنا ہے ہاں زبیر کا بھی۔ مگر اسے کیا پرواہ اسے خیال ہوتا تو کیا وہ مری کی سیاحت کے لئے جاتا۔ مگر احسن صاحب کا تحکمانہ انداز وہ کیسے انکار کر سکتا تھا۔

"سسٹر تم نے میرا بچہ دیکھا ہے۔" وہ اشتیاق سے بولی۔

"ہاں میں ابھی دیکھ کر آئی ہوں۔ بچے کے پھیپھڑوں میں کچھ خرابی ہے اسے آکسیجن سلنڈر لگایا ہوا ہے۔"

دوپہر کو وہ بہت مضطرب اور مشتاق تھی کوئی اس کے بچے کو اٹھا لائے وہ صرف ایک نظر اپنے جیتے جاگتے بچے کو دیکھنا چاہتی تھی اور اگر اس گلوکوز کی بوتل کی زنجیر اس کے پاؤں میں نہ ہوتی تو کیا وہ گرتے گرتے جاکر اپنے بچے کو نہ دیکھ آتی۔

"یہ بوتل شام کے پانچ بجے ختم ہو گی۔"

سسٹر خالدہ کہہ رہی تھی۔

"آپ کا بیٹا تو بہت صحت مند اور پیارا بچہ ہے۔"

سسٹر صبیحہ کے بعد خالدہ نے گویا اس سچائی کی تائید کر دی۔

پھر کئی گھنٹے تک اس پر غنودگی سی طاری رہی۔ اس وقت دن کے دو بجے تھے، جب اس کی آنکھ کھلی۔ سسٹر خالدہ ڈیوٹی پر تھی۔

"احسن صاحب آپ کو دیکھنے آئے تھے۔"

"اچھا۔ مجھے جگا دیا ہوتا۔"

"نہیں مریض سویا ہو تو ہم اسے بے آرام نہیں کرتے۔"

"اچھا سسٹر مہربانی کر کے دیکھ آؤ، میرا بچہ کیسی حالت میں ہے۔"

سسٹر خالدہ جب واپس آئی تو اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے خالی تھا۔ وہ جھک کر رشوانہ کا بخار دیکھنے لگی۔

"بتاؤ نہ مجھے پریشانی لاحق ہو گئی ہے اگر تم یہ سوئی میرے بازو سے نکال لو تو میں خود اپنے بچے کو دیکھ آؤں۔ میں نے تو اپنے بچے کا نام بھی سوچ لیا ہے۔ تم بھی کہتی ہو وہ خوبصورت بچہ ہے۔ میں اس کا یوسف نام رکھوں گی۔"

"یوسف۔" خالدہ نے دوہرایا۔ "بہت پیارا نام ہے مگر یہ نام اپنے دوسرے

بچے کا رکھیں "

" دوسرے بچے کا۔ کیوں ؟ ۔" رضوانہ نے حیرت سے پوچھا۔

" یہ یوسف تو ختم ہو چکا ۔"

" میرا یوسف نہیں تم جھوٹ کہہ رہی ہو۔" وہ چلائی۔

" مجھے افسوس ہے کہ گھنٹہ بھر تک ڈاکٹر ملم الطاف اور ڈاکٹر ملر نفضے کوشش کرتے رہے کہ بچے کو زندہ رکھا جائے مگر احسن صاحب نے تحریری طور پر لکھ کر دیدیا کہ بچے کو آکسیجن دینا بند کر دیا جائے، ہمیں یہ بچہ نہیں چاہیے ۔"

تو کیا ڈاکٹر نے ان کی بات مان لی ۔"

" مناسب وجوہات کی بنا پر "

" احسن صاحب آپ تو جہانگیر قدر سے بھی سخت دل اور ظالم نکلے آپ کے ظالمانہ منصوبے کی راہ میں زبیر نہ آئے، اسی لئے آپ نے اسے میری سیاحت کیلئے بھیجدیا۔ زبیر کو کتنا دکھ ہوگا، دیوانگی اس کیلئے تو پناہ گاہ ہے مگر میرا آخری ٹھکانہ بھی آپ نے اجاڑ دیا، دلداروں کے پیچھے رہنے والوں کے سینے میں پتھر کے دل ہوتے ہیں، یہ میں کیا جانتی تھی۔

میرا بچہ نارمل ہوتا یا ابنارمل، یہ الگ میری زندگی کا تحفہ، آپ کے محل کی تو ایک دیوار میں بھی دراڑ نہیں پڑتی تھی، آپ کے دونوں بیٹے نو بہار داں اور عادل زندہ سلامت تھے۔

آپ کو ان کی فکر کرنی چاہیئے آپ کا پہلا وار خالی گیا، جب آپ نے مجھے اپریشن کا مشورہ دیا، مگر اس چھوٹی ناکامی کے بعد آپ نے اہم کامیابی حاصل کی۔ اور میرے دل پر جو زندگی کے پچھلے حادثات اور آلام کا دھواں چھایا تھا۔ آپ نے اس میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ اور میرے برسوں پرانے دکھ آج پھر تازہ ہو گئے ہیں۔

جہانگیر قدر نے تو اپنی بیوی کے وقار اور اپنی ذاتی پسند کی خاطر اپنی جگہ ڈاکٹر آذر کو اختیار دیا کہ وہ چند گھنٹے پہلے دنیا میں آنے والی بچی کی زندگی کا فیصلہ کرے۔ مگر آپ نے تو آکسیجن سلنڈر علیحدہ کرا کر اس بچے کو اپنے سامنے مرتے دیکھا۔ آپ کا دل نہ پگھلا۔ میں کس پتھر کے دلیس میں آگئی ہوں۔ جہاں احساس سے خالی پتھر کے دل ہیں۔

اور یہ بات کنول نے بھی مجھے کہی تھی۔

"رضوانہ کہیں تم الزبیر کی وسیع راہداریوں اور چاندی کی گلیوں میں راستہ نہ بھول جاؤ۔ ہم تمہارے ہیں۔ رضو تمہاری تکلیف سے ہمارا دل دکھے گا۔"

اتنی بڑی دنیا میں کنول کے بعد شکیب نے اسے آنے والے حادثوں سے بچانے کے لئے اپنی باہوں کی دیواریں بنا دی۔ رضو ہم تمہیں آگے نہیں جانے دیں گے۔ آگے تاریکیاں اور وسیع کھائیاں ہیں۔ کہیں تمہاری مہم جو فطرت کو نہ معلوم منزلوں کا اژدہا نہ نگل جائے ہم تمہارا انتظار کریں گے۔ ہم نے تم سے آج محبت کی ہے کل بھی یہ محبت ہمارے دل اور آنکھوں میں قطب جنوبی کے ستارے کی طرح اپنی تمام ترضیاؤں کے ساتھ تمہارے پیچھے تمہارا انتظار کرے گی۔"

"میں جن راہوں کو چھوڑ دوں ان پر واپس نہیں جاتی۔"

اسنے تفاخر سے کہا تھا، مگر آج تین دن بعد بھی ہسپتال والوں نے اسے گھر جانے کی اجازت نہ دی تھی۔

وہاں تو ڈاکٹروں، نرسوں اور مریضوں کی موجودگی میں وہ اپنے آنسوؤں پر پہرہ دیئے بستر پر لیٹی رہی، مگر جب تھکے دن گھر آکر وہ اپنے بستر پر گر کر

بچوں کی طرح رونے لگی۔

اس وقت شام کے چھ بجے تھے جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، اس نے اٹھ کر ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔

"میں احسن بول رہا ہوں تمہاری طبیعت کیسی ہے۔"

"باہر سے ٹھیک ہوں اندر سے خدا جانے۔"

"اب رونے دھونے کی ضرورت نہیں جو ہونا تھا ہو چکا۔"

"احسن صاحب یہ آپ کہہ رہے ہیں آپ نے بچے کی جان لی ہے۔"

"تمہیں اپنے عہد نامے کو نہیں بھولنا چاہیے۔"

"میں نے ایک بھیانک کھیل کھیلا تھا، مگر آپ کا ظلم کبھی نہ بھولوں گی۔"

"استدلال سے کام لینے کی کوشش کرو دنیا میں ابنارمل لوگوں کی کمی نہیں اور تم ان کی تعداد میں ایک اور کا اضافہ کر دیتی۔"

"یہ آپ اپنے اندازے سے کہہ رہے ہیں آپ خدا نہیں تھے جو میرے بچے کی زندگی کا فیصلہ کرتے۔ کم از کم مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔"

"تم اسے ہر قیمت پر زندہ رکھنے کی کوشش کرتی۔"

"بات بچے کی ذہنی صحت کی نہیں تھی۔ آپ نے اسے مار دیا، کہیں وہ بڑا ہو کر آپ کی جائیداد میں سے زبیر کا حق نہ طلب کرے۔"

"غصے اور صدمے نے تمہارے سوچنے سمجھنے کی قوت کو بہت متاثر کیا ہے تم اگر چاہو تو جتنی چاہو زمین تمہارے نام لکھی جا سکتی ہے۔"

"مجھے آپ کی زمینوں کی ضرورت نہیں۔"

"میں نے تمہیں فون پر بتانے کیلئے کیا تھا کہ کل زبیر سکیرٹری کے ساتھ واپس آ رہا ہے۔"

یہ بتا کر انہوں نے فون رکھ دیا۔

جب باغ اجڑ چکا، بلبلیں وطن چھوڑ چکیں گھاس کے آخری تنکے نے زردی کا لبادہ پہن لیا، خوبانیوں کی شاخوں نے آخری پتہ بھی لوٹ چکا۔ اب جب چاروں طرف ویرانی اور خزاں کا دور دورہ ہے جب کو تلیں اور پپیہے جلاوطن ہو چکے تو زبیر تم آ رہے ہو۔ مگر اب تم آکر کیا کروگے تمہارے اختیار میں کیا ہے اور میں کیا سکتی ہوں۔ کچھ بھی نہیں۔

زبیر پہاڑی مقامات کی سیاحت کے بعد واپس آیا تو بہت خوش دکھائی دیتا تھا۔ اس کی صحت بھی بہت اچھی ہو گئی تھی۔ مگر رضوانہ کے رخساروں پر اکتوبر کے بین بادام کے زرد پتیوں کا رنگ پھیلا ہوا تھا۔ اس نے زبیر کو بچے کی خوبصورتی اور اس کی چند گھنٹوں کی زندگی کی داستان کہہ سنائی اور احسن صاحب کے سنگدلانہ سلوک کے بارے میں وہ بتاتی جا رہی تھی اور آنسو اس کے رخساروں پر بہتے چلے آ رہے تھے۔ وہ جانے کب تک دور کہیں خلاؤں میں گھورتا رہا۔ اس کے چہرے پر خوشی یا غم کا کوئی تاثر نہ تھا۔ پھر رضوانہ نے سنا وہ کہہ رہا تھا۔

میں اس شخص کو جیتا نہ چھوڑوں گا جس نے میرے بچے کو قتل کیا ہے۔"

رضو کانپ گئی یہ تو اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ ایک ہی لمحے میں وہ اتنا خطرناک ارادہ کرے گا۔ میں نے ایک ترکیب سوچی ہے۔ زبیر۔ احسن صاحب کی پابندیوں سے آزاد ہونے کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ میں نوکری کر لوں

اور احسن صاحب کو یہ سب چیزیں ہم واپس دے دیں۔ یہ جتنی جلدی ہو سکے میں یہ کروں گی۔ تاکہ ایک اور بچہ احسن صاحب کی اپالا نلسے نہ کھیلا جائے۔

"میں کام کروں گی۔"

"تم کچھ نہیں کرو گی۔" زبیر تن کر کھڑا ہو گیا۔

"نہیں زبیر جب تک ڈاکٹر تمہیں مکمل صحت یابی کا سرٹیفکیٹ نہ دے تم نوکری نہیں کر سکتے۔"

"اچھا یونہی سہی۔"

نوکری کرنے اور احسن صاحب پر مستقبل کا انحصار کرنا چھوڑ دینے کے پروگرام نے رضوانہ کو کافی حوصلہ دیا۔ مگر جب بھی وہ اکیلی ہوتی اپنے بچے کی موت کے خیال سے اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے اور اس کے دل میں احسن صاحب کے خلاف غم و غصے کا آتش فشاں پھٹ پڑتا۔ وہ بڑی مشکل سے قابو میں کرتی۔

اب وہ روز باقاعدگی سے اخبار میں ضرورت ہے کا کالم دیکھتی اور ضرورت کے مطابق درخواست لکھ کر بھیج دیتی۔ ابھی تک کہیں سے جواب نہیں آیا تھا۔ کئی نوکریوں کے لئے پوسٹ گریجویٹ کی شرط تھی۔

احسن صاحب پھر دونوں پر مہربان ہو گئے۔ انہوں نے دونوں کو کئی نئی چیزیں لے کر دیں۔ گھر کے لئے نیا فرنیچر نئے پردے رضوانہ کے لئے نیا ساڑھی اور سونے کا جڑاؤ سیٹ۔ زبیر کو انہوں نے قیمتی سوٹ سلوا کر دیا۔ جب تک نوکری نہ مل جائے رضو احسن صاحب سے کوئی ناراضگی مول نہیں لینا چاہتی تھی۔

پہاڑ پر جانے سے زبیر کی صحت بہت اچھی ہو گئی تھی۔ مگر رضو کی جان سوزی اور دن رات کی محنت نے اس کی شخصیت میں نمایاں تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ اس میں اعتماد بحال ہوتا جا رہا تھا۔

ایک دن رضوانہ کے سر میں شدید درد شروع ہوا۔ پھر یہی درد ٹانگوں اور جسم کے دیگر حصوں میں چلنے لگا۔ معمولی دیکھ بھال اور علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ویسے بھی رضو اپنے علاج کے بارے میں زیادہ فکر مند نہ تھی۔

ڈاکٹر ظہیر جیسے ماہر سائیکاٹرسٹ نے بچے کی موت کو رضوانہ کیلئے بہت بڑا ذہنی صدمہ قرار دیا۔ وہ پہلے ہفتے میں دو تین دفعہ زبیر کو سیر کے لئے کسی باغ میں لے جاتی تھی۔ مگر اب زبیر کے کئی دفعہ یاد دلانے کے باوجود وہ گھر سے باہر جانے کے لئے آمادہ نہ ہوتی۔

نومبر کے اوائل میں رضوانہ نے ایک دن آئینہ دیکھا تو اسے احساس ہوا۔ وہ پہلے سے کمزور ہو گئی ہے اور اب تھوڑا سا کام کر کے وہ تھک جاتی ہے شدید قسم کی الجھاؤ اور ذہنی کرب کے لئے اس نے ڈاکٹر سے مشورہ کیا جنہوں نے اسے گولیاں دیں مگر مہینے بھر میں جہاں یہ گولیاں روزمرہ کی ضرورت میں شامل ہو گئیں وہاں ان کی تعداد بڑھنے کے ساتھ اس کا شدید اثر دماغ پر ظاہر ہونے لگا۔ دوائیوں کے ساتھ ڈاکٹر بھی تبدیل ہوا۔ مگر رضوانہ کی حالت نہ بدلی۔ جیسے سب چیزیں بے اثر ہو گئی ہوں۔ گولیوں کی وجہ سے اس کی بھوک اور نیند بہت کم رہ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اسے وہم کا مرض لاحق ہو گیا۔ جیسے اب کوئی دوست ہمدرد نہیں رہا۔

رات کو چند گھنٹے کے لئے وہ سوتی باقی وقت دریچے پر جھکی خود سے باتیں کرتی ۔ اور رضوانہ کو ہارمونیم سننے کا بہت شوق تھا ۔ زبیر بجاتے بجاتے تھک جاتا اگر رضوانہ کانوں سے ہارمونیم سنتی ۔ مگر نگاہیں خلاؤں میں گھورتی رہتی ۔ بس میں تھک گیا ہوں ۔ زبیر ہارمونیم رکھ دیتا ۔

" نہیں بجاؤ ۔۔ خدا کے لئے بجاتے جاؤ ۔ میں نے تمہارے لئے ساری دنیا تیاگ دی اور تمہیں یہ ساز بجانا بار ہے ۔ تم بھی اپنے باپ کی طرح خود غرض ہو ۔"

" رضوانہ ۔۔ " اس نے کندھوں سے پکڑ کر اسے جھنجھوڑ دیا ۔۔

" خبردار جو مجھے خود غرض کہا ۔"

" اگر تم نہیں ہو تو میں ہوں ہم میں سے کوئی تو اس خرابی کا بوجھ اٹھائے کوئی تو یہ ذمہ داری قبول کرے ۔"

موسم سرما کا آغاز ہو گیا ۔ دسمبر کی یخ بستہ ہواؤں میں وہ بغیر کسی سویٹر اور شال کے برآمدوں میں گھومتی رہتی ۔ کئی کئی ہفتے وہ نہ نہاتی نہ کپڑے تبدیل کرتی ۔ میلی کچیلی بال بکھرائے برآمدے میں کرسی ڈال کر وہ اڑتے پرندوں اور کریسنتھم کے پھولوں پر منڈلاتی بلبلوں کو دیکھتی رہتی ۔ کریسنتھم کے کتنے پھول ان بلبلوں نے برباد کر دیئے ہیں ۔

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے

روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے

زبیر نے اسے کئی بار یہ شعر زیر لب پڑھتے سنا تھا ۔ پانی سے

بھرا جگ اس کے پاس رکھا تھا۔ وہ دروازے میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ وہ اب تک پانچ گلاس پانی پی چکی تھی۔

"رضوانہ پاگل ہو گئی ہو، اتنا پانی۔"

"پانی ہے شراب یا زہر تو نہیں یاد کرو مینٹل ہسپتال میں تم رہتے تھے یا میں پاگل تم ہو یا میں۔"

"رضوانہ۔"

زبیر نے غصے سے بے قابو ہو کر اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ "تم حد سے گزرتی جا رہی ہو۔"

"پہلے یہ تو فیصلہ کر لو۔ کون سی بات حد میں ہے کون سی حد سے باہر۔ تم نے مجھے تھپڑ نہیں مارا۔ جہنم میں سرخ کیا ہوا آہنی گرز مارا ہے، تمھیں خبر ہے میں نے کتنی عمر تنہائی کے صحرا میں گزاری ہے میرے گھر کھانے کی میز پر ہمیشہ ایک پلیٹ ایک چمچہ ایک گلاس ہوتا تھا وہاں شاذ و نادر ہی دو گلاس اور دو پلیٹیں بھی ہوں گی۔"

"وہ تو گزری بات ہے اور اب ہماری میز پر تم کھانا کھاؤ یا نہ— ہمیشہ دو پلیٹ۔ دو چمچ اور دو گلاس ہوتے ہیں۔"

"گزری بات کو زندگی سے کون الگ کر سکتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ ہم دماغ میں سے سوچوں والا حصہ نکال کر پھینک دیں۔ جسم سے بازو یا ہاتھ کاٹ کر الگ رکھ دیں۔ لوگ ہمیشہ باہر سے ٹوٹ گئے ہیں۔ مگر میں اندر سے ٹوٹی ہوں۔ باہر کے زخموں اور چوٹوں کا علاج ڈاکٹر کر لیتے ہیں۔ مگر اندر کے زخم اور چوٹوں کا علاج کون کرے گا؟"

"میں تمہارا علاج کروں۔"

"زبیر تم سورج تھے اور میں نے سورج مکھی کی طرح تمہارے ساتھ رخ بدلا ہے۔"

"مجھے اس کا احساس ہے۔"

رضوانہ نے بے تحاشا قہقہہ لگایا۔

"تو گویا اب تم بھی اس خار زار میں آ گئے۔"

"رضوانہ میں کافی دنوں سے دیکھ رہا ہوں۔ تمہیں اپنے ہاتھوں پر کنٹرول نہیں رہا۔"

"ہاں میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے ہاتھوں کو ہر وقت ہلاتی رہوں۔"

وہ ترنم سے گانے لگی۔

"اچھا یہ بتاؤ تم نے موتیا اور گلاب کے پھول کیوں مسل دیئے کل میں تمہارے لئے فیض اور فراز کی نئی کتابیں لایا تھا۔ تم نے انہیں کھول کر بھی نہیں دیکھا۔"

"زبیر میرا دل چاہتا ہے سارے پھول اور پودے کچل دوں ۔۔۔ توڑ دوں کوئی روپ رنگ اور خوشبو باقی نہ رہے ۔ ہاں کتابوں کا ایک استعمال میں جانتی ہوں جتنے اچھے شاعر کی کتاب ہوگی. اتنی ہی اچھی آگ جلے گی، کاغذ جلنے کے لئے ہوتا ہے. چائے بنالو یا آگ تاپ لو۔"

ایک ہی جگہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے زبیر کو با اعتماد قدموں سے وہ آتے جاتے دیکھتی ۔ تو اسے احساس ہوتا جیسے وہ چل پھر نہیں

سکتی۔ اور زبیر تیز تیز قدموں سے دور جا رہا ہے۔
شام کی چائے مہینے بھر سے اس نے چھوڑ رکھی تھی۔ اس
کی خالی پیالی باقاعدگی سے میز پہ ہی پڑی رہتی۔ زبیر اکیلا چائے
پی کر اٹھ جاتا۔
"ہیں پانی پیئے نگی۔"
رضوانہ کے لئے خانساماں پانی لے آیا۔ ایک، دو، تین چار۔
گلاس پانی وہ پی چکی تو زبیر بولا۔
"دیوانی ہوگئی ہو۔ اتنا پانی پی کر مرنا ہے۔"
"مجھے پیاس لگی ہے۔"
وہ بچوں کی طرح رونے لگی۔
بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر زبیر نے اسے آدھا گلاس اور پانی
دیا تو وہ خوشی سے اچھلنے لگی۔
وہ دن زبیر اور احسن صاحب کے لئے خوشی کا مبارک دن تھا۔
جب شہر کے مشہور سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر اعجاز گل نے زبیر کا مکمل معائنہ
کرنے کے بعد جسمانی اور ذہنی صحت یابی کا سرٹیفکیٹ دیا۔
زبیر کو پتہ تھا اس گزرے ڈیڑھ سال میں رضوانہ کی شب بیداریاں
توجہ اور محبت کا اس کی صحت یابی میں کتنا ہاتھ ہے۔ اب تو ڈیڈی
نے اس کے لئے ایک فرم میں اسسٹنٹ منیجر کی جگہ بھی ڈھونڈ لی تھی
صرف یہی بات نہ تھی۔ ڈاکٹر نے اس کا امتحان لے کر اسے کار چلانے
کی اجازت بھی دیدی تھی۔ مگر۔
اس واقعہ سے ایک دن پہلے ڈاکٹر نے رضوانہ کا ذہنی اور جسمانی

امتحان کے بعد ڈرائیونگ کے لئے اسے نااہل قرار دیدیا۔

"بیگم زبیر آپ ہرگز کار نہیں چلا ئیں گی ورنہ کوئی خوف ناک حادثہ کر بیٹھیں گی۔

اپنے ساتھ دوسروں کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ حضرت زبیر کار چلایا کرے گا۔"

"آپا جی کمینہ رشوت خور کہتا ہے میں کار نہ چلاؤں۔ کیوں بھلا کار میری ہے۔ میں اسے چلاؤں گی۔"

"نہیں رضو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ تم آرام کرو گی میں کار چلاؤں گا۔"

پھر ایک دن رضو کو احساس ہوا جیسے گرد و نواح کی چیزوں میں کافی تبدیلی آچکی ہے۔ گرسینتھم کے پھول۔ بلبلیں جانے کہاں لے گئیں اور یہ میری آنکھوں کی چمک کس نے چرائی ہے۔

آئینہ دیکھتے ہوئے پچاس مرتبہ اس نے یہ سوال خود سے کیا۔ میں بیمار ہوں یا ٹھیک نارمل ہوں یا ابنارمل۔ کوئی دیوار کوئی دریچہ میرے اس سوال کا جواب تو دے۔ شاید مجھے ہسٹیریا ہو گیا ہے۔

ہزاروں تو بیماریاں ہیں جانے کون کون سی میرے گلے کا ہار ہیں اور یہ جو میرے ارد گرد کئی سانپ رینگتے رہتے ہیں۔ سانپوں سے مجھے ہمیشہ خوف آتا ہے۔ اور یہ جو زلزلے آتے ہیں کسی دن کوئی دیوار یا چھت نہ مجھ پر آگرے۔ میری تو راتوں کی نیند اڑ گئی ہے کہیں میں سوئی ہوئی اور زلزلے سے یہ وزنی دیوار میرے سینے پر آ

کر دے گی۔

ہاں سنو یہ کانوں میں جو سائیں سائیں کی آواز آتی ہے۔ یوں جیسے کوئی کیڑا کانوں میں رینگ رہا ہو۔ اور اپنے نوکیلے پنجوں سے میرے کانوں کا پردہ پھاڑ کر دماغ میں گھسنے کی کوشش کر رہا ہو۔

یہ رشتے جو میں نے جوڑے انکا کوئی نام نہیں اور میری روح کے تجربے جنہیں ساتھ نہیں تو تعجب کیا۔

دریچے میں جھکی وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ کالج میں پڑھی ہوئی کتابیں اور بھولے ہوئے سبق جیسے دماغ میں سارا کچھ گڈمڈ ہو گیا۔ اس میدانِ جنگ کی طرح جس میں جسم بغیر سر کے اور سر بغیر جسم کے پڑے ہوں۔ مجروح زخمی سوچیں جانے کیسے دھاگے کی طرح الجھ گئی ہیں ایک سوچ کا سرا دوسری سوچ سے نہیں ملتا۔

شاید مجھے شیزو فرینیا ہو گیا ہے۔ نہیں نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

وہ پوری قوت سے چلائی۔ خالنا ماں جلدی سے باورچی خانے سے دوڑا آیا۔

"میں نے زبیر کو ٹھیک کیا ہے میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہو سکتا"

اسی لمحے پورٹیکو میں کار رکی۔ زبیر کار سے باہر نکلا۔ فروری کے اس مہینے سیاہ سوٹ میں وہ بڑا وجیہہ اور خوش

شکل لگ رہا تھا۔

آنکھوں پہ اس نے سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا

رضوانہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اور زبیر کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں رہی وہ دونوں دو مختلف دنیاؤں کے باشندے ہیں۔ زبیر کی خوشی اور ترقی سے اسے کوئی سروکار نہیں اور زبیر کو اس کے رنج و الم سے کوئی نسبت نہیں۔

وہ جب اپنے موڈ میں کوئی گیت گنگناتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تو ٹھٹھک کر رہ گیا۔

رضوانہ کی حالت ہی عجیب تھی۔ آنکھیں خون کبوتر ہو رہی تھی۔ زلفیں بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں اس کے سارے اعصاب پر جیسے چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ اس کے کپڑے بھی بڑے بے ترتیبی سے تھے،

زبیر بڑے خوف زدہ تھا۔ نجانے رضو کو کیا ہو گیا ہے۔

"ڈر نے کیوں ہو میں تمہیں کھا تو نہیں جاؤں گی۔"

وہ اعلان والے انداز میں بولی۔

زبیر آئینے میں اپنی ٹائی کی گرہ کھولنے لگا۔ مگر کنکھیوں سے وہ اسے دیکھ رہا تھا، وہ پستول جس کا لائسنس احسن صاحب نے رضو کو خود اپنی ہی ذاتی حفاظت کے لئے لے کر دیا تھا۔ اب کافی دنوں سے وہ اپنے تکیئے کے نیچے رکھنے لگی تھی۔ اس وقت جب زبیر آئینے کے سامنے بڑے پرسکون انداز میں کھڑا تھا، رضوانہ نے چیتے کی سی تیزی سے ایک ہی جست میں تکیئے کے نیچے سے پستول نکالا۔

اور گھوم کر اس کی نالی زبیر کے سینے پر رکھدی۔

"جواب دو کیا مجھے شبر و فریبیا ہو سکتا ہے ورنہ گولی تمہارے سینے کے پار ہے"

زبیر ایک لمحے کے لئے پریشان تو ہوا مگر پھر اس نے اپنی اندرونی قوتوں کو جمع کر کے خود پر قابو پا لیا، اور وہ ترکیب استعمال کی جو کئی بار رضو نے اس پر استعمالی کی تھی

بڑے پیار اور آہستگی سے اس نے پستول والا ہاتھ پکڑا اور پستول لے کر زبیر سے لپٹ گئی،

" ڈبیٹن کی آواز سے پستول کی گولی دیوار میں لگی۔ اور رضوانہ خوفزدہ ہو کر زبیر سے لپٹ گئی،

"تمہیں کیا ہو سکتا ہے کچھ نہیں ۔ ہاں کبھی کبھی نہا لیا کرو اور صاف کپڑے پہنا کرو۔"

• چلو میں تمہارے بال بنا دوں ۔"

کافی دیر لگا کر زبیر نے اس کے بالوں میں مانگ نکالی اور ربن باندھا۔

وہ سارا وقت اس کے گھٹنے پر ٹھوڑی رکھے بیٹھی رہی۔ اب اگر تم اچھی لڑکی ہو تو نہا کر صاف کپڑے پہن لو۔

جانے کیا سوچ کر رضوانہ نے اس کی دونوں باتوں کی تعمیل کی اور باتھ روم میں اس نے دو گھنٹے لگا دیئے۔

جب وہ بالوں کو تولئے میں لپیٹ کر باہر نکلی تو زبیر نے حیرانی سے کہا،

"اتنی دیر لگا دی۔"

"مجھے پانی سے ڈر لگتا تھا جیسے باتھ ٹب مجھے کھا جائے گا۔ یا پانی مجھے ڈبو دے گا۔"

"یونہی وہم ہے تمہارا۔"

پستول والے واقعے کا زبیر نے کسی سے ذکر نہ کیا۔ وہ کام سے واپس آتا تو رضو کی بکھری ہوئی ہستی کے ٹکڑے دونوں ہاتھوں سے سمیٹتا۔ مگر وہ تو اندر سے بہت پہلے ٹوٹی ہوئی تھی۔ اب وہ باہر سے ٹوٹ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ گرمی اور سردی کے عوامل کے اثر سے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے والی چٹانوں کی طرح۔

زبیر کی پوری کوشش تھی کہ رضو کی ہستی کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی خبر ڈیڈی تک نہ پہنچے۔

مگر ڈیڈی کو پتہ چل گیا۔

ایک شام وہ رضوانہ کے بارے میں کافی کچھ سن کر آئے ہوئے تھے اور ڈیڈی رضوانہ کے بارے میں باتیں کرنا چاہتے تھے۔ مگر زبیر اپنے آفس کی باتیں کر رہا تھا۔

اس دن صبح سے رضو بڑی مضطرب تھی۔ اس نے کچن میں رکھے ہوئے ڈنر سیٹ کی ایک ایک چیز فرش پر پوری قوت سے پھینکی۔

فرانسیسی سیٹ کے برتن ٹوٹنے سے رضوانہ کے ذہن میں بھولے ہوئے لوگوں اور کھوئی ہوئی باتوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ مگر یہ آواز تو بالکل ایسی ہی تھی جیسے یئر باو بلونوں والے بجرے،

جہازوں کے کیبن میں گونجنے والی مسحور کن اداس موسیقی ۔
برتنوں کے ٹوٹنے کے دوران وہ موسیقی سنتی رہی۔
کیسا عجیب سا سکون دل کے گوشے میں جاگا تھا۔
اس وقت ڈرائنگ روم میں احسن اور زبیر کسی سنجیدہ سے
موضوع پر باتیں کر رہے تھے۔
ایک جھٹکے سے یوں جیسے ہالی وڈ کی فلموں میں ولن پستول
تانے داخل ہوتا ہے عقاب کی سی تیزی اور چیتے جیسی پھرتی
سے رضوانہ نے پستول کی نالی زبیر کے سینے پر رکھ دی۔
"لو لو کیا مجھے شیر و فرینیا ہو سکتا ہے ؟ کیا میں بیمار ہوں۔"
زبیر دم بخود تھا اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ڈیڈی کے سامنے
وہ کیا کرے۔
اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا۔ احسن صاحب نے پستول جھپٹ
لیا۔
"کمینی ذلیل میرے بیٹے کی جان لے گی ۔ دو ٹکے کی عورت ۔
تیری یہ جرأت ۔"
احسن صاحب غصے سے دیوانے ہو رہے تھے۔
انہوں نے رضوانہ کو زور سے دھکہ دیا۔
وہ صوفے پر پیچھے کو گری۔ مگر اسی لمحہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
اور تیزی سے جھپٹ کر اس نے احسن صاحب کے قمیض کا
کالر پکڑ لیا۔
" آپ زندگی بھر کاروبار کرتے رہے مجھے بتائیں کہ میں نے کون سا

سودا کیا۔ اپنا سب کچھ اس گھر کے لئے لٹا دیا۔
اپنا خون بہایا کہ آپ کے محل کی دیواروں میں سوراخ نہ ہو۔
میرا جو کچھ آپ لوگوں نے سمیٹا ہے وہ مجھے لوٹا دو — وہ مجھے لوٹا دو۔"

آنکھوں سے آنسوؤں کی آبشاریں بہنے لگیں،
اس نے خود ہی احسن صاحب کا کالر چھوڑ دیا۔
بات یہیں پر ختم ہو جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔
زبیر رہ رہ کر سوچتا رہا۔
مینٹل ہسپتال —!
مگر اگلے دن صبح سویرے احسن صاحب نے سب سے پہلے کام جو کیا۔ وہ سائیکاٹرسٹ دوست کو مینٹل ہسپتال فون کرنے کا کیا تھا۔

اور —
ایسے شدید قسم کے خطرناک کیس کیلئے یورپین سیکشن میں کمال فراخدلی سے روم دے لیا۔
رضوانہ کو ہسپتال بھیجا جا رہا تھا۔
رات بھر اسے بھوکا پیاسا رکھا گیا تھا۔
اب ہسپتال کی خصوصی گاڑی رضو کو لینے آئی تھی، جب وہ جانے لگی تو زبیر ناشتے کی میز سے اٹھ گیا۔
اور بولا
میں بھی رضوانہ کے ساتھ جا رہا ہوں۔

"مجھے تم سے مشورہ کرنا ہے ۔ واپس کب تک آؤ گے ؟" ڈیڈی نے بے چینی سے کہا۔

"جب رضوانہ ٹھیک ہو جائے گی ۔"

اس نے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا۔

اور گاڑی جیل روڈ کی وسیع سڑک پر جا رہی تھی ۔

ختم شد

(نامی پریس لاہور)